

خواتین اور مردوں کے لیے اپنی طرز کا پہلا اجلاس

# خواتین کا مجلہ

اپریل 2019

CaretoFun

<https://www.caretofun.net>

ساگرہ نمبر

<https://reading.caretofun.net/>











کی دل شکنی کا اندیشہ نہ ہو تو بعض حالات میں اس کی گنجائش ہے، ویسے بھی مذکورہ بالا واقعہ میں دونوں کے الگ ہوجانے کے باوجود حضرت علقمہ رحمۃ اللہ اتنے دور نہیں تھے کہ ان کی بات چیت نہ کن سکیں۔

4- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس وقت نکاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی والوں سے رابطہ قائم کیا جائے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی، خیر خواہی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فرمادیا کہ نکاح واقعی ایک اہم اور مفید چیز ہے۔

5- نکاح کی طاقت رکھنے کا مطلب جسمانی طور پر نکاح کے قابل ہونا اور مالی طور پر بیوی کے لازمی اخراجات پورے کرنے کے قابل ہونا ہے۔ موجودہ معاشرے میں رائج رسم درواج پر کیے جانے والے بے جا اخراجات کی طاقت مراد نہیں۔ معاشرے سے ان فضول رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

6- نکاح کا سب سے بڑا فائدہ گناہ کی زندگی سے حفاظت اور جنسی خواہشات کی جائز ذریعے سے تکمیل ہے۔ نکاح کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے دوسرے فوائد خود ہی حاصل ہو جائیں گے۔

7- فحاشی سے بچاؤ اسلامی معاشرے کی ایک اہم خوبی ہے، اس کے حصول کے لیے ہر جائز ذریعہ اختیار کرنا چاہیے اور فحاشی کا ہر راستہ بند کرنا چاہیے۔

8- اسلامی شریعت کی یہ پختی ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے مطالبات کی کمی نہیں کرتی بلکہ ان کے حصول کے جائز ذرائع مہیا کرتی ہے۔

9- روزہ رکھ کر انسان نامناسب خیالات اور جذبات کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے فطری خواہش بھی بے لگام نہیں ہوتی، اس لیے اگر کسی نوجوان لڑکے کی شادی میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے اور جذبات میں بیجان پیدا کرنے والے ماحول، اس قسم کے لڑچر کے مطالعے، جذبات انگیز نعمات سننے اور فلمیں وغیرہ دیکھنے سے پرہیز کرے

تاکہ جوانی کا جوش، گناہ میں ملوث نہ کر سکے۔

### نکاح سنت ہے

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”نکاح میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقے پر عمل نہیں کرتا اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ شادیاں کیا کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی بنا پر دوسری امتوں پر فخر کروں گا، جو (مالی طور پر) استطاعت رکھتا ہو، وہ (ضرور) نکاح کرے اور جسے (رشتہ) نہ ملے، وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ خواہش کو بھل دیتا ہے۔“

### فوائد و مسائل:

1- نکاح میرا طریقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل وعیال والی زندگی گزارنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کا طریقہ ہے کہ ان کے ہاں غیر شادی شدہ زندگی گزارنا اور بزم خوش عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا افضل اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔

2- نکاح کا ایک روحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اولاد کی صحیح تربیت کر کے انہیں اسلامی معاشرے کے مفید ارکان بنانا بھی ایک اہم دینی خدمت ہے اور دوسروں کو اچھے کاموں کی ترغیب دلانے سے خود سیدھی راہ پر گامزن رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

3- مسلمانوں کے لیے اولاد کی کثرت شرعاً مطلوب ہے لہذا اس کے لیے کوشش کرنا بھی نکاح کرنا اور ازواجی تعلقات قائم رکھنا بھی شرعاً محسن ہے۔

4- نکاح روحانی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔

### محبت رکھنے والوں کے لیے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آپس میں محبت رکھنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔“

### فوائد و مسائل:

1- دو خاندانوں میں دوستانہ تعلقات ہوں تو

انہیں قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے سے رشتہ لینا دینا چاہیے۔

2- کسی مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جائے تو ناجائز تعلقات قائم کرنے کے بجائے نکاح کا جائز تعلق قائم کر لینا بہتر ہے تاہم اس میں نکاح کی دیگر شرائط، یعنی عورت کے سر پرست کی اجازت، حق مہر، ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی وغیرہ کا پایا جانا ضروری ہے۔

### بے نکاح رہنا منع ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بے نکاح رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اجازت دے دیتے تو ہم لوگ خسی ہو جاتیں۔“ بخاری۔

### فوائد و مسائل:

1- حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ عبادت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ نکاح کر کے بیوی بچوں کے معاملات میں مشغول ہونے سے نقلی عبادات، یعنی نقلی نماز روزے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں، اس لیے بہتر ہے نکاح نہ کیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بے نکاح رہنے کی اجازت نہ دی۔

2- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے کیونکہ ممکن ہے ایک کام بظاہر نیکی کا پورا بہت اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن شریعت کی رو سے وہ صحیح نہ ہو۔

3- بدعت بھی بظاہر نیکی ہوتی ہے لیکن اس کے ظاہری نیکی ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ خلاف سنت کام کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو، اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

4- اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہندو جوگیوں یا عیسائی راہبوں کی طرح حلال

چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے بلکہ کھانے، پینے اور دیگر معاملات میں شرعی ہدایات پر عمل کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سرور رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نکاح رہنے سے منع فرمایا۔

### فوائد و مسائل:

1- بے نکاح رہنے کو نیکی سمجھنا غلط ہے، خواہ یہ تصوف کے نام پر ہو یا فتنہ رے کے نام پر یا کسی اور نام سے۔

2- نکاح تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

3- انبیائے کرام نوری مخلوق نہیں بلکہ اشرف المخلوقات ہیں۔ اس لیے وہ نکاح بھی کرتے تھے اور ان کی اولاد چھی ہوئی تھی۔

### خاندان پر بیوی کے حقوق

حضرت حکیم بن معاویہ اپنے والد حضرت معاویہ (ابن حنیہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

### ”خاندان پر عورت کا کیا حق ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب کھانا کھائے تو اسے بھی کھلائے، جب کپڑا پہنے تو اسے بھی پہنائے، چہرے پر نہ مارے، اسے برا بھلا نہ کہے اور گھر ہی میں (اس سے) علیحدگی اختیار کیے رکھے۔“

### فوائد و مسائل:

1- اسلام نے معاشرے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ہر فرد کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر معاشرے میں امن قائم کیا جاسکتا ہے۔

2- جس طرح مردوں کے حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف (البقرہ: ۲۲۸)

ترجمہ: ”اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے



مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔“

3- گھر میں امن و سکون قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔

عورت کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ مہیا کرنا مرد کا فرض ہے۔

4- مرد کو حق حاصل ہے کہ عورت کو غلطی پر مناسب تنبیہ کرے۔

5- اگر معمولی تنبیہ کا اثر نہ ہو تو معمولی سی جسمانی سزا بھی دی جاسکتی ہے لیکن چہرے پر مارنا منع ہے۔

لا یقبح کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ڈانٹنے وقت نامناسب الفاظ استعمال نہ کرے، جیسے عربوں میں

رداج تھا کہ وہ کہتے۔ ”یہ اللہ و جہک“ ”اللہ تیرے چہرے کو قہقہہ کر دے۔“ ”یا فبحک اللہ“ ”اللہ تجھے بد صورت کر دے۔“ اس طرح کی گالی اور بددعا سے

اجتناب کرنا چاہیے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارے، زور سے مارنے سے چہرے پر نشان پڑ جائے گا اور چہرہ بد صورت ہو جائے گا، اس لیے

فرمایا کہ اسے بد صورت نہ بنا دے۔

6- تنبیہ کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے وقتی طور پر بول چال بند کرنا جائز ہے لیکن بیوی کو گھر سے نکال دینا یا خود سے کئی دن کے لیے باہر چلے جانا

مناسب نہیں۔ گھر میں دونوں کی موجودگی سے ناراضی جلد دور ہو جانے کی امید ہوتی ہے۔

عورتوں کے حقوق

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے۔ (اس دوران میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثناء کی اور وعظ و نصیحت فرمائی (اس میں آپ نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں) پھر فرمایا۔

”عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ تمہیں ان پر اس کے سوا کوئی اختیار نہیں۔“ (یعنی یہ کہ وہ واضح ہے

شرعی کا کوئی کام کریں، اگر وہ ایسی حرکت کریں تو ان سے بستروں میں الگ ہو جاؤ اور انہیں مارو لیکن سخت پٹائی نہ ہو۔) (اس تنبیہ کے نتیجے میں) اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں تو ان پر (خفی کرنے کی) راہ تلاش نہ کرو یقیناً تمہاری عورتوں پر تمہارا حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہاری عورتوں پر تمہارا حق تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر اسے نہ بٹھائیں جس (کے گھر میں آنے) کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں اس فرد کو آنے کی اجازت نہ دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ سنو! تم پر عورتوں کا حق ہے کہ ان کے لباس اور خوراک کے بارے میں ان سے اچھا سلوک کرو۔“

فوائد و مسائل:-

1- وصیت تاکید کی صیحت کو کہتے ہیں جس پر عمل کرنا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ”وصیت قبول کرو“ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔ بہت سے صحابہ کرام جو حجۃ الوداع میں حاضر تھے، ان کے لیے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وہ آخری ملاقات ہو کیونکہ اس سے تین ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے لیے یہ خطبہ واقعی آخری نصیحت (وصیت) بن گیا۔

2- خطاب اگر حجۃ الوداع میں حاضر ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا گیا تھا، تاہم یہ حکم قیامت تک آنے والے تمام مومنوں کے لیے ہے۔

3- مرد کو چاہیے کہ بیوی کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے، تاہم بلاوجہ مشکوک و شبہات میں مبتلا رہنا درست نہیں، جب تک کوئی واضح مشکوک صورت سامنے نہ آئے۔

4- واضح بے حیائی سے مراد ایسی حرکات ہیں جن پر روک ٹوک نہ کرنے سے بدکاری تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ زنا کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں دوسرے احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں اپنے

مقام پر مذکور ہیں۔

5- جب محسوس ہو کہ عورت اپنی غلطی پر پشیمان ہے اور اصلاح پر آمادہ ہے تو اس سے معمول کے تعلقات قائم کر لینے چاہئیں اور بار بار گزشتہ غلطیوں کا طعنہ نہیں دینا چاہیے۔

6- بعض اوقات صورت حال اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ جسمانی سزا ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن یہ اصلاح کی کوشش کا آخری درجہ ہے، جہاں تک ممکن ہو، معاملات کو اس مرحلے پر نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔

7- اگر جسمانی سزا ضروری محسوس ہو تو اس میں بھی نرمی کا پہلو مد نظر ہونا چاہیے یعنی صرف اس حد تک سختی کی جائے یا سزا دی جائے جو تنبیہ کے لیے ضروری ہو، اس سے زیادہ نہیں کیونکہ مقصود اصلاح ہے، غصہ نکالنا یا بدلہ لینا نہیں۔

8- مہمانوں کی تکریم ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص آتا ہے جسے خاوند اچھا نہیں سمجھتا تو عورت کو چاہیے کہ خاوند کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اسے اجازت دینے سے معذرت کر لے یا کہہ دے کہ مرد گھر میں نہیں، پھر آ جائے گا۔

9- ناپسندیدہ شخص کو بستر پر نہ بٹھانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے غیر مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی راہ ہموار نہ کی جائے۔ ان سے نرم لہجے میں ہنس ہنس کر بات کرنے کے بجائے سنجیدگی سے مختصر بات کر کے فارغ کر دیا جائے۔

ابام خطابی فرماتے ہیں۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اجنبی مردوں کو کپ شپ کے لیے اپنے پاس گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں، جیسے عرب میں یہ رواج تھا اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد اس سے منع کر دیا گیا۔“ (حاشیہ سنن ابن ماجہ از محمد نواد عبد الباقی)۔ ہمارے ہاں دیہات میں، جہاں پردے کا اہتمام نہیں کیا جاتا اب بھی یہ صورت حال موجود ہے جو شرعی طور پر ممنوع ہے۔

10- بعض علماء نے فرمایا کہ عورت اپنے حرم رشتہ داروں کو بھی خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ

آنے دے لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاوند کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کے حرم مردوں پر پابندی لگائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے رضائی بچا کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وہ تمہارا بچا ہے، اسے آنے کی اجازت دو۔“

لباس اور خوراک کے بارے میں اچھا سلوک یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اچھا لباس اور مناسب خوراک مہیا کرے لیکن ایسے لباس سے منع کرنا چاہیے جو شریعت کی تعلیمات کے مطابق نہ ہو۔

شوہر کی خوشنودی

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

”جو عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے خوش تھا تو وہ جنت میں جائے گی۔“

بہترین عورت

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دنیا (عارضی) فائدے کی چیز ہے اور دنیا کے ساز و سامان میں نیک عورت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔“

فوائد و مسائل:-

1- دنیا کی چیزوں سے حلال طریقے سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔ ترک دنیا جائز نہیں۔

2- دنیا کی چیزیں اس انداز سے استعمال کرنی چاہئیں کہ آخرت میں فائدہ حاصل ہو۔

3- نیک عورت ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ وہ دنیا کے معاملات میں بھی اچھی مشیر ثابت ہوتی ہے، اچھی شریک حیات ہوتی ہے اور آخرت کے معاملات میں بھی خاوند سے تعاون کرتی ہے۔ اس طرح دونوں کو بلند درجات حاصل ہو جاتے ہیں۔

4- نیک مرد بھی عورت کے لیے ایک ایسی ہی نعمت ہے۔



ہمیں تم پر گمان وحشت تھا

ریشائی

ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا، ہم لوگوں کو رسوا کیا تم نے  
ابھی فصلِ گلوں کی نہیں گری، کیوں دامنِ چاک سیا تم نے

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کر میں دو لیشوں کا برقم سے تو اتنے برقم ہیں، کیا ان کے مانگ لیا تم نے؟

کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس نخل کا سندسہ لائی ہو  
ہم باغ میں خوش خوش بیٹھے تھے، کیا کر دیا آکے صبا تم نے

غمِ عشق میں کاری دوا نہ دے، یہ ہے روگِ کُشن یہ ہے دردِ بُرا  
ہم کرتے ہوا پنے سے جو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے

جو قیس غریب تھے ان کا جنوں، سبھی کہتے ہیں ہم سے رہا ہے فطرلہ ہمیں دیکھ کے ہنس تو دیا تم نے، کبھی دیکھے ہیں اہلِ وفا تم نے،

اب ہر وہ ماخذ ہے کچھ نہ کہو، یونہی شاد رہو، آباد رہو  
 بڑی دیر سے یاد کیا تم نے، بڑی دُور سے دی ہے صدا تم نے

اک بات کہیں گے انشا جی، تمہیں رسخۂ کہتے عمر ہوئی  
تم ایک جہاں کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے

خواتین ڈائجسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آج  
ڈی پی جے بھی ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں ان  
میں تقریباً اسی فیصد رائیٹرز خواتین ڈائجسٹ کی  
لکھاری ہیں۔ ان ہی مصنفین میں راحت جبین بھی  
شامل ہیں جو کئی کامیاب ڈراما سیریز لکھ چکی ہیں اور  
حال ہی میں ان کا سیریل ”تاوان“ اختتام پذیر ہوا  
-

”کیا حال ہیں راحت صاحبہ؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”بہت اچھی لکھاری ہیں۔ جو بھی لکھا

دو سب ہی پسند کیا گیا..... جو آپ کو  
بڑھتے ہیں اور جو آپ کے ذرا سے دیکھتے ہیں آپ  
کے بارے میں جانتا بھی جاتے ہیں..... اس لیے  
سب سے پہلے تو آپ اپنا جی بیک گراؤنڈ بتائے؟

”جب بھی کوئی مجھ سے میری جائے پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے تو میری نظروں کے سامنے ساہیوال والا وہ گھر کھوم جاتا ہے۔۔۔۔۔ خیر کا بل عبور کرتے ہی اس نے دروازہ باز کر دیا۔

س کے سامنے تن "نیم" اور کچھ چمن کے درخت تھے۔ کیونکہ اس وقت آبادی اتنی نہیں تھی۔ ابا ہر کاری ملازم ہیں اور امی کھریلو خاتون، ہم چھ بہنیں

ہے بڑا ہے۔ ای کو بہت شوق تھا کہ ان کی اولاد  
ہے لکھے، لہا نے بھی سب وسائل فراہم کیے۔  
ہے "کے جی" سے "ایم اے" تک کے امتحان

یہ سہ ماہی سال سے حاصل کی۔ 2005ء میں میری  
دی ہوئی اور میں ”چیچہ وطنی“ آ گئی..... اسلم  
حب نمبر دار زمین دار اور سیاست دان ہیں.....

شاپن کرشید

حزاج کی ہم آہنگی نے زندگی کے سفر کو آسان کر دیا  
پھر ہماری زندگی میں بٹی جیسی ”رحمت“ بھی آگئی۔  
ایچہ فاطمہ اس کے ذکر کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے  
- بڑی ہو رہی ہے تو لگتا ہے کہ پہلی بچی جا رہی

ہے..... میری بیٹی ماشاء اللہ 13 برس کی ہو گئی ہے  
 آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہے..... اور میں جس مہینے  
 میں پیدا ہوئی وہ شاعر و کا پند پند مہینہ ہے میں  
 6 دسمبر کو پیدا ہوئی..... اور میں اکتاکس یا انگریزی  
 میں ایم اے کرنا چاہ رہی تھی۔ تو میں جب ”بی ایڈ“ کر  
 رہی تھی تو ہمارے ایک پروفیسر نے مشورہ دیا کہ ”بیٹا  
 آپ کو اردو میں ایم اے کرنا چاہیے۔“ ان ہی کے  
 کہنے پہ میں نے ”ایم اے اردو کیا۔“

”والدین اپنے بچوں کے نام رکھنے میں بہت جوڑی ہوتے ہیں یا تو بہت چھان بین کے بعد رکھتے ہیں یا جو رینڈ چل رہا ہوتا ہے رکھ لیتے ہیں۔ آپ کے نام کا کیا بک گراؤٹ ہے؟“

”تاریخ بتاتی ہے کہ جس دن میں پیدا ہوئی تھی  
 ۱۰ دن محلے کے کسی تھانے دار کے گھر میں لاہور سے  
 ایک بچی مہمان آئی تھی جو کہ بہت پیاری اور کیوٹ سی

میں نے بتایا تو باجیوں نے بڑے پیار سے اور بڑے  
تمام سے میرا نام ”راحت جبین“ رکھ دیا۔۔۔۔۔ میں  
بج بھی ان کو پھرتی ہوں کہ اگر اس زمانے میں

”قلم سے آپ کا رشتہ کتنا پرانا ہے کب ادراک  
کہ آپ لکھ سکتے ہیں؟“

میرا خیال ہے کہ ادراک، میں بعد میں ہوا تھا



اور لکھتا ہم نے پہلے شروع کر دیا تھا..... کہانیاں پڑھنے اور کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا..... مجھے یاد ہے کہ ہمارے بھائی عمران سیریز اور انسپکٹر جمشید سیریز لے کر آیا کرتے تھے اور ہماری ایک چھوٹی بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں ہم چھپ چھپ کر پڑھا کرتے تھے اور نوائے وقت اخبار کے ساتھ بچوں کا ایک ایڈیشن آیا کرتا تھا ”پھول اور کلیاں“ کے نام سے وہ بھی ہم بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے..... مجھے یاد ہے کہ ایک دن اجا تک ہی آئی نہ کہا کہ ”یہ بچہ بھی تو لکھتے ہیں تو ہم کیوں نہیں لکھ سکتے۔ ہم بھی لکھ کر دیکھتے ہیں“ پھر ہم نے اپنی ہوم ورک کا پی سے پرچے بھاڑے اور جلدی جلدی ایک کہانی لکھ کر چھنے کے لیے بھیج بھی دی۔ اور بالکل بھی نہیں پتا تھا کہ اگلے دو ہفتوں میں وہ کہانی چھپ بھی جائے گی۔

”لکھنے کا ہنر دورے میں ملا؟ حوصلہ افزائی ہوئی؟“

”شور کوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ کر چاندنی راتوں میں شاید میری ماں نے کہانیاں لکھری تھیں۔ کیونکہ ہمیں ہمیشہ سے لگتا ہے کہ ہم بہنوں میں لکھنے کی صلاحیت ماں کی طرف سے آئی..... انہیں بہت شوق تھا کہ میری بیٹیاں پڑھیں لکھیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور کچھ بین کے دکھائیں..... اور ہم بچپن میں جب بھی کچھ لکھتی تھیں۔ امی ابو بہت خوش ہوتے تھے، کوئی باندی نہیں بھی بہت حوصلہ افزائی کی اور ہمارا نام دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے..... ہم نے بھی اپنے ماں باپ سے چھپ کر نہیں لکھا بلکہ کہانیاں لکھ کر ہم پہلے انہیں سنایا کرتے تھے۔“

”افسانہ یا ناول کب لکھنا شروع کیا؟“

”میسٹرک میں جب تھی تو بچوں کے رسالوں میں کافی حد تک ہمارا نام بن چکا تھا، لوگ بہت اصرار سے اور بہت پیار سے ہماری تحریریں شائع بھی کر رہے تھے..... لیکن مجھے یاد ہے کہ پہلا افسانہ میں نے بہت

کے لیے لکھا تھا اور لکھنے کے بعد جب خود پڑھا تو مجھے لگا کہ کچھ کسر باقی ہے اور یہ شائع نہیں ہوگا..... پھر ایک سال تک میں نے کچھ نہیں لکھا اور پڑھنے پر زیادہ زور دیا۔“

”پھر ڈائجسٹ تک رسائی کیسے ہوئی؟“

”ہمارے گھر میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ آیا کرتے تھے اور ہم بہت اہتمام اور شوق سے پڑھا کرتے تھے اور ہماری خواہش تھی کہ ہم ان ڈائجسٹوں میں لکھیں..... ان دنوں عاصم لونی ان ڈائجسٹوں میں لکھا کرتی تھیں تو بڑی خواہش تھی کہ ان کے جیسے صرف لکھیں بلکہ ان کے ساتھ میرا نام بھی آئے۔ تو پہلی تحریر شعاع کے لیے لکھی ”اک کی سی رہ گئی ہے۔“ اور اللہ کا شکر کہ وہ بھیجے کے ایک ماہ بعد ہی شائع ہوئی پھر دوسرا افسانہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھا ”ابھی چاہتوں کو ثبات ہے۔“ وہ بھی جلدی ہی شائع ہو گیا۔ یوں ان دونوں ڈائجسٹوں میں میری اینٹری ہوئی۔“

”کچھ معاوضہ یا اعزاز یہ بھی ملا؟ یا یہ خوش تھی کہ ڈائجسٹ میں نام آ گیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ لکھنے کا ”اعزاز“ یہ بھی ملتا ہے، سہ پہر کا وقت تھا چا چا جی آئے ہوئے تھے گاؤں سے اور ڈاکے نے جب مجھے بارہ سو کا منی آرڈر دیا تو میری مٹھی پھر گئی تھی سو سو اور دس دس کے نوٹوں سے اور چا چا جی کہہ رہے تھے کہ ”اوہ راحت تو امیر ہو گئی ہے“ اور مجھے واقعی لگ رہا تھا کہ میں بہت امیر ہو گئی ہوں۔“

”بھی احساس ہوا کہ جو رائٹرز لکھ رہی ہیں میں ان جیسا پاان سے اچھا لکھ سکتی ہوں؟“

”نہیں، ایسا احساس بھی نہیں ہوا..... بلکہ مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ سب رائٹرز مجھ سے زیادہ اچھا لکھتی ہیں اور جن دنوں میں نے لکھنا شروع کیا ان دنوں ڈائجسٹ میں اتنی بھی ہوئی اور اتنی بہترین رائٹرز لکھ رہی تھیں کہ یہ سوچنا کہ میں ان سے بہتر لکھ سکتی ہوں نا ممکن ہی تھا۔ بس یہ خواہش تھی کہ ان کے درمیان کہیں چھوٹا موٹا سا نام ہمارا بھی آ جائے..... ہاں میری

یہ خواہش تھی کہ میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسا لکھوں لیکن جب میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان کے جیسا نہیں لکھ سکتی۔“

”بھی کسی نے فرمائش کر کے آپ سے ناول لکھوایا؟ اور بھی ہانڈی جلی یا دوپٹہ جلا پلاٹ سوچتے ہوئے؟“

”جی بالکل کچھ ناواڑا ایسے ہیں جو فرمائش کر کے لکھوائے گئے تھے اور کچھ ناواڑا ایسے بھی تھے جو میں نے حقیقی کرداروں پر لکھے تھے..... ہانڈی تو بھی نہیں جلی۔ البتہ دودھ اکثر اہل جاتا ہے۔“

”لکھنے کا بہترین ٹائم آپ کے لیے کون سا ہے؟ اور پلاٹ کی آمد کب ہوتی ہے؟ اور کہاں ہوتی ہے۔ نماز میں یا دواش روم میں؟“

”بہتے ہوئے“ ”بھی آمد ہے۔ کہیں بھی اور کسی جگہ بھی ہو سکتی ہے..... میرے ساتھ ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میرا ایک ناول ہے ”سفر تمام ہوا“ جو کہ مجھے ذاتی طور پر بھی بہت پسند ہے۔ اس کا پلاٹ نماز کے دوران ذہن میں آیا اور نہ صرف پلاٹ بلکہ پورا کا پورا آئیڈیا آغاز سے لے کر انجام تک سب میرے ذہن میں آیا..... اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نماز کی آخری رکعت پڑھ رہی تھی..... اور پھر میں نے نماز کو دوبارہ پڑھا اور اللہ سے بہت معافی بھی مانگی کہ دنیاوی کام ہے اور پتا نہیں کس طرح میرے ذہن میں آ گیا..... تو ہو جاتا ہے ایسا..... اور جہاں تک لکھنے کے ٹائم کی بات کر رہی ہیں تو اگر کہانی ذہن میں پتار ہے تو میں کسی بھی وقت کسی جگہ پر لکھ سکتی ہوں لی دی دیکھتے ہوئے بھی لکھ لیتی ہوں۔ ویسے زیادہ تر دل یہ چاہتا ہے کہ جب گھر میں سکون ہو اور مجھے کوئی بھی ڈسٹر ب کرنے والا نہ ہو اس وقت لکھوں خواہ کوئی بھی ٹائم ہو۔“

”افسانوں اور ناولوں میں جو ہیرو آپ رائٹرز دکھاتی ہیں کیا اصل زندگی میں آپ کو ایسا ہیرو ملا؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ میری زندگی میں آنے والا میرا شوہر، میرے لائف پارٹنر میں وہ ساری

خصوصیات شامل ہیں جو میں اپنے ہیروز کے لیے لکھا کرتی تھی..... خوش مزاج، سادہ مزاج، عزت کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے..... اگر میں کسی فلمی ہیرو کو ذہن میں لائے بغیر ان کا حلیہ بتاؤں تو چھ فٹ سے لگتا ہوا قد اور کتنی موچھوں تلے مسکراتے لب اور کاشٹ کے کلف لگے پڑے..... میں نے بھی بھی بانی فانی ہیرو نہیں دکھائے بلکہ عام زندگی میں ہمارے گھروں میں موجود ہمارے بھائی، باپ جیسے ہوتے ہیں اور میرے ہیرو سادہ مزاج ہوتے ہیں۔“

”ابھی آپ نے ذکر کیا نماز میں پلاٹ آنے کا..... تو وہ کون سا ناول تھا جو نماز پڑھنے کے دوران مکمل ہوا آپ کے ذہن میں؟“

”میرے اس ناول کا نام ”سفر تمام ہوا“ تھا اور ”ربیعاً“ ایک نیم پاگل لڑکی کا کردار تھا..... اس ناول کو بہت لوگوں نے پسند کیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اسل آپ نے اس ناول کی تعریف کے لیے مجھے دوبار فون کیا تھا۔“

”ٹی وی کی طرف آ جائیں آپ..... ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی بانی لکھیں یا خود لکھیں؟“

”آپ مجھے کم ہمت کہہ میں یا اتنا پرست کہ میں خود سے تو کہہ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں ڈراما لکھنا چاہتی ہوں..... ایک دن ”ہم کی وی“ کی طرف سے ایک لیٹر ملا کہ ہم آپ کے ناول ”زرد موسم“ پر ڈراما سیریل بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ہم سے رابطہ کریں..... پھر پتا چلا کہ ”زرد موسم“ کے لیے مجھے دو سال سے ڈھونڈا جا رہا تھا مگر میرا کالیکٹ نمبر نہیں مل رہا تھا۔“

”پہلا سیریل تو ”زرد موسم“ تھا۔ اس کے علاوہ کیا لکھا اور کیا لکھ رہی ہیں؟“

”جی..... پہلا سیریل ”زرد موسم“ تھا اس کے بعد ہم ٹی وی سے ”کرب“ ”کچھ نہ کہو“ اور تادان تو حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ جو کے لیے ”ساری بھول ہماری“ اسے پس کے لیے ”بیگانی“ اور اسے آروائی کے لیے ”میرے ہم نوا“ اور ”شکوہ نہیں کسی سے“ ”آن ایر ہوا آج کل آن ایر کوئی نہیں ہے البتہ دو



پرو جیکٹ انڈر پروفیشن ہیں۔ بہت زیادہ نہیں لکھ رہی۔ بس اتنا ہی لکھتی ہوں جس سے میں مطمئن رہوں اور یہ نہیں کہوں گی کہ میں نے کوئی سپر ہٹ ڈرامے دیے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے جتنا بھی لکھا اور جتنا بھی آن ایئر آیا اسے لوگوں نے بہت سراہا۔

”ڈراموں میں آپ رائٹرز مسائل کو الجھنوں کو بڑی مہارت سے حل کر لیتی ہیں۔ عام زندگی میں کیا صورت حال ہے؟“

”لکھنے میں اور عام زندگی میں فرق ہے اور تھوڑا نہیں بہت فرق ہے۔ قلم آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے زندگی کو آپ جو چاہیں موڑ دے دیں۔ عام زندگی میں آپ صرف گوشہ کش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد فیصلہ قسمت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اللہ نے اتنی صلاحیت دی ہے کہ میں چیزوں کو پنڈل کر لیتی ہوں صبر۔ برداشت اور تحمل کے ساتھ توازن کے ساتھ۔ تو پھر چیزیں میرے حق میں ہو جاتی ہیں۔ الحمد للہ۔“

”رائٹرز بہت محنت سے لکھتی ہیں۔ لوگ دیکھتے بھی شوق سے ہیں ڈراموں کی کہانیاں بھی لوگوں کو یاد رہ جاتی ہیں۔ مگر رائٹر کا نام کسی کو بلکہ اکثریت کو معلوم نہیں ہوتا۔ تو افسوس ہوتا ہے؟“

”ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے عام قاری کبھی بھی رائٹر کا نام نہیں دیکھتا۔ ہماری کہانیاں عام طور پر مشہور ہوتی ہیں ہمارے کرداروں کی وجہ سے، اسی طرح ڈراموں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ کردار یاد رہ جاتے ہیں۔ کہانی یاد رہ جاتی ہے مگر رائٹر ذہن میں نہیں ہوتا۔ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں رائٹر کی اس حوالے سے شاید اتنی دیکھو نہیں ہے کیونکہ ناظرین میں ہماری گہریلو خواتین زیادہ ہیں ان کے پاس اتنا نام نہیں ہوتا کہ ڈراما ختم ہونے پر رائٹر کا نام بھی دیکھیں۔ نہیں افسوس نہیں ہوتا کیونکہ کردار اگر پاپولر ہو رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی ہمارے

”اکثر رائٹرز کہتی ہیں کہ ڈراما سیریل کا معاوضہ بہت اچھا ملتا ہے۔ ایک رائٹر نے کہا کہ اتنا اچھا ملا کہ میں نے اپنی گاڑی خرید لی۔ آپ کیا کہیں گی؟“

”جی۔۔۔۔۔ بالکل ایسا ہے، معاوضہ اچھا ملتا ہے اور لوگ واقعی گاڑی لے رہے ہیں۔ اب میری اس بات پر کوئی ہنسنا چاہے تو کھل کر ہنسے کہ لوگ گاڑی لیتے ہیں مگر میں نے اپنی پہلی بے منٹ (ڈراما سیریل کی) سے ”بھینس“ لی تھی۔“

”ماشاء اللہ اتنا نام ہے۔ اتنا اچھا لکھتی ہیں۔ سسرال والوں نے یا میاں صاحب نے آپ کی تحریروں کو پسند کیا؟ آپ کی حوصلہ افزائی کی؟“

”اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کیا ہوگی کہ کبھی کسی نے لکھنے سے منع نہیں کیا۔ میرے میاں صاحب نے میرا ایک ہی ناول پڑھا تھا۔ ”سفر قیام ہوا“ اور اتنے انتہاک سے پڑھا کہ میں پریشان ہوئی کہ ان کو کیا ہو گیا ہے اور پڑھ کر کہا کہ بہت کمال کا لکھا ہے۔ میری مذمیری تحریروں پر بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ سب لوگ پسند کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور خیر کرتے ہیں اس بات پر کہ راحت بہت اچھا لکھتی ہے۔“

”ڈراموں میں زیادہ تر رونی دھوتی، مار کھاتی، مظلوم عورت ہی دکھائی جاتی ہے۔ کیوں؟“

”شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا رونا بکلتا ہے میں نے عام زندگی میں دیکھا ہے کہ عورت رونی کم ہے رلائی زیادہ ہے میری تو بہت گوشہ کش ہوتی ہے کہ میں عورتوں کو رونا ہوا یا رلانا ہوا نہ دکھاؤں، تاوان میں مریم کا کردار ایک آئینڈیل کردار تھا میرا، جس میں لڑکی حالات کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ بڑی محنت کے ساتھ، صبر کے ساتھ لڑبھڑ رہی ہے اور میں تو خود چاہتی ہوں کہ خواتین کے ایسے کردار سامنے آئیں جس میں بغاوت نہ دکھائیں بلکہ وہ کچھ دکھائیں جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ ہماری

زیادہ رونے دھونے والے ڈرامے۔۔۔۔۔ میں ویسے بھی نہیں دیکھتی کہ گھر کی ٹینشن سے اٹھ کر آپ ڈراما دیکھنے بیٹھ جاؤ اور اس میں بھی رونا دھونا چل رہا ہو تو بہت ٹینشن ہوتی ہے۔ میں تو رائٹرز سے اور پینٹل والوں سے کہوں گی کہ خدا را عورت کو اتنا مظلوم نہ دکھائیں۔ کیونکہ عورت اتنی مظلوم نہیں ہے۔ ماشاء اللہ بہت طاقت ور ہے، زندگی کے ہر میدان میں آگے جا رہی ہے۔ عورت کی اصل شخصیت دکھائیں کہ وہ آج کل کتنا کچھ کر رہی ہے زندگی کے ہر میدان میں۔“

”کچھ نئی سوال۔۔۔۔۔ گھر کے کاموں سے کتنا لگاؤ ہے، کھانا وغیرہ پکا لیتی ہیں؟“

”میں بنیادی طور پر Home ward (گھر بلو) ہوں، گھر میں رہنا، اسے سنا، کھانا پانا مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ باپڑ لٹنے کی اتنی شوقین نہیں ہوں۔ جب شادی نہیں ہوئی تھی تو گھر میں کھانا شوق سے پکاتی تھی سب کو کھلاتی تھی اب سسرال میں بھی میں بہت شوق سے کھانا پکاتی ہوں سب بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ الحمد للہ سب کچھ بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ خواہ کسی دعوت کا اہتمام ہو یا گھر کی عام دال رونی اور چٹنی ہو۔ میری بیٹی میرے ہاتھ کی پکی بریانی بہت شوق سے کھاتی ہے۔ ایک فرمائش کر کے بنوائی ہے۔ اکثر کہتی ہے کہ ماما آپ رائٹر نہ ہوتیں تو بہت اچھی شیف ہوتیں تو الحمد للہ گھر کا ماحول ایسا ہے کہ ایک روایتی بیٹھک ہے جہاں لوگ آتے ہیں۔ ناشتہ کے وقت بھی آتے ہیں دوپہر کے وقت بھی آ رہے ہوتے ہیں۔ کھانا کھا کر اچھا لگتا ہے۔ برکت بھی ہوتی ہے۔“

”لکھنا، گھر سنبھالنا، سسرال کو دیکھنا، ان ساری باتوں میں گھر کو کس طرح منج کرتی ہیں؟ گھر ڈسٹرب تو نہیں ہوتا؟“

”میرے لیے میرا گھر میرے رشتے میرے شوق سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ جب بھی مجھے محسوس ہوا کہ میرے اس شوق کی وجہ سے میرا گھر ڈسٹرب ہو رہا ہے یا میرے مسائل میری زندگی سے

ڈسٹرب ہو رہے ہیں، یا میری بیٹی پریشان ہو رہی ہے تو میں نے لکھنا بہت کم کر دیا تھا۔۔۔۔۔ قواب میں عموماً اسی وقت لکھتی ہوں جب میں اپنے گھر کے سارے فرائض پورے کر لیتی ہوں، میاں کو پورا ٹائم دے دوں میری یہ عادت ہے کہ جب میری بیٹی بلور میرے میاں صاحب گھر آ جاتے ہیں تو پھر بہت کم لکھتی ہوں یا بہت مجبوری ہو تو لکھتی ہوں ورنہ نہیں۔ گھر بیچ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گھر میں سب بہت کم کر رہے ہیں۔“

”بھی ایسا ہوا کہ آپ کے ڈراما کو خراب کر دیا گیا، مطلب آپ نے جو چاہا وہ نہیں ہوا؟“

”نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ جو لکھا وہ ہی شوٹ ہوا، کیونکہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ کام کیا۔“

”کھیلوں سے اور سیاست سے کتنا لگاؤ ہے؟“

”مجھے کرکٹ سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے اور آخری بار وہ والا کرکٹ ورلڈ کپ دیکھا تھا جو پاکستان نے جیتا تھا۔۔۔۔۔ باقی کھیلوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ سیاسی لگاؤ کے لیے میرے میاں کافی ہیں۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے نو بجے کا خبرنامہ دیکھ لیتی ہوں۔“

”آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟“

”بالکل کہنا چاہوں گی۔۔۔۔۔ میرے اکثر قارئین مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے لکھنا کیوں چھوڑا۔۔۔۔۔ لکھنا نہیں چھوڑا البتہ وقفہ لمبا ضرور ہو گیا ہے۔ کوئی اپنا گھر بھی بھول سکتا ہے۔ واپس تو مجھے آنا ہی ہے لکھنا بھی ہے۔۔۔۔۔ بس آپ کے توسط سے ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ جو چیزیں میں نے ایش بیس سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ وہ اب شاید اس عمر میں لکھنا مشکل ہو جائے۔ عمر بھی بدل گئی ہے تجربات بھی بدل گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر میری تحریروں میں ایسی کوئی کی محسوس ہو تو اسے محبت کے ساتھ قبول کر لیں۔“ (راحت! آپ کے قارئین بھی وقت کے سفر میں آگے بڑھیں تو آپ لکھیں یقیناً وہ آپ کو اس انداز میں بھی پسند کریں گے)۔



آپ کی پر خلوص رفاقتوں میں ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں اپنی قارئین کا پر خلوص تعاون حاصل ہے۔ ہماری قارئین ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ہمیں اسے قیمتی مشوروں سے نوازی ہیں۔ ہماری خواہش ہوتی ہے، خاص نمبروں میں اپنی قارئین کا مختصر سا تعارف شامل کریں جس سے ان سے منسلک رشتے، ان کے روز و شب کا احوال اور پرچے سے ان کا تعلق سامنے آئے۔

حسب روایت اس بار بھی سروے شامل ہے۔ سوالات یہ ہیں.....!!

(۱) خواتین ڈائجسٹ کب سے پڑھ رہی ہیں؟ خواتین ڈائجسٹ سے پہلا تعارف کیسے ہوا؟

(۲) آپ کی روزمرہ روٹین کیا ہے، گھر کی ذمہ داریوں، بچوں، تعلیم اور جواب کی مصروفیات کے دوران مطالعے کا وقت کیسے نکالتی ہیں؟

(۳) اپنا پسندیدہ شعر لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جواب دیے ہیں۔

## دستک پہنارنگی

ادوار

فرخندہ انجم..... لاہور

(۱) آپ کو خواتین ڈائجسٹ کی عمر میں ایک اور سال آگے جانے کی مبارک۔ میں خواتین 1980ء سے پڑھ رہی ہوں تب میں نے جب شروع کی تھی۔ بک اشال پر خواتین ڈائجسٹ دیکھا، خرید لیا اور آج تک پڑھ رہی ہوں، میں نے ہمیشہ خود خرید لیا گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

(۲) پہلے آفس جانا مگر جب چھوڑ دی۔ اب لاہور کی بی او جاتے ہوئے (عینشن لینے کے لیے) سب سے پہلے خواتین اور شعاع خریدتے ہیں۔ بڑا بیٹا شادی شدہ ماشاء اللہ۔ چھوٹا بیٹا بی او ایچ ڈی کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس کی جلد شادی کر دینی ہے، لکھنا خود بناتی ہوں کیونکہ مجھے اور میری بی او جات کو کام کرنے کی عادت ہے۔ سارا دن مصروفیت میں گزر جاتا ہے، رسالے پڑھنے کی عادت رات کو ہے۔ رات دیر تک رسالے پڑھتا، دیر سے سوتا مگر جلدی اٹھتا، یہ سب اپنی زندگی کے معمول ہیں۔

(3) شاعری سے پرانا لگاؤ ہے۔ ہر اچھا شعر کبھی یاد

ہو جاتا ہے، اب کبھی کبھی یاد رہتا ہے۔

مل سکا نقش نہ دھندلا سا بھی منظر  
میں نے سمجھا تھا، تیرے دل پر حکومت کی ہے  
صانعِ گل..... مردان

رسالہ آیا تو پرسوں ہے مگر چونکہ بچوں کے سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں تو ایسے میں میری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ (بچے ماشاء اللہ بڑی کلاسوں میں اور یونیورسٹی ہولڈر ہیں) تو اسی مصروفیت کی وجہ سے رسالہ ابھی کھولا۔ سرسری نظر دوڑانی تو سروے کے سوالات پر نظر پڑی۔ یاد رہے اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ آج ہم نے آپا (نند) کی پوری فیملی کی دعوت کی تھی (چھیلے ماہ سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی ہوئی ہے) صبح سے چن میں اکیلی گئی تھی۔ مگر میں ہیلپ کرانے والا کوئی نہیں ہے۔ بچے اسکول اور خان صاحب (مجازی خدا) آفس میں۔ البتہ بے بے "ساس" نے سبزی بنانے میں کافی ہیلپ کی۔ اللہ انہیں زندگی دے — قصہ مختصر مہمانوں کو دعوت کھلا کر چن سمیٹا۔ دونوں چھوٹوں عمران اور سفیان کو سلا کر نماز پڑھی اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی

حالانکہ محکم سے برا حال ہے مگر یہ محکم تو سروے کے جوابات لکھ کر ہی دور ہوگی۔

(1) خواتین سے پہلا تعارف؟ اس کے لیے تھوڑا پیچھے جانا پڑے گا۔ ماضی کے درپچوں میں جھانکا تو ایک چودہ پندرہ سالہ، آٹھویں جماعت کی طالبہ سفید یونیفارم پہنے، دو چٹیاں آگے ڈالے، بریک میں خواتین میں کم نظر آتی تھی۔ تب کہانی صبح سے سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی۔ اشعار، لطیفے اور احوال زریں شوق سے پڑھتی تھی۔

باقاعدہ تعارف فرحت اشتیاق کے "بن روئے آنسو" کی بدولت ہوا۔ اور یہ بات ہے 2005 کی۔ جب اتوار بازار سے پرانا رسالہ خرید اور بن روئے کی قسط پڑھی۔ بس جی اس نے تو ہمیں خطی، دیوانہ، پاگل سب کچھ کر دیا تھا۔ پھر کیا تھا جناب اتوار بازار جا کر جتنے رسالے خرید سکتی تھی، خرید لیے مگر جتنا جتنا پڑھتے گئے، اتنی ہی طلب بڑھتی گئی۔

پہلے پہل تو خان صاحب ناراض ہوئے پڑھنے پر، مگر جب خود اس میں احادیث اور اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا انٹرویو پڑھا تو تب سے لے کر آج تک ہر ماہ باقاعدگی سے خواتین اور شعاع لا کر دیتے ہیں۔

(2) روزمرہ کی روٹین وہی ہے جو کہ ہر ماؤس وائف کی ہوتی ہے۔ بچوں کو دیکھنا، گھر سنیا لانا، کھانا پکانا اور روزمرہ کے دیگر کام۔

بچہ کی اذیتوں کے ساتھ اٹھ جاتی ہوں، نماز اور صبح و شام کے بعد کچن کارنگ کرتی ہوں۔ خان صاحب اور بچوں کو ناشتہ اور کچن بکس بنا کر دیتی ہوں۔ جب بچے اسکول اور خان صاحب آفس کے لیے نکل جاتے ہیں تو میں اور بے بے (ساس) مل کر ناشتہ کرتی ہیں چونکہ آج کل شڈ ہے تو نو ساڑھے نو تک ہم کمرہ میں ہی ہوتے ہیں۔ دونوں چھوٹے (عمران، سفیان) کو کارٹون لگا کر خود جلدی جلدی کر کے کھانا دے دیتی ہوں اور ادھر ادھر پوچھنے کے لیے رسالہ پڑھ لیتی ہوں پھر اگر دن میں سفیان سو جائے تو رسالہ پڑھ لیتی ہوں ورنہ رات کا انتظار رہتا ہے جب ہم ہوتے ہیں اور خواتین ہوتا ہے (اب یہی دیکھ لیں، بدن محکم سے جو رہے مگر سروے میں شامل ہونے سے خود کو روک نہیں پائے)۔

(3) شعر کے بارے میں میں گویں گی کہ.....

کبھی تم بھی ہم بھی تھے آشنا  
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
جی کی زمانے میں ہمارے پسندیدہ اشعار کی ایک لمبی لسٹ ہوا کرتی تھی لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں پر "الف" کا ایک چھوٹا سا شکر انمول جملہ تحریر کرنا چاہوں گی جو کہ سید ہادل میں اتر گیا۔

"اگر کھونے اور گنوانے والی شے ہے ہی نہیں، جو کھو جائے، وہ پھر اجر نہیں۔ اجر سے پہلے کی آزمائش ہے۔"

طاہرہ یاسمین..... ٹیکسلا کینٹ

(1) خواتین ڈائجسٹ تب سے پڑھ رہی ہوں کہ ابھی میں نے شعور کی سیڑھی پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ چودہ سال کی عمر سے ہمارا ساتھ ہے، پچیس سال ہو گئے۔ اس دوران کبھی رابطہ مسلسل رہا، کبھی عرصہ دراز تک ٹوٹا رہا لیکن زندگی کی الجھنوں میں دوبارہ ملنے کے باوجود بھی اگر شامل نہ ہو سکے تو بھی ایک بھی مہینہ ایسا نہیں گزرا جب ڈائجسٹ نہ پڑھا ہو اور میرے پاس اتنے سالوں کے تمام خواتین و شعاع کے پرچے محفوظ ہیں۔

پہلا تعارف ایسے ہوا تھا کہ میری امی جان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر قسم کی معلوماتی اور تاریخی کتابیں لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد میں نے ان کی چیزوں کو دیکھا تو ان میں سے مجھے ایک خواتین ڈائجسٹ ملا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ڈوٹی بھیا جان محفل ہوا کرتے تھے۔ میں نے پڑھا اور بہت اچھا لگا۔ مجھے خود بھی شوق تھا، بچوں کے اخبار اور بچوں کے رسالوں میں لکھتی رہتی تھی۔ بس اس کے بعد سے آپ سے وابستہ ہیں۔

یہ الگ کہانی ہے کہ رسالے کا حصول اس وقت کتنا مشکل ہوتا تھا اور بہت سے لوگ رسالہ پڑھنے کو برا سمجھتے تھے بلکہ بے راہ اور بدکردار تک کہا جاتا تھا۔ ماں بھی نہیں تھیں جو اس عمار پر لڑ سکتی تھیں، بہت سی بینش خاص کر گاؤں میں رہنے والی خواتین میری بات کو بہتر سمجھ سکتی ہیں کہ گاؤں کے ماحول میں آج سے پچیس سال پہلے رسالہ پڑھنے والے کے کیا حالات ہوتے تھے۔ لیکن میں نے



ہمت نہیں ہاری اور آج وہی لوگ جب میری کوئی تحریر یا محفل میں میرا نام دیکھتے ہیں تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

(2) میری روزمرہ کی روٹین کافی ٹف ہے۔ شوہر بیمار ہیں میں جاب بھی کرتی ہوں۔ ساس امی بھی کافی عرصہ سے علیل ہیں اور چار بچوں کی ہر قسم کی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ جاب، گھر کا کام، بیماروں کا خیال رکھنا سب اپنی جگہ پر لیکن ان سب چیزوں کے باوجود میں جتنا بھی تھکی ہوئی ہوتی ہوں جب تک مطالعہ نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی، سب کام ختم کر کے عشاء کی نماز پڑھ کر بستر پر جاتی ہوں تو مطالعہ کرتی ہوں۔

خوانین، شعاع و کرن کے علاوہ میں دینی اور تاریخی کتب بھی پڑھتی ہوں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور لکھنے کا بھی دل کرتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خوانین و شعاع میں میرے ناول چھپیں لیکن لکھنے کے لیے تاہم نہیں مل رہا لیکن مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ میری اس خواہش کو بہت جلد پورا کرے گا۔

اپنے لیے بھی ضرور وقت نکالنا چاہیے، زندگی کتنی ہی پریشان کن یا آزمائش بھری کیوں نہ ہو، وہ لمحات میں اپنے لیے جیتی ہوں، جب خوانین و شعاع کے ساتھ ہوتی ہوں۔ وہ وقت میرا اور صرف میرا ہوتا ہے۔

(3) شعر تو بہت سارے پسند ہیں۔ ہر اچھے شاعر کا ہر شعر اچھا لگتا ہے۔ پھر بھی ایک شعر عرض ہے۔ جگر ہو جائے گا چھلی، یہ آنکھیں خون روئیں گی وہی بے فیض لوگوں سے بھا کر کچھ نہیں ملتا ہاجرہ عمران..... لاہور

(1) جواب یہ ہے کہ خوانین ڈائجسٹ سے تعلق بہت پرانا ہے۔ ہوش سنہا لے ہی گھر میں شعاع اور خوانین ڈائجسٹ کی آمد دیکھی۔ باجی اور امی دونوں ہی مطالعے کی شوقین تھیں۔ رقیہ باجی کو گھر گزرتی کے علاوہ ڈائجسٹ کی دنیا میں کم پایا۔ البتہ بذات خود اس کا مطالعہ اس وقت کیا جب میں فرسٹ ایئر میں تھی۔ باجی رسالہ اس شرط پر دیا کرتیں کہ ایک بھی بیج مڑنا یا خراب نہیں ہونا چاہیے۔ باجی نے کارڈن بھر کے نئے گور خوانین ڈائجسٹ رکھے ہوئے تھے۔

اپنی شادی کے بعد میں خوانین ڈائجسٹ سے کافی

عرصہ دور رہی مگر گزشتہ چار سال سے ریکور پڑھ رہی ہوں۔

(2) دوسرا سوال ایسا ہے کہ زندگی کی مصروفیات میں کھوئی ہوئی خاتون خاندان کو خود پر ایک نظر ڈالنے پر مجبور کر گیا ہے۔ روزانہ کی روٹین میں سب سے ضروری چیز نماز ہے۔ نماز کے اوقات کے دوران ہی عموماً کاموں کو ختم کر رکھا ہوتا ہے۔

فجر کی نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد اپنے لیے ڈائنٹ قبوہ تیار کرنا، اس کے بعد بچوں کے لیے ناشتہ بنانا ہوتا ہے۔ صبح آٹھ بجے کی خبریں سننا معمول کا حصہ ہے جس کے ساتھ چائے اور رسک کا ناشتہ کرنا عادت۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کی خبروں پر نظر رکھنا، ان کے بارے میں ایک تجزیہ بنانا یہ بھی میرے معمول کا حصہ ہے۔

اس کے علاوہ موسم کا حال جاننا میری اولین خواہش ہوتی ہے کیونکہ اس حساب سے کپڑوں کی سلیکشن اور کھانا پکانے کی چوائس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آج واشنگ مشین لگے گی یا نہیں۔ بارش کی خبر مل جائے تو کپڑے ایک روز پہلے دھو لیتی ہوں۔

نوبے سے دس یا ساڑھے دس کا وقت سرتاج یعنی خان صاحب کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس دوران کوئی بھی دوسرا کام کرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ بس خان صاحب کا ناشتہ، جوتے کپڑے..... نو نوں کال..... نہ ہی کوئی دوسری مصروفیت۔ گیارہ بجے سے دو بجے تک سخت ترین شیڈول ہوتا ہے، جس میں گھر کی صفائی، سحرانی، کھانا پکانا اور کپڑے دھونے ہوں تو ان سے بھی ہٹنا۔

ان سب کاموں کے دوران رشتے داروں (امی، باجی، میا، سعدیہ، مریم) اور دوست (ریحانہ اعجاز) کو کال کرنا..... خوب دل لگا کر کام بھی سرانجام دیا جاتا ہے اور ضروری ڈیٹا بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

دو سے تین بجے تک کا وقت نماز، بچوں سے کپ شپ اور بیچ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دل چاہے مطالعہ کرو اور دل چاہے تو آرام۔ شام کے کام الگ ہیں، چائے، برتن، رات کا کھانا اور پھر اچھی عادت کہ بچن مکمل طور پر صاف کر کے سونا۔ بھی بھی رات سونے سے پہلے بھی





مطالعہ کر لیتی ہوں، ورنہ عموماً یہ کام دوپہر میں کر لیتی ہوں۔

ایک شمارہ پڑھنے میں دو دن لگاتی ہوں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر بہت سا مواد پڑھتا، ریڈیو سچ کرنا اور وال پریکٹر لکھنا محبوب مشغلہ ہے۔ کچھ وقت ملے تو افسانے لکھتا اور ایک ناول بھی شروع کر رکھا ہے، اسے ٹائپ کرنا، زندگی مصروف ہی مصروف ہے۔

شام میں بیٹی کے لیے وقت بھی نکالتی ہوں۔ قرآن پاک سننا اور تعلیم میں مدد دینا ضروری فرض کے طور پر ادا کرتی ہوں کیونکہ بچوں کا حق ماں باپ پر سب سے پہلے ہے۔ اس کے علاوہ دیک اینڈز پر مہمانوں کو ویلیم کہنا اور اچھے مزے دار کھانے بنانا بھی پسندیدہ مشغلہ ہے۔

تزیلیہ یوسف ..... لاہور

(1) خواتین ڈائجسٹ اس وقت پڑھنا شروع کیا جب اس کے افسانے، ناول انٹرنیٹ پر سے گزر جاتے تھے۔ اسکول کا زمانہ تھا، شاید آٹھویں میں تھی۔ آج سے تقریباً چوبیس سال پہلے کی بات ہے۔ میری امی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں تو پہلا تعارف امی کے ذریعے سے ہوا۔ ابو کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوئے وہاں قریب ہی میری پہیلی کا گھر بھی تھا۔ اس کی بڑی بہن خواتین، شعاع اور کرن بہت پڑھتی تھیں، وہی امی کو بھی پڑھنے کو دے دیتی۔ میں نے بھی تب ہی پڑھنا شروع کیا امی کچھ بھی نہیں کہتی تھیں، بس یہی کہ ابھی تمہاری عمر نہیں پڑھنے کی۔

(2) میں مکمل طور پر گھریلو خاتون ہوں۔ ایم اے کے دوران ہی شادی ہو گئی پھر بیچے، یوں تعلیم ادھوری رہ گئی۔ 2014ء میں پڑھائی کا متقطع سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے رکھا تھا۔ یوں 2016ء میں اسلامیات کے ماسٹر صاحب بھی بن گئے۔

بچوں کو اسکول چھوڑنے کی ذمہ داری میری ہے کہ اس وقت میاں صاحب روزگار کے غموں میں اکیسے ہوتے ہیں۔ پہلے بچوں کو اسکول چھوڑ کر دو گھنٹے سو جاتی تھی لیکن اب پچھلے تین سالوں سے اس روٹین میں فرق یہ آیا ہے کہ سونے کے بجائے یہ دو گھنٹے مطالعے یا پھر لکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ دو سال پہلے بچوں کے ادب میں قدم

رکھا اور الحمد للہ یہ سفر آج بھی جاری و ساری ہے۔ صبح کے وقت کے علاوہ رات کو بھی تقریباً دو سے ڈھائی گھنٹے یہی روٹین ہے۔ یہ دونوں اوقات میرے اور میری کتابوں، قلم کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ درمیان میں اگر وقت ملے تو وہ وقت سوشل میڈیا کا ہوتا ہے۔

آج کے سوشل میڈیا کی دور میں مطالعے کا مفہوم بہت بدل گیا ہے۔ اب مطالعے کا مطلب کتاب ہاتھ میں لے کر اگر پڑھتا ہے، وہیں اس کا مطلب کسی اچھی ویب سائٹ کا وزٹ کرنا، وہاں کی تحاریر زیر مطالعہ لانا بھی ہے۔ ویسے میری ذاتی رائے یہی ہے کہ جو مزہ کتاب ہاتھ

میں لے کر پڑھنے میں ہے وہ اسکرین پر نہیں۔ جاب نہیں کرتی کہ ”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں.....“

(3) پسندیدہ شعر کوئی ایک نہیں، بہت سارے ہیں۔ موڈ پر انحصار کرتا ہے کہ کب کوئی شعر، غزل دل کو چھو جائے اور اپنے حصار میں لے لے۔ آج کل شہباز علی نقوی کا ایک شعر پسندیدگی کی مسند پر براجمان ہے۔

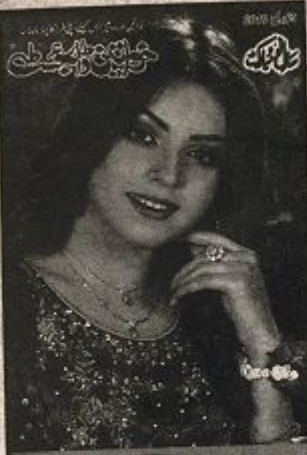
اجالا تھا، اجالا چار سو تھا  
مگر دل میں اترتا ہی نہیں تھا  
سحر مجھ سحری..... مغل پوری

(1) خواتین ڈائجسٹ ستمبر 2016ء سے پڑھ رہی ہوں اور اب ہمیشہ پڑھوں گی۔

تعارف ایسے ہوا کہ مجھے خواتین ستمبر کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ ہاتھ میں پھولوں کا بکے لیے ہنسی مسکراتی ماڈل نے دل موہ لیا۔ سو میں نے فوراً خرید لیا لیکن کبھی تاریخ پر نہیں مل پاتا تھا تو کبھی میں لیٹ ہو جاتی تو ختم ہو جاتا تھا لیکن جنوری 2017ء سے میں خواتین پر پکڑ حاصل کر بی لی۔

(2) میری روٹین یہ ہے کہ صبح گیارہ بجے اٹھنا ایک بجے تک ناشتہ کرنا (سلسلو) پھر اس کے بعد اپنا روم صاف کر کے مزے سے رسالے پڑھنا گھر کی ذمہ داریاں مجھے پر کچھ خاص نہیں ہیں بس کبھی کبھی دل کیا تو کوٹنگ کر لیتی ہوں ورنہ میری کوئی لکھ روٹین نہیں ہے۔

(3) شعر تو بہت سے اچھے لگتے ہیں لیکن فی الحال کوئی ایک بھی دماغ میں نہیں آ رہا ہے۔ ہاں ایک شعر اپنی اور خواتین ڈائجسٹ کے دوستی پر لکھ سکتی ہوں۔





جب بھی آتا ہے تیرا نام، میرے نام کے ساتھ جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں شاہدہ ظفر..... ڈیرہ مستی، بہاولپور

(1) جب لفظوں کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا تو ابو جان جو مطالعے کے بے حد شوقین ہیں، مختلف قسم کی کتابوں کے علاوہ رسالے بھی لے کر آتے جو میں شوق سے پڑھتی۔ امی ابو نے کبھی رسالے پڑھنے سے منع نہیں کیا بلکہ جب کچھ بڑی ہوئی اور کہانیوں کی سمجھ آنے لگی تو جو کہانی ابوکوا چھی لگتی اسے خاص طور پر پڑھنے کو کہتے اور یہ والدین کا بخشنا ہوا اعتماد ہے کہ ان کی نظروں میں سرخرو ہیں۔ ماں باپ کی تربیت اچھے اساتذہ کی سنگت اور ہماری ذہین مصنفین نے ہر جگہ ہماری رہنمائی کی، شکر یہ خواتین ڈائجسٹ۔

مستقل قاری بنے ہیں ستمبر 2003ء سے، جب بشری سعید کی ”قص جنوں“ پڑھی اور تاحال خواتین ڈائجسٹ کے قاری ہیں اور تمام رسالے محفوظ ہیں کیونکہ جب میری بیٹی ایمن تھوڑی بڑی ہو جائے گی تو اسے بھی پڑھنے کو دوں گی۔

(2) میں باؤس دوسن ہوں۔ فجر کی پہلی اذان کے ساتھ بیدار ہوتی ہوں۔ نماز، قرآن پاک، وظائف سے فارغ ہو کر ناشتہ بناتی ہوں، بچوں کو ناشتہ کروا کر اسکول بھیجتی ہوں۔ اس کے بعد برتن دھونے اور گھر کی صفائی میں ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے کیونکہ مجھے ٹائم دیکھ کر کام کرنے کی عادت ہے۔ اس طرح وقت کی بچت ہوتی ہے۔ دوپہر کا کھانا بنانے سے پہلے میرے پاس دو گھنٹے ہوتے ہیں مطالعے کے لیے۔ کھانا بنانے اور بچوں کو کھلا کر ٹیوشن بھیجتا۔

ظہر کی نماز کے بعد بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا جو کہ دس بارہ کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نماز کے بعد ہلکا پھلکا رات کا کھانا نماز عشاء کے بعد پھر مطالعہ کرنا، اسی پڑھنے کی لت نے دیر سے سونے کی عادت ڈالی ہوئی ہے۔ کچھ تو ہم پڑھنے کے شوقین اور کچھ اس لیے کہ میاں جی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر ہوتے ہیں اور کئی مہینے کے بعد آتے ہیں۔

(3) رکتا بھی نہیں، ٹھیک سے چلتا بھی نہیں یہ دل ہے کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل کھلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں رانی حمید..... کوہاٹ، کے پی کے

(1) خواتین میں پانچویں کلاس سے پڑھ رہی ہوں اور خواتین سے میرا تعارف اپنی امی کے ذریعے ہوا۔ میں پانچویں کلاس میں تھی میری اردو کافی اچھی تھی تو میں امی کے رسالے لے کر ادھر پرچھت پرے اسٹور میں گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں چھپ کر پڑھتی تھی اور میری چھوٹی بہن مجھے جن بھوکوں کی آوازیں نکال کر ڈرائی رہتی تھی مگر وہ مجھے ڈرانے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی کیوں کہ میں رسالہ پڑھنے میں اتنی گمن ہوئی تھی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

(2) میری روزمرہ روٹین تو کافی لمبی کہانی ہے، کہیں آپ پورنہ ہو جائیں۔ ہم پانچ بہنیں ہیں اور ایک بھائی۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میری امی گرلز کان پرائیویٹ میں ٹیچر ہیں اور ابوی کانج میں چوکیدار ہیں تو وہ دونوں صحت سات بچے ہی سے کانج ملے جاتے ہیں اور میں نے بی اے کیا ہوا ہے۔ میں گھر میں ہوتی ہوں۔ بانی میری بہنیں اور بھائی پڑھ رہے ہیں اور مجھ سے چھوٹی بہن پرائیویٹ اسکول میں پچھ رہے تو گھر کی ساری ذمہ داری میری ہوتی ہے۔ گھر کی صفائی سے لے کر کھانا پکانا وغیرہ اور امی کی ٹیچرنگ کے لیے چاول اور چائے وغیرہ بنانا بھی میری ذمہ داری ہے۔

ہمارا گھر انڈے کا پابند اور نمازی گھر انڈے یعنی کہ ہم سب بہنیں برقع پہنتی ہیں اور نماز پابندی سے پڑھتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آج کل کی مہنگائی کے دور میں برکت ڈالی ہوئی ہے۔ گزارا اچھے طریقے سے ہو جاتا ہے اور ویسے بھی اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

گھر میں ان تمام مصروفیات کے باوجود شعاع، خواتین اور کرن پڑھنے کا وقت نکال ہی لیتی ہوں۔ میری

## میری خواہش، میرا خواب... دُعا ہے بس سہیل احمد

مجھے چونکا دیا تھا۔ ان دنوں میں نے مارخام کی کہانی بھی پڑھی تھی، جس سے میں بے انتہا متاثر ہوئی تھی۔ صرف متاثر ہونا کافی نہیں تھا تو میں نے شیطان پر ایک کہانی لکھ دی۔ گرمی کی چھٹیاں تھیں۔ میرے بارے میں یقین رکھا جاتا تھا کہ میں کسی نہ کسی تحریر کا کام میں مصروف رہتی ہوں اس لیے مجھے ایک عدد ”خطاب“ دیا گیا تھا۔

یہ خطاب میں آپ سے شیئر کر سکتی ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ پھر آپ مجھے اسی ”لقب“ سے پکارنے لگیں گے۔ بس اس نام کا مطلب ایسا بندہ ہونا ہے جو چند اچھے کام کرے اور باقی کا سب فساد، برباد کرے۔ اور مانا کا رچے۔

(وہی مجھے کھرا والوں کو عادت ہوتی ہے چوٹی کو ہاتھی بنانے کی اور میری بے شمار چوٹیاں ہاتھی بنی ہیں۔)

جب میں نے شیطان کی کہانی لکھی تو میرے لیے اسے پوسٹ کروانا بہت عظیم قسم کا مسئلہ بن گیا۔ میں نے اپنی دس بیس کلاس فیلوز، آدھے اسکول، پورے جہاں سے باتوں باتوں میں یہ معلوم کرنا چاہا کہ اگر کسی جگہ کوئی چیز بھیجی ہو یعنی چند پیسے تو کیسے بھیجے جاسکتے ہیں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کھرا والوں سے مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ میں پہلے ہی بدنام تھی۔ دوسرا مجھے یہ خوف تھا کہ وہ اسے پوسٹ کروانے کے بجائے کھولیں گے۔ پڑھیں گے اور پھر پھر۔۔۔۔۔ ہاں وہی۔۔۔۔۔

نفسے دل ایسی، ویسی جگہاں نہیں سہہ سکتے نا، تو میں اس شیطانی کہانی کوئی سے نئی جگہ چھپاتی رہتی تھی کہ کوئی پڑھ نہ لے۔ گھر ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں لگا ہر تالا، گھر کے ہر فرد کے ہاتھوں کل جاتا ہے۔ زمین کھود کر بھی کچھ بدادونا، تو وہ وہاں سے بھی یہ ”خزانہ“ نکال لیتے ہیں۔

کائنات میں طاقت در ترین قوت، محبت کی قوت ہوتی ہے۔ اس کی وسعت بے کنار ہے اور گہرائی بے انداز۔ الہام کی طرح یہ ہر اس دل پر وارد ہو کر ہی رہتی ہے، جس کے لیے دل میں رکھی جاتی ہے۔ محبت کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ وہ پھل پھول کر ”پھول“ ضرور کھلا دیتا ہے۔

آپ کی محبت کے پھول اور ان سے مہکتا گلستاں مجھے عزیز ہے۔۔۔۔۔ آپ سب میرے عزیزم ہیں۔۔۔۔۔

میں آج تک کبھی کسی ایک بھی قاری کا شکریہ ادا نہیں کر سکی۔ شکریہ اگر ایک لفظ ہوتا تو میں کہہ دیتی۔ ایک بار میں ادا ہو جاتا تو میں ادا کر دیتی۔ لیکن ”شکر“ کا تسلسل تو مسلسل ہوتا ہے نا۔ اسے الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں عزیز رکھ کر، اعزاز دے کر، محبت کی برابری پر لا کر شاید کچھ ادا ہو سکے۔

پاکستان میں شاید یہ کوئی لڑکی ایسی ہوگی جس نے خواتین ڈائجسٹ کا نام نہیں سنا ہوگا۔ پہلی بار میں نے اس کا نام اسکول میں سنا تھا۔ میں دوسری کتابیں پڑھتی رہی تھی لیکن میرے لیے ڈائجسٹ کا لفظ ہی نیا تھا۔ اپنی کلاس فیلو کے بتانے پر میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ تو اس نے کہا۔

”اس میں بہت سی کہانیاں ہوتی ہیں۔“  
تو میں نے کہا کہ ”کیا تم مجھے ایک لاکر کھاسکتی ہو۔“

اگلے دن وہ اپنے بیک میں رکھ کر لے آئی تھی۔ یہ خواتین، شعاع میں سے کوئی ایک تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور پوچھا۔  
”بہت ساری کہانیاں ہیں اس میں؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں“۔ اس کا لایا ہوا ڈائجسٹ تو میں نہیں پڑھ سکی تھی، لیکن آنے والے وقت میں کئی ایک ضرور پڑھ لیے تھے۔ کہانیوں کی نوعیت نے



تو میرا خزانہ..... یعنی وہ شیطان..... وہ یہاں وہاں دبا پڑا رہا.....

بہر حال میں وہ کہانی پوسٹ کروانے میں ناکام رہی۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ چونکہ میں نے مارخام کی کہانی پڑھی اور اس سے متاثر ہوئی ہوں تو یہ اس کے زیر اثر ہے۔ میں نے اس پر غور کیا۔ اس کیفیت نے مجھے سمجھا یا کہ تخلیق مستعار نہیں لی جاتی۔ اگر لی جائے تو وہ تخلیق نہیں ہوتی۔ میں نے ایک فیصلہ کیا، شیطان یعنی بیہوش نکالے اور ایک ایک کر کے جلا دیے اور میری انہیں چھپا کر رکھنے کی فینشن بھی ختم ہوگئی۔

تو میری پہلی کہانی..... آگ کے سپرد ہوئی۔ میں نے پاکستان میں ہونے والے مضمون نویسی کے ایک مقالے کے لیے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس پر بہت محنت کی، کتابیں پڑھیں، ریسرچ کی۔ اپنی طرف سے بی ایچ ڈی لیول کا مقابلہ لکھا کہ کسی میں ہمت ہے تو اس مضمون کے آگے جیت کر دکھائے۔

میں نے ہار کر دکھایا..... اس مقابلے کو جیتنا تو دور کی بات، انہوں نے مجھے کال کر کے یہ تک بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میرا مضمون انہیں مل چکا ہے۔ اپنے دل کو کلی دینے کے لیے میں نے سوچ لیا کہ میں نے ایڈریس ہی ٹھیک نہیں لکھا تھا۔ میری رائٹنگ بھی تو خراب ہے، وہ بے چارے پڑھ نہیں سکے ہوں گے۔ ورنہ میرا مضمون تو نمبروں سے بھی اوپر آتا.....

وہ سوویں نمبر سے بھی نیچے گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ مضمون نہیں تھا، ”مجموعہ بونگا پن“ تھا۔ پینٹل نے پہلا صفحہ پڑھنے کی کوشش کی ہوگی تو تین چار سطریں پڑھ کر سائیڈ پر رکھ دیا ہوگا اور زیر لب بڑبڑائے ہوں گے۔ ”مجھے سے بالاتر ہے۔“

لیکن خواتین ڈائجسٹ نے ایسا نہیں کہا۔ ”طوافِ عشق“ میں آمنہ، کسوہ کا نام سن کر کہتی ہے نا

کہ ”کہانی یہیں سے تو شروع ہوئی تھی۔“ تو اسٹیل کی کال بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ.....

”کہانی یہیں سے تو شروع ہوئی تھی عزیز میرا..... بالکل یہیں سے۔“

عزیزی میرا راسخ نہیں تھی..... نہ ہی ابھی تک رائٹر بنی ہے..... میں سیکھ رہی ہوں، اور سیکھتی رہوں گی، یہ سب کچھ ختم نہیں ہوگا۔ لیکن میری خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ ادارے نے اس سفر کو میرے لیے آسان کیا ہے۔ مجھے سمجھایا اور پڑھایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ہر ایڈیٹر، ہر ادارہ خواتین ڈائجسٹ جیسا ہوتا ہے، لیکن آنے والے وقت میں میری خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہوتا۔

میری ایک کہانی پر اسٹیل نے مجھے ایک بہت پیاری بات سمجھائی اور کہا۔

”میرا اہم ابھی اس کہانی کو رہنے دو، ایسی کہانیاں دل بوجھل کر دیتی ہیں۔ ڈائجسٹ کو پڑھنے والے بہت سے قارئین پہلے سے ہی ان حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔ کم سے کم ڈائجسٹ میں تو انہیں امید ملے..... ان کا دل ہلکا ہلکا ہو.....“

مجھے یہ بات بہت اچھی لگی اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی میں قارئین کو امید چاہیے۔ وہ کہانی تھی ”میں بنت جیل“ جسے بعد میں اسٹیل نے شائع کر دیا تھا۔ ایسے ہی ایک بار اسٹیل نے کہا کہ ”دیکھو اگر کسی بیماری پر لکھتے ہیں تو بہت احتیاط سے لکھتے ہیں۔ تاکہ کوئی بیمار پڑھے تو اسے ازجری ملے، نہ کہ مایوسی۔“ وہ اپنی بیماری سے فائدہ کرے، دل چھوٹا نہ کرے۔“

وقت کے ساتھ ساتھ میں نے ریڈرز کو سمجھنا شروع کر دیا۔ میں نے جانا کہ ڈورگاؤں میں ایک عزیزی (عورت) رہتی ہے، اس کی ساری روشنی اور ہوا ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ وہ اس کی باتیں سنتی ہے، وہ اس سے باتیں کرتی ہے۔ یہ اس کے دل کی تسلی ہے۔ اس کے دکھوں کی ڈھارس ہے۔

اور بہت دور..... دور..... پہاڑوں پر ایک

لوکی رہتی ہے، اس کی ساری پرواز ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ یہ اگر اسے کچھ خواب دیتا ہے، تو کوشش اور جدوجہد کی نصیحتیں بھی کرتا ہے۔

یہ ڈائجسٹ..... یہ ان سب خواتین کی سہلی ہے..... ان کی امید، ان کا یقین، ان کی تعلیم ہے.....

اور تب میں نے جانا کہ یہ تو بہت بڑا پلیٹ فارم ہے۔ اتنا بڑا پلیٹ فارم کہ میں بیک وقت لاکھوں لوگوں سے مخاطب ہو سکتی ہوں۔ ان تک اپنی بات پہنچا سکتی ہوں۔ انہیں تسلی، امید یا پھر یقین دے سکتی ہوں۔ انہیں اپنے ساتھ پرواز پر لے جا سکتی ہوں۔ دیسا کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ، میں انہیں ہزاروں سال پیچھے کا سفر کروا سکتی ہوں۔ اونٹ بان کی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ، میں انہیں صحرا کی راتیں دکھا سکتی ہوں۔

یہ وہ لمحہ تھا..... جس لمحے میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ”تخلیق اور مخلوق“ دونوں اگر ایک ہو جائیں..... تو پھر کمال ہوتا ہے..... اسٹیل کہتی ہیں کہ یہ میرا ٹیلنٹ تھا جو میں رائٹر بنی۔

(میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ میرا تم میں خدا داد صلاحیت ہے۔ اسٹیل)

میرا یہ ماننا ہے کہ میں نے ٹیلنٹ سے بھرے ہوئے لوگوں کو خوار ہوتے ہوئے دیکھا ہے کیونکہ انہیں پلیٹ فارم نہیں مل سکا۔ میں نے تاریخی کتابوں میں ہیرن کو خاک ہوتے ہوئے پڑھا ہے کیونکہ ان کے پاس راہنما نہیں تھا۔ جالس نہیں تھا۔

ہر انسان ”ہیرن“ ہے کیونکہ وہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی قابلیت رکھتا ہے لیکن ہر ”ہیرن“ کو اسٹیل کہاں میسر ہے؟

تو میں اسے اس اولین اسٹیج کا..... خواتین ڈائجسٹ کی موجودگی کا شکر یہ کیسے نہ ادا کروں۔ اس نے پورا اسٹیج میرے حوالے کر دیا۔ پردے اٹھا دیے..... اور اپنی داد اور تالیاں میرے لیے تیار

کر لیں..... قارئین کی محبت پر انہیں اپنے دل کے قریب کیسے نہ رکھوں۔ یہ خواتین ڈائجسٹ ہی ہے جس نے میرے پرندوں کو اپنے آسمان پر پرواز کی اجازت دی۔ یہ اس کے قارئین ہی ہیں جنہوں نے میرے گھوڑوں، اونٹوں، سانپوں، پرسوار ہو کر، جنگلوں، صحراؤں، زمانوں کا سفر میرے ساتھ ساتھ کیا۔

امر جہ، دینا، دیسا، عزیزہ، امیر اور بھاء بھولو کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بورشے کے جگنو خواتین ڈائجسٹ کے آزاد جنگل میں جھللائے تو قارئین نے بھی انہیں اپنی ہتھیلیوں میں رکھا۔

آپ سب نے کہانیوں کی ہر صنف کو قبول کیا، میرا حوصلہ بلند کیا۔ انہیں عزیز رکھا۔ میں دنیا میں کہیں بھی، زندگی میں کتنی بھی ترقی کر رہی ہوں یہ بھی نہیں بھولوں گی۔ کہ میرا اولین اسٹیج ”خواتین ڈائجسٹ“ ہے۔ جو مجھے عزیز ہے اور جس کا ایک ایک قاری میرا ”عزیزی“۔

مجھ سے پوچھا گیا کہ میں آئندہ اپنے آپ کو کہاں دیکھتی ہوں تو میں کہہ نہیں سکی لیکن میں نے سوچا کہ.....

ہر دل میں تھوڑا سا.....

کئی جانے والی ہزاروں داستانوں میں سے

ایک داستان سا.....

سب مسافر ہیں اور سب کا ایک سفر ہے..... تو

ہر سفر میں ایک ہم راہی سا.....

ایک دوست..... ایک عزیز..... ایک جگنو.....

ایک خواب سا.....

مجھے آپ کے ساتھ، آپ کی زندگی میں موجود رہنا ہے۔ کتابوں کے ریک میں نہیں۔ آپ کی تعریف میں نہیں..... آپ کی محبت میں..... یہ میرا لالچ، میری خواہش، میرا خواب نہیں..... یہ میری دعا ہے بس..... آپ سب جو مجھ سے محبت کرتے ہیں..... یہ اس محبت کا جواب ہے بس.....



# طرحِ سحر

دن کی روشنی اور دھوپ پہ لکا لکا ہی کالی گھٹا  
آ کر حملہ آور ہوئی تھی اور اپنے ہمراہ مٹی اور مٹی کی  
مہک لیے ٹھنڈی ہوا لائی تھی۔ گردوغبار کا طوفان بے  
قابو ہوا اور پھر چلتی گھٹا، بجلی بہت زور سے کڑکی تھی اور  
اس کے ساتھ ہی آسمان نے جیسے اپنے سارے  
دروازے کھول دیے تھے۔  
پانی کی ایک بھاری اور گہری چادر آسمان سے  
زمین تک پھیل گئی۔ بے تحاشا بارش لگاتار بوندیں،

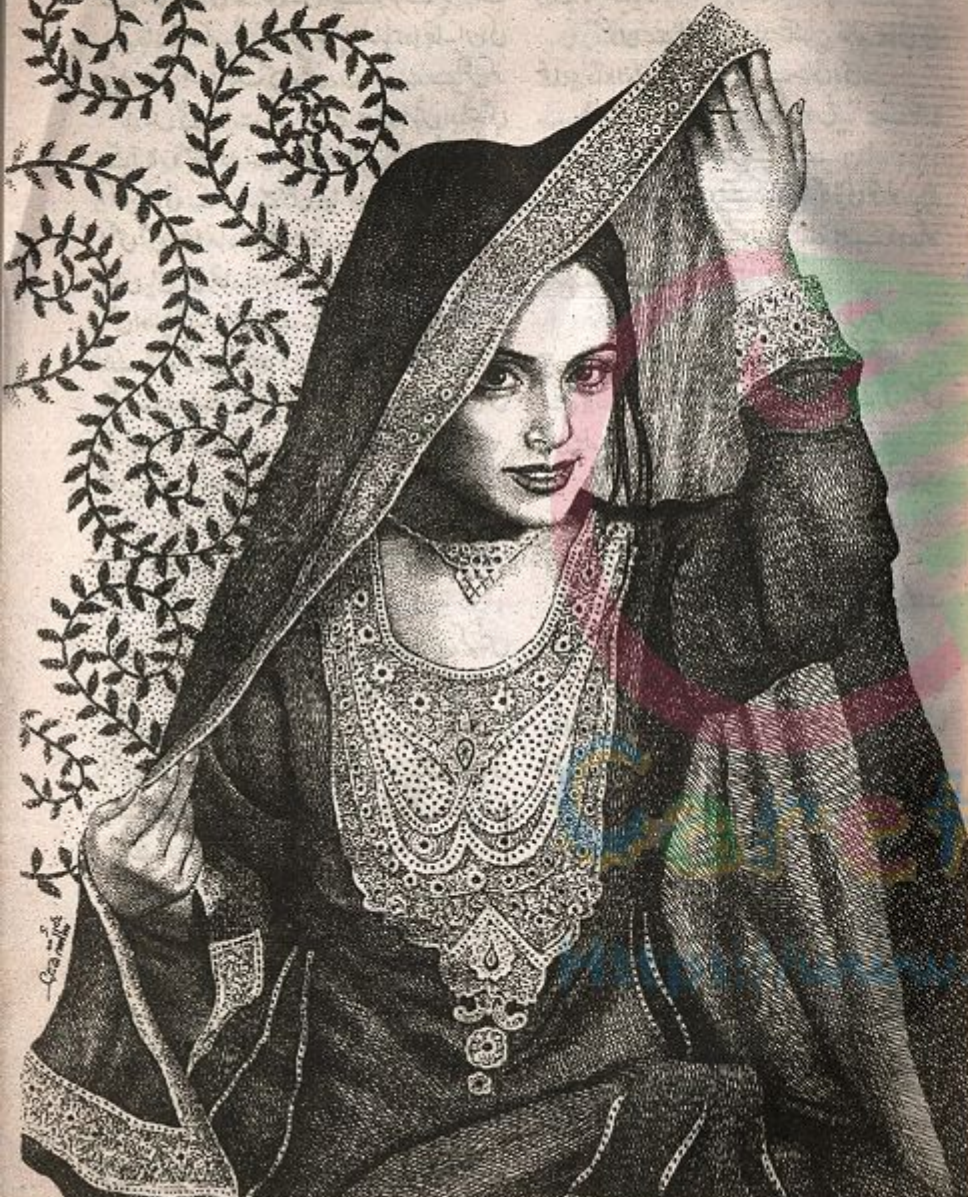
مسلست تہی ہوئی چادر کے اس پار دیکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔  
کھڑکی سے اپنا ہاتھ باہر نکال کر اس نے ہتھیلی  
آسمان کی طرف کی۔ تراشہ برستی بوندوں نے بل بھر  
میں ہتھیلی کو بھگو ڈالا۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی کھڑی برستی  
بارش اور پھٹتی پھٹتی کودتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کا  
ہاتھ پہلے ٹھنڈا ہوا، پھر رخ اور پھر دھیرے دھیرے پورا  
بازو دن ہونے لگا۔

کل رخ نے ہاتھ اندر کھینچا، گیلی ہتھیلی اور کلائی  
سے پانی کے قطرے ٹپک کر فرش گیلیا کرنے لگے  
تھے۔ تویہ سے ہاتھ پوچھ کر وہ پینگ پر بیٹھ گئی۔ اسی  
پینگ پر جس پہ اس کی ماں نے آخری سانس لی  
تھی۔ کتنی ہی دیر چار پانی کے کھر درے بان پر  
انگلیاں پھیرتی رہی پھر اپنے تھکے ہارے وجود کو لے  
کر لیٹ گئی۔

سر کے نیچے ایک پتلا سا تکیہ تھا، جو کافی تھا۔ بستر  
اور چادر کے ٹکف کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی،  
آنکھیں کھولے وہ پلب کی پہلی ملجی روشنی میں چھت کی  
کڑیاں دیکھتی رہی، کتنی رہی۔ باہر ہونے والی چھاجوں  
برستی برسات کی آواز، بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی  
کرک سنٹی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور آج  
رات نیند بڑی دیر اور مشکل سے آئی تھی کہ آج اس گھر  
میں اس کی آخری رات تھی۔

☆☆☆

صبح مؤذن نے ابھی اللہ اکبر ہی کہا تھا کہ اس کی  
جڑی ہوئی پلبیں یک دم ہی ایک دوسرے سے الگ  
ہوئی تھیں حالانکہ وہ رات گئے تک جاگنے کے بعد





بشکل ہی سوئی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے جی بھر کے نیند پوری کر لی ہو۔ آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وضو کر کے نماز پڑھ کے اس نے تلاوت شروع کی اور بہت دیر تک کرتی رہی۔ باہر پرندوں نے بھی رب العالمین کی حمد و ثناء میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے آسمان سربراٹھایا ہوا تھا۔ ان کی چوہا بڑی بلند آہنگ تھی۔ گل رخ کمرے سے نکل کر صحن میں گئی۔ رات گئے تک تیز برستی بارش اور آندھی کے آثار و سبب صحن میں ہر جگہ نمایاں تھے۔ بیش تر پانی اگرچہ پانی کے ذریعے نکل گیا تھا مگر کہیں کہیں پانی ابھی بھی کھڑا تھا۔ جہاں جہاں سے فرش اکھڑا ہوا تھا وہاں پانی جمع تھا۔ امروہ کے درخت سے گرے پتے مٹی اور پانی میں لت پت تھے۔ فضا میں تھوڑی سی خشکی کے ساتھ مٹی کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ امروہ کے اکلوتے درخت کے پاس آکر اس نے ٹہنیوں کی طرف نگاہ کی، جہاں پانی کے قطرے شاخوں اور پتوں پر لٹکے ہوئے تھے۔

ابا باہر نکلے تھے۔  
”جی۔“  
”چلنے کی تیاری کریں پھر؟ ناشتہ وہیں کر لیں گے اسٹیشن پر۔ گاڑی تو ویسے نو بجے کی ہے مگر رات بارش کی وجہ سے راستے خراب ہوں گے۔ نہ جانے اسٹیشن تک پہنچنے میں کتنا وقت لگ جائے۔“ ان کی بات معقول تھی۔ سمجھ میں آنے والی، گل رخ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”میں اپنا سامان لے لوں اور چائیاں خالہ کو دے دوں۔“ گل رخ دھیرے سے بولتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

سامان تھا ہی کیا ساتھ لے جانے کے لیے؟ دو چار جوڑی کپڑے اور ایک دو اور ضروری اشیاء اور کچھ قیمتی یادیں۔ اپنا چھوٹا سا سفری تھیلا اس نے رات میں ہی تیار کر لیا تھا۔ شاہر کے منہ پڑ پڑہ کر لگا کر

”بڑے ابا! چلیے۔“ مین گیٹ پر تالا لگا کر وہ مڑی۔  
”ایک منٹ ٹھہریے، میں ذرا یہ چابی خالہ جان کو دے دوں۔“ گل رخ نے آگے بڑھ کر اگلا دروازہ کھٹکھٹایا۔  
”کون ہے؟“ تیسری دستک پر خالہ بھائی کی خوابیدہ آواز اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔  
”خالہ بھائی! میں ہوں گل رخ۔“ جب تک اس نے بتایا وہ دروازہ کھول چکے تھے۔  
”ارے تم اس وقت کہاں؟ گاڑی تو نو بجے ہے نا۔“ اپنی خوابیدہ آنکھوں کو مٹلتے ہوئے وہ کچھ گڑبڑا سے گئے تھے۔

”راستہ خراب ہوگا، اس لیے جلدی نکل رہے ہیں۔ آپ یہ چابی رکھ لیں اور..... سب کو میرا سلام کہنے گا۔“ گل رخ کی آواز بھاری ہونے لگی، حلق میں گولہ سا لٹک رہا تھا۔  
”نہیں نہیں..... ایسے کیسے نہار منہ، خالی پیٹ جارہی ہو۔ اندر آؤ۔ بڑے ابا! آپ بھی اندر آ جائیں۔“

خالہ بھائی نے سر باہر نکال کر انہیں بھی دعوت دی پھر گل رخ سے مخاطب ہوئے۔  
”بڑے ابا کو لے کر بیٹھک میں بیٹھو، میں اماں کو اور سائرہ کو اٹھاتا ہوں۔“ اسے حکم دے کر وہ واپس مڑ گئے تھے۔  
”رہنے دیں خالہ بھائی! سب کی نیند خراب ہوگی پھر میں رات کو لیٹی ہی سب سے۔“  
”فضول باتیں مت کرو۔“ بولتے ہوئے وہ اندر چلے گئے اور ذرا دیر میں ہی خالہ اور سائرہ بھابھی منہ پر پانی کے چھپکے مار کر اس کے پاس چلی آئیں۔  
”تم آرام سے بیٹھو، میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔ کر کے جانا۔“ سائرہ بھابھی نے اپنے مخصوص تیز تیز لہجے میں کہا اور اس کا جواب سنے بغیر واپس مڑ گئیں۔  
”بیٹھ جائیے بھائی صاحب! ناشتہ کر کے جائیے گا۔“ خالہ اسٹیشن چھوڑ آئے گا آپ دونوں کو۔ اللہ

بخشنے مرحومہ کو بہن بنایا ہوا تھا، گل تو میری بیٹی ہے۔ ایسے بھوکے پیٹ تو جانے نہیں دوں گی۔“  
خالہ کے لہجے میں سچائی، سادگی اور خلوص تھا۔ بڑے ابا متاثر ہوئے اور خاموش ہو گئے۔ باورچی خانے سے کھڑ پٹری کی آوازیں آرہی تھیں، ذرا دیر میں ہی فضا میں اثرے اور پراٹھے تلنے کی خوشبو پھیل گئی۔ کچھ دیر میں بیٹھک کی میز پر خالہ بھائی نے ناشتہ جن دیا۔ پراٹھے اور ہری مرچ، پیاز کے آلیٹ، اس کے بعد گرم گرم خوشبودار چائے۔ ناشتہ سادہ اور مختصر تھا مگر اس میں گھر کے کینوں کا خلوص اور محبت شامل تھی۔

گل کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا نہ ہی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر میزبانوں کا دل رکھنے کو اس نے دو چار لقمے کھا لیے۔  
”خالہ بھائی! گھر میں تھوڑا بہت سامان ہے، اگر آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیجیے گا ورنہ کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا۔“ چائے پینے کے دوران گل نے انہیں مخاطب کیا۔  
”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
جانتے وقت خالہ اور بھابھی نے گلے لگا کر آئندہ کے اچھے وقت اور خوشیوں کی دعا کیں دیں۔  
خالہ بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
”یہ رکھ لو، ضرورت ہو تو خرچ کر لیتا۔“ خالہ نے چلتے چلتے اس کی منی میں کچھ نوٹ دبائے۔ وہ انکار کرتی رہی، مگر اس کی سن کون رہا تھا۔

خالہ بھائی نے اپنی اسکوٹر پر باری باری دونوں کو اسٹیشن چھوڑ دیا تھا۔ پندرہ منٹ کا راستہ تھا، آدھ گھنٹے بعد وہ بڑے ابا کے ساتھ اسٹیشن پر کھڑی تھی۔  
چھوٹے سے شہر کا چھوٹا سا اسٹیشن، بھی ذرا خاموش اور سویا سویا سا تھا۔ پلیٹ فارم پر چند مسافر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ سامنے چائے والے کا اسٹال تھا، جہاں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک کتا لیٹا ہوا آرام فرما رہا تھا۔ ٹرین آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، گل رخ کی بندھنی سچ رہی تھی، اس

چھوٹے سے شہر کا چھوٹا سا اسٹیشن، بھی ذرا خاموش اور سویا سویا سا تھا۔ پلیٹ فارم پر چند مسافر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ سامنے چائے والے کا اسٹال تھا، جہاں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک کتا لیٹا ہوا آرام فرما رہا تھا۔ ٹرین آنے میں ابھی کچھ وقت تھا، گل رخ کی بندھنی سچ رہی تھی، اس

نے منی کھولی۔  
ہزار ہزار کے دونوٹ تھے۔ خالہ جان کی محبت پر گل رخ کا دل بھر آیا۔ وہ کوئی گئے رشتے دار تو نہ تھے، پڑوسی تھے اور مالک مکان۔ مگر بہت پر خلوص انسان اور انسانیت سے محبت کرنے والے۔  
گل رخ کی امی جب آخری دو ماہ بالکل ہی بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں، انہوں نے ان دو ماہ کا کرایہ بھی نہیں لیا تھا۔

”ایسے ہی اچھے لوگوں کی نیکیاں اس دنیا میں جگہ جگہ ہنسی اور خوشی بن کر پھیلی ہوئی ہیں۔“ گل رخ نے وہ نوٹ اپنے پرس میں رکھتے ہوئے سوچا۔

دور سے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی پھر وہ خود آتی دکھائی دی۔ پلیٹ فارم پر لینے اور بیٹھے چند مسافر جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے کھڑے ہو گئے، بڑے ابا بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی گل رخ نے بھی اپنا تھیلا اور پرس سنبھال لیا۔ ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔

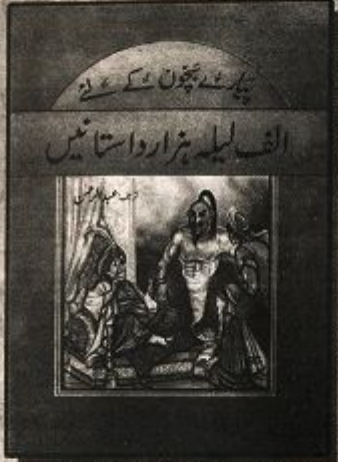
جیسے ہی وہ سیٹوں پر بیٹھے، رواں لگی کی سیٹی بج گئی۔ گل رخ کا دل بھر آیا تھا مگر ضبط کر گئی۔ ٹرین نے تھوڑی دیر بعد ہی رفتار پکڑ لی تھی، وہ اپنی پوری رفتار سے آگے کی طرف دوڑ رہی تھی اور گل رخ بھی آگے کے یارے میں، اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔  
ماضی کے بارے میں سوچنے کے لیے تھا ہی کیا، ایک مصوم، بے فکر سا بچپن۔ جب وہ باپ کی اگلی پکڑ کر جھولا جھولنے، آکس کریم کھانے باہر جاتی اور گھر میں ماں سے لاڈ اٹھواتی کرتی تھی۔ لڑکپن کی شروعات، الھڑپن سے ہوئی مگر بہت جلد یہ الھڑپن اور لا پر وانی، خاموشی اور اداسی میں بدل گئی۔

ناز خیرے اٹھانے والا باپ دنیا میں نہ رہا تھا اور جوانی کی آمد ہوئی تو اندلیٹوں اور اداسی کے بادل اور بھی گہرے ہو گئے کہ ایک مختصر بیماری کے بعد ماں بھی دنیا سے رخصت ہوئی۔ ماں باپ سے وابستہ اور رشتے دنیا میں موجود تھے، تین خالائیں، دو ماموں، ایک پھوپھی اور چار تایا چچا۔ ماشاء اللہ تنہیال،



# الکلیہ

## شعرا و داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر  
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں  
جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ جشری منگوائیں  
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں  
فی کتاب 1200/- روپے  
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے  
آج ہی - 950/- روپے  
جی آڈر سال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سفر ہوتا نہیں ہے ورنہ میں بھی آ جاتی۔" انہوں نے  
رک سے لپٹے میں کہہ کر دوبارہ چھری اٹھالی۔

گل رخ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ  
خاموشی سے سر جھکائے تخت اور اس پر پڑی اشیاء کو  
گھورتی رہی۔

"تم ہاتھ منہ دھو کر آرام کرو، تھک گئی ہوگی۔"  
بڑے ابا تو لیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اندر آئے۔  
"روئی! اندر لے جا، بہن کو۔" انہوں نے اپنی  
بیٹی کو مخاطب کیا۔

نو عمری لڑکی تھی، بالکل ماں کی دوسری کاپی۔  
بہت گوری، فربہ بدن اور آنکھوں پر چشمہ۔ غور سے  
گل رخ کو دیکھ رہی تھی۔ باپ کی ہدایت سن کر وہ  
جھٹ سے کھڑی ہوئی اور گل رخ سے مخاطب ہوئی۔  
"آؤ۔"

وہ اپنا تھیلا اٹھائے کھڑی ہو گئی اور اس کے  
پچھے پچھے چل دی۔

"لاؤ، یہ مجھے دے دو۔ میں الماری میں رکھ  
دیتی ہوں۔" روی نے اس کے ہاتھ میں پکڑے  
تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ گل رخ نے دونوں تھیلے  
اس کی طرف بڑھا دیے۔

روی الماری کھول کر تھیلے رکھنے لگی، پھر رک گئی۔  
"یہ بھی رکھ دوں؟" وہ خالد بھائی کی دی ہوئی  
کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

"یہ تم رکھ لو۔" گل نے اس کی آنکھوں میں  
جھانکنا بچوں کا ساندیدہ پن دیکھ لیا تھا۔

"ساری؟"  
"ہاں۔" گل بہت دنوں بعد بے ساختہ مسکرائی تھی۔  
آج اس گھر میں اس کی پہلی رات تھی۔ کسی جگہ  
آخری اور پہلی رات کتنی عجیب اور معنی تیز ہوتی ہے۔  
کبھی دکھ کی ردا میں لپٹی ہوئی، کبھی خوشی کے پیراہن  
میں ملبوس، مگر گل رخ کے لیے یہ آج کی رات بے  
تاثر، بے معنی سی رات تھی۔ نہ خوشیوں بھری، نہ غم  
انگیز۔ آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرتی رہی  
مگر نیند کل کی طرح آنکھوں سے غائب تھی۔

"بڑے ابا! آپ کچھ کھائیں گے؟" گل رخ  
نے وہ تھیلا ان کے آگے کیا۔  
"بسکٹ دے دو۔"

گل رخ نے بسکٹ اور جوس کا پیکٹ انہیں  
نکال کر دیا۔ اپنے لیے ایک چپس کا پیکٹ نکالا اور  
کھول کر کھانے لگی۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی  
کہ اس نے آخری بار اپنے پسندیدہ چپس کب کھائے  
تھے، شاید تین ماہ یا چار ماہ پہلے۔ اس نے چپس کا تیرا  
نکلا مزہ میں ڈالا تھا، جانے کیا کچھ یاد آیا کہ وہ حلق  
میں اٹکنے لگا۔ اس نے بے دلی سے پیکٹ واپس تھیلے  
میں ڈال دیا اور پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

سفر بہت زیادہ طویل تو نہیں تھا، چند گھنٹے لگے تھے  
لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے صدیاں  
بیت گئی ہوں۔ کینٹ اسٹیشن پر اتار کر بڑے ابا نے ایک رکشہ  
پکڑا اور تھوڑی دیر میں اردو بازار کے عقب میں واقع ایک  
بلڈنگ کے سامنے انہوں نے رکشہ رکوا دیا۔

عمارت بہت زیادہ پرانی نہیں تھی، رنگ و روغن  
میں لپی پٹی اچھی حالت میں تھی۔ تیسری منزل پر  
سیڑھیاں چڑھ کر پہنچے اور ایک دروازے پر دستک دی  
اندر سے کسی نے دروازہ کھولا۔

"آؤ بیٹا۔ اندر آ جاؤ۔" اندر گھستے ہوئے  
انہوں نے متذبذب کھڑی گل رخ کو اندر آنے کا  
اشارہ کیا۔ یہ ایک کشادہ لاؤنج تھا، جس کے ایک  
کونے میں ایک تخت پڑا تھا اور دوسرے کونے میں  
چھوٹا سا گر صاف ستھرا اور سائیکس سا چن تھا۔

تخت پر ایک فربہ اور گوری چٹی خاتون براجمان  
تھیں، ان کے آگے گہری ہری سبزی کا ڈھیر لگا ہوا  
تھا۔ انہوں نے ایک نظر شوہر پر ڈالی جو اندر کمرے  
میں چلے گئے تھے۔ گل رخ کے سلام کا جواب دے کر  
انہوں نے چھری ٹرے میں رکھ دی، ناک کی پھینک  
پر اپنا چشمہ درست کیا پھر گل رخ سے مخاطب ہوئیں۔  
"ادھر آ جاؤ۔" گل رخ تخت کے ایک کونے پر  
نک گئی۔

"تمہاری ماں کا سن کر انوس ہوا، مجھ سے لمبا

دو خیال دونوں کے رشتوں سے بھرا ہوا تھا مگر والدین  
سے محروم تھیں۔ بھانجی کے لیے کسی کے دل میں  
منجائش نہ تھی، نہ گھر میں جگہ۔ سوائے تایا ابو کے، جنہیں  
بڑے ابا کہا جاتا تھا اور یہ منجائش بھی فقط وہ اکیلے ہی  
اپنے دل اور گھر میں نکال پائے تھے۔

ان کی بیوی نے اس کی مخالفت کی تھی اور بیٹیاں  
بھی ان کی ہم نوا تھیں۔ بڑا بیٹا شادی کے بعد الگ  
ہو گیا تھا، چھوٹا بیٹا تھا جس کے لیے اندر باہر کے  
بکھیرے اور بہنوں کی ذمہ داریاں بہت تھیں۔  
بولانے کے لیے بھی اور بوکھلانے کے لیے بھی، سو  
اس نے قہقہے میں اس نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ گل  
رخ ان سب باتوں سے لاعلم تھی اور کبھی کبھی بے خبری  
بڑی اچھی نعمت ہوتی ہے۔

نیم تو جی سے وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی،  
کہیں ریٹیل میدان، ٹیلے، گھر، آبادی، کہیں ہرے  
بھرے کھیت، اس کی آنکھوں کے سامنے سے مناظر  
گزر رہے تھے اور ماضی بننے کے لیے ایک گزرا لہ  
اور گزرا منظر ہی کافی ہے۔ وہ ہر گزرتے لمحے اور چھپے  
رہ جاتے مناظر کو ماضی بناتا دیکھ رہی تھی۔ اب تک کی  
زندگی اور والدین کے ساتھ گزرا وقت بھی ماضی بن  
گیا تھا اور حال اور مستقبل؟ نہ جانے وقت کا کون سا  
رنگ کس انداز میں سامنے آئے۔

سوچوں میں گھرا دماغ بھی شاید بہت تھک گیا  
تھا، بے زار ہو گیا تھا، اب ہی اس کی توجہ سیٹ پر رکھے  
شاہر کی طرف مبذول ہوئی، جو چلتے وقت خالد بھائی  
نے اسے تھمایا تھا۔

"یہ رکھ لو، سفر میں کام آئیں گے۔"  
اب وہ پھر ہوری تھی۔ دھوپ تیز ہو چلی تھی مگر  
اچھی لگ رہی تھی۔ رات ہونے والی موسلا دھار بارش  
نے پہلے سے خوش گوار موسم میں ذرا ذرا خشکی سی گھول  
دی تھی۔ دھوپ کی حدت کو خود پر محسوس کرتے ہوئے  
اس نے خالد بھائی کا دیا ہوا تھیلا کھولا۔ اس میں جوس  
کے ڈبے بسکٹ اور چپس کے پیکٹس اور پانی کی دو  
بوتلیاں تھیں۔



رومی اس سے ذرا فاصلے پر سو رہی تھی اور اس کے برابر میں نوشی گہری نیند میں تھی۔ گل رخ نے ایک نظر دونوں بہنوں کو دیکھا، ان کی گہری نیند پر رشک کیا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ بالائی میں کھلتا تھا، گل رخ آ کر وہاں کھڑی ہو گئی۔ روشنیوں کے شہر میں جگہ جگہ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ انہیں بلا ارادہ دیکھ گئی۔ اندھیرے اور روشنی کے استرجاع کا غریب پروردہ شہر ایک ماں کی طرح ہر آنے والے کو اپنی آغوش میں سمیٹنے والا، گہری سیاہ رات میں یہ شہر ہیرے کی طرح دکھ رہا تھا۔

”ارے میں کہتی ہوں، جاگ رہے ہو یا سو گئے۔“ نیم اندھیرے اور گہری سرگوشی میں ایک پاٹ دار آواز گونجی۔

”جاگ رہا ہوں، سو بھی گیا ہوتا تو یہ صور اسرافیل سن کر جاگ ہی جاتا۔“ یقیناً یہ بڑے ابا تھے جو طوطیہ لہجے میں بیوی سے مخاطب تھے۔

”یہ جو نیا بچال بڑے ٹھنڈے سے اٹھالائے ہو، اس کا کرو گے کیا؟“

”جو اپنی بیٹیوں کا کروں گا۔“

”دو گے پیادہ اتنی مشکلوں سے کہے ہیں، ابھی تک قرضہ نہیں اتر۔“ دو لڑکیاں اور بیٹے کو بھی ہیں، بیٹا بھی ہے۔ اپنے بچے ہی نہیں سنبھل رہے اس جوان جیسا لڑکی کو کیسے ٹھکانے لگاؤ گے؟“ بڑی امی تو بلبلایا ہی اٹھی تھیں۔

”اللہ مالک ہے۔“ بڑے ابارات کے اس پہر زیادہ بحث کے موڈ میں نہ تھے۔

”تو پھر ایک یتیم خانہ کھول لو گھر میں، جتنے بھی یتیم مسکین ملیں سب کو لا لاکر گھر میں جمع کرلو۔ اپنے بیوی بچے جائیں بھاڑ میں۔“ شوہر کے اطمینان اور سکون پر یتیم صاحبہ تو جمل کر خاک ہو گئیں۔

”سوئے دو گے یا کمرے سے باہر چلا جاؤں؟“

”ہاں، خود تو آرام سے بھٹکا کے سوئیں گے، ہماری نیندیں اڑا کر رکھ دیں۔“ وہ کچھ دیر تک بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

اگلی صبح اس گھر میں وہی شور شرابا اور ہنگامہ ہو رہا تھا جو انیشا کی شادی کے بعد سے معمول بن گیا تھا۔ انیشا کی شادی کو فقط چار ماہ ہوئے تھے، شادی سے پہلے اس نے گھر کے کاموں کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ناشتے کی۔

صبح اٹھ کر باری باری سب کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ ابا اور بھائی کام پر چلے جاتے، رومی اور نوشی بالترتیب اسکول اور کانچ پچر وہ اپنا اور ماں کا ناشتہ بنا کر ان کی ساتھ ناشتہ کرتی تھی۔ اس کی شادی کے بعد گھر کے باقی کام تو ستم پشتم ہوئی جاتے تھے مگر ناشتے کے وقت بڑی ہڑ بولنگ اور شور شرابے کا منظر ہوتا تھا۔

نوشی اپنی بڑی بہن کی طرح ذمہ دار بھی نہ سلیقہ مند، بڑی حد تک کام چوراہے کی حد تک پھوہڑ۔ اس کا یہی احسان بہت تھا کہ وہ صبح اٹھ کر چائے بنادی تھی، اب اس چائے کے ساتھ تو س کھائیں یا پاپے، یا کچھ اور..... یہ کھانے والوں کا درد دہرے۔

وہ چائے بنا کر فلاسک میں نکال کر رکھتی اور واپس بستر میں۔ صبح کے وقت اسے نیند بہت آتی تھی، انٹر کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کانچ بھی کون سا روزانہ جاتی تھی، دس گیارہ بجے اٹھنے کی عادت تھی۔ بہن کی شادی کے بعد اب مارے باندھے اٹھنا پڑ رہا تھا۔ ابا، اماں، بھائی، رومی، سب بڑبڑاتے، اسے بائیں سناتے، وہ بھی جواب دے کر کمرے میں یہ جاوہ جا۔

آج بھی یہی ہنگامہ چلتا تھا۔ گل رخ کی آنکھ کھل گئی تھی، اس شور شرابے سے۔ وہ دم سادھے کٹی

لاؤنچ سے آئی آواز سن رہی تھی۔

”بھلی مانس! ابھی تو ہفتے میں ایک آدھ دن پڑھا بھی بنا دیا کر۔“ چائے پاپے کھا کر کام پر جاتا ہوں تو ایک گھنٹے بعد ہی بھوک لگنے لگتی ہے۔“ بڑے ابا بیبی سے مخاطب تھے۔

”مجھے بھی پڑھا بنا دینا۔ تو س اور پاپے کھا کھا کر میرا تو پیٹ خراب ہو جاتا ہے، پھر بھوک بھی جلدی لگتی ہے۔“ اشعر نے بھی دہائی دی۔

”مجھ سے نہیں بنے صبح پراٹھے۔“ نوشی تنک کر بولی۔

”تو کوئی نوکر آئے گا ناشتہ بنانے کے لیے؟“

ای کو بھی غصہ آ گیا۔

”رکھ لیں کوئی نوکر یا نوکرانی پراٹھے تھوپنے کے لیے۔“ نوشی کی زبان بھی بس.....

”اری سرال جا کر کیا کرے گی مہارانی؟ وہاں تو سارے کام کرنے پڑیں گے۔“

”بہو بنا کر لے جائیں گے یا نوکرانی؟“ نوشی بڑبڑاتے ہوئے اندر آ گئی۔

”آپنی امیرا ناشتہ تو بنا دو۔“ رومی یونی فارم میں لمبوس اپنے بال باندھ رہی تھی۔

”اب نہیں کیا من و سلوی چاہیے؟“ نوشی اس پر ہی جھڑھوئی۔

”اٹھ اٹھ دو، ہاف فرائی۔“ رومی نے جلدی سے فرمائش کی۔

”زردی ٹوٹ جاتی ہے مجھ سے، جیسا بنے گا چپ کر کے کھا لیتا۔“ خڑے نہ دکھانا۔“ نوشی اپنی بہن کو تنبیہ کرتی ہوئی کچن کی طرف چلی۔

”پراٹھا بنا دے باپ کو۔“ ڈبل روٹی کھا کھا کر قبض رہنے لگا ہے۔“ امی نے التجائی کھئی تھی سے تو وہ بھی قابو میں نہیں آتی تھی۔

”آنا گندھا ہوا نہیں ہے۔“ نوشی کے پاس بہانوں کی کمی نہیں تھی۔

”پراٹھے کو چھوڑ، رات کی روٹی ہے تو سینک دے، مجھے دیر ہو جائے گی جلدی کر۔“ اما جھلا کر بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ نوشی نے انہیں رات کی روٹی تل کر دی۔ رومی کے لیے اٹھ اٹھایا، اشعر کو ناشتہ دیا اور پھر غراب سے کمرے میں اندر۔

گل رخ تھوڑے دھوکے لاؤنچ میں آ گئی تھی، نظر تو سب کی پڑی اس پر مگر مخاطب بڑے ابا نے ہی کیا۔

”آؤ بیٹی، دیکھو میں تو کام پر جا رہا ہوں تمہیں ناشتے میں جو کھانا ہو بنا لیتا۔“ فریق میں اٹھ بے مکھن، ڈبل روٹی سب ہیں۔ پاپے اور بسکٹ بھی رکھے

ہیں۔ اپنا گھر سمجھ کر رہنا، تکلف نہ کرنا اور کسی کے آسرے پر بھی نہ رہنا کہ کوئی مہمان سمجھ کر خاطر کر دے گا۔“

بولتے ہوئے ان کے لہجے میں ذرا طنز آ گیا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اشعر نے ایک نظر اپنے گھر آنے والے اس نئے مہمان پر ڈالی اور پھر ناشتے میں مگن ہو گیا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد نوشی تو بدستور اپنے کمرے میں چادر تان کر سو چکی تھی۔ لاؤنچ پورا بکھرا ہوا تھا، ناشتے کے برتن جوں کے توں پڑے تھے۔ بڑی امی تخت پر لیٹی ہائے کر رہی تھیں، ان کے گھٹنے بڑی حد تک جواب دے گئے تھے۔ ناشتہ کر کے دوائی کھائیں تو ذرا اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں۔ یہاں تو دس، گیارہ بجے سے پہلے ناشتے کے آثار ہی نہ تھے۔

گل رخ ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ رہی تھی، جب انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”بی بی! زحمت نہ ہو تو ایک پیالہ چائے دے دو مجھے اور کوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا اور کڑا۔“ میں اپنی دوائی تو کھاؤں۔“

”جی اچھا۔“ گل رخ نے چائے پیالی، اپنا اور ان کا چائے گالگ ٹرے میں رکھا اور تو س پر مکھن لگا کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

ناشتہ کر کے اس نے برتن دھو کر کچن صاف کر دیا۔ لاؤنچ کا بکھراوا بھی سمیٹ دیا اور ساتھ ساتھ بڑی امی کے سوالوں کے جوابات بھی دیتی رہی۔

”تم دونوں ماں بیٹی بالکل ہی اکیلی رہتی تھیں؟“

”جی۔“

”ننھیال سے کوئی آتا تھا ملنے؟“

”بڑے ماموں آتے تھے۔ ایک دھ بار خالہ بھی آتی تھیں۔“

”گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟“

”امی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ شام میں بچوں کو ٹیوشن اور قرآن شریف۔“

”گزارا ہو جاتا تھا؟“

ہیں۔ اپنا گھر سمجھ کر رہنا، تکلف نہ کرنا اور کسی کے آسرے پر بھی نہ رہنا کہ کوئی مہمان سمجھ کر خاطر کر دے گا۔“

بولتے ہوئے ان کے لہجے میں ذرا طنز آ گیا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اشعر نے ایک نظر اپنے گھر آنے والے اس نئے مہمان پر ڈالی اور پھر ناشتے میں مگن ہو گیا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد نوشی تو بدستور اپنے کمرے میں چادر تان کر سو چکی تھی۔ لاؤنچ پورا بکھرا ہوا تھا، ناشتے کے برتن جوں کے توں پڑے تھے۔ بڑی امی تخت پر لیٹی ہائے کر رہی تھیں، ان کے گھٹنے بڑی حد تک جواب دے گئے تھے۔ ناشتہ کر کے دوائی کھائیں تو ذرا اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں۔ یہاں تو دس، گیارہ بجے سے پہلے ناشتے کے آثار ہی نہ تھے۔

گل رخ ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ رہی تھی، جب انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”بی بی! زحمت نہ ہو تو ایک پیالہ چائے دے دو مجھے اور کوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا اور کڑا۔“ میں اپنی دوائی تو کھاؤں۔“

”جی اچھا۔“ گل رخ نے چائے پیالی، اپنا اور ان کا چائے گالگ ٹرے میں رکھا اور تو س پر مکھن لگا کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

ناشتہ کر کے اس نے برتن دھو کر کچن صاف کر دیا۔ لاؤنچ کا بکھراوا بھی سمیٹ دیا اور ساتھ ساتھ بڑی امی کے سوالوں کے جوابات بھی دیتی رہی۔

”تم دونوں ماں بیٹی بالکل ہی اکیلی رہتی تھیں؟“

”جی۔“

”ننھیال سے کوئی آتا تھا ملنے؟“

”بڑے ماموں آتے تھے۔ ایک دھ بار خالہ بھی آتی تھیں۔“

”گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟“

”امی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ شام میں بچوں کو ٹیوشن اور قرآن شریف۔“

”گزارا ہو جاتا تھا؟“



”جی۔“

”ہاں گزراے کا کیا ہے۔ خرچے اور ضروریات کم کر لو تو گزارا ہو ہی جاتا ہے۔“ انہوں نے خود کلاہی کی تھی۔ دوا کی کھا کر وہ کمرے میں گئیں اور کچھ کھڑ پڑ کرنے لگیں۔

”سلانی دلائی آئی ہے؟“

”زیادہ نہیں آئی۔“

”سیدھی سیدھی سلانی تو کر لیتی ہو؟“

”جی، کر لیتی ہوں۔“

”اچھا تو ذرا اس چادر کے کنارے موڑ دو۔“

انہوں نے ایک خوش رنگ بڑی سی چادر اس کے حوالے کی۔ سلانی مشین وہیں ایک طرف رکھی تھی، ایک بڑے سے ڈبے میں دھاسے کی ریلیں بھی تھیں۔ دھاکہ مشین میں لگا کر وہ چادر کے کنارے موڑنے لگی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں یہ ہوا کہ ذرا مشکل کے ساتھ ہی سہی مگر وہ اس گھر میں ایڈجسٹ ہونے لگی تھی اور اس ایڈجسٹ کے لیے اسے بڑی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

وہ صبح اٹھ کر سب کے لیے ناشتہ بناتی۔ دن میں بھی گھر کے بیشتر کام نشانی اور اس درمیان میں بڑی امی کی ہدایت کے مطابق سلانی بھی کر لیتی۔ اسی بیچ میں گاہے بگاہے انیشیا اور پلو بھی آجاتیں، دونوں کا رویہ گل رخ کے ساتھ نہ تو کسی کی طرح روکھا پھیکا تھا نہ کہ کام اور بوقت ضرورت اسے مسکرا کر مخاطب کر لیتیں ورنہ گول ہو جاتیں۔

آنے کو تو چچا بھی چچی کے ساتھ آئے تھے، ریکی لہجے میں تعزیت کر کے اسے پانچ سو روپے دے گئے تھے۔ پھوپھو بھی آئی تھیں، چوم چاٹ کر دو سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھتی تھیں۔

ہر ہفتے بڑے ابا کے بڑے بیٹے عامر بھائی بھی اپنے والدین سے ملنے آتے تھے اور ملنے کیا آتے تھے بس اسے دکھڑے رونے آتے تھے۔ شادی کو

دس سال ہو گئے تھے، ابھی تک بے اولاد تھے۔ بیوی کو خدا جانے کون کون سے امراض لگے ہوئے تھے۔ آئے دن کبھی کوئی تکلیف، کبھی کہیں درد، درجنوں ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹرز کہتے تھے، ٹیسٹ کلیئر ہیں، اس وقت بھی وہ بیٹھے ہوئے امی کے سامنے اپنے دکھڑے رو رہے تھے۔

”نہ بچے ہوتے ہیں، نہ صحت ٹھیک رہتی ہے اس کی۔ میری تو لائف بتاؤ ہو کر رہ گئی ہے۔ عثمان کی شادی میرے ساتھ ہوئی تھی، اس کے چاروں بچے اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑا بیٹا تو کلاس فور میں گیا ہے، فرسٹ آیا تھا۔ عثمان مٹھالی لے کر آیا تھا۔“ عثمان ان کا سالہا تھا۔

”تیری بیوی کو کوئی بیماری نہیں ہے بس سستی، کابلی اور تازخے کی بیماری ہے۔ کام نہ کرنا پڑے، دو افراد کا کام بھی قہر بن کر ٹوٹتا ہے مہارانی پر۔ خدا غارت کرے، میرے بچے کی زندگی تباہ کر دی۔“ امی بیٹے کا رونا سن کر اور شروع ہو جاتیں اور اپنی ممتا کا ثبوت دیتیں۔

”دس سال تو گزر گئے، دس سال اور ایسے ہی گزر جائیں گے۔ اس شجر زمیں سے تو کوئی پھل ملنے والا نہیں مجھے۔“

”تجھ پر بھی عشق کا بھوت سوار تھا کہ ابی سے کروں گا، دیکھ لیا من مانی کا انجام۔“

”پچھتا رہا ہوں امی!“ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ عمر لڑکیوں کی نکلتی ہے، لڑکے تو جوان ہی رہتے ہیں۔ دفع کر اس مرن جو کی کو۔“ امی نے مشورہ دیا۔

”چھوڑنے کو تو آج ہی فیصلہ کر دوں مگر مہر کیسے ادا کروں گا؟“ عامر بے چارہ بڑی مشکل تھا۔

”اتنی بڑی ہڈی حلق میں پھنسانی، بھلا بتاؤ دو لاکھ روپے حق مہر کون رکھتا ہے؟“

”مجھ جیسے بے وقوف عاشق۔“ عامر بھائی نے چپکے سی دل میں سوچا۔

”عامر بھائی! حائے۔“ گل رخ نے ان کے

سامنے ٹپے رکھی۔

”آں.....“ وہ چونکے۔

”شکریہ۔“ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایک بھر پور نظر گل رخ پر ڈالی تھی۔

☆☆☆

چھوٹے بچا آئے تھے، کچھ دیر بیٹھے، بڑے ابا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل مددے پر آ گئے۔

”بھائی صاحب! میں چاہ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے گل رخ ہمارے گھر رہ لے۔“

”رہ تو رہی ہے یہاں۔“ بڑے ابا نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

”ہاں، ٹھیک ہے مگر ہمارا بھی تو کچھ فرض ہے۔“

”بڑے فراغ دل یاد آ رہے ہیں۔“ بڑی امی نے میز پر نظر دوں سے دیور کی طرف دیکھا۔ بغیر مطلب کے تو دونوں میاں بیوی اپنا بخار نہ دیں کہیں کو، وہ دیور، دیورانی کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ بڑے ابا نے کچھ سوچ کر ہامی بھری۔

”لے جاؤ کچھ دنوں کے لیے۔ اچھا ہے بچی اپنے سگوں سے مل لے گی۔ ذرا دل بھی بہل جائے گا۔“

”عجیب آدمی ہوتم، اچھا بھلا اتنا کام سنبھال لیتی تھی مگر کا۔ لے کے بیچ دیا وہاں۔“ رات میں وہ شوہر صاحب پر بگڑ رہی تھیں۔

”اسی لیے بھیجا ہے وہاں، یہاں تو تم نے نوکرائی بنا کر رکھ دیا بچی کو۔ وہ بھی کیا سوچتی ہو گی کہ میں اس لیے لایا تھا اسے۔“ بڑے ابا کی پیشانی پر ٹھنکین بہت ساری آگئی تھیں۔

”وہ لوگ کون سا مہارانی بنا کر رکھیں گے۔ دیکھ لینا اپنی ہی کسی غرض سے لے گئے ہوں گے۔“

بڑی امی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ گل رخ بچا جان کے ہمراہ ان کے گھر پہنچی تو سامنے چچا کی سب سے بڑی بیٹی منائل باجی اپنا منڈکا سا پیٹ لیے صوفے پر لیٹی تھیں۔ انہوں نے اور چچی نے گل رخ کا بڑا پرتیاک استقبالیہ کیا۔ اپنے پاس بٹھا کر بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں، کچھ ادھر ادھر، کچھ اپنے چنانچہ

یعنی تائی امی کی برائیاں اور کچھ گل رخ سے اس کے والدین کے متعلق سوالات۔ سمو، دتی بڑے اور گلاب جامن سے اس کی خاطر تواضع کی۔ ان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، دونوں کالج جاتی تھیں۔ شام میں اکڑی، دو بیٹے تھے۔ چھوٹا انجینئر بن رہا تھا، بڑا کچھ بھی نہیں بن رہا تھا، بس بننا تھا۔ گھر کے سب افراد کو کبھی بے وقوف، کبھی پاگل۔

پہلا دن بڑی خاطر مدارت رہی۔ خوب اچھی اچھی چیزیں کھلائی گئیں۔ اگلے روز ناشتے کے بعد ڈیوٹی پر جانے سے پہلے چچا جان نے گل رخ کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے پیار سے کہنے لگے۔

”کسی بھی قسم کی جھجک اور تکلف کے بغیر رہنا۔ ہم سب تمہارے اپنے ہی ہیں۔ بس ذرا اپنی منائل باجی کا خیال کر لینا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زائرہ اور مارہ کو تو اپنی پڑھائیوں سے فرصت نہیں ملتی، لڑکے گھر پر نکلتے نہیں ہیں۔ تمہاری وجہ سے تمہاری چچی اور منائل کا دل بھی لگا رہے گا اور تھوڑی سہولت بھی ہو جائے گی، ٹھیک ہے؟“

انہوں نے گل رخ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گل رخ اس مہینے میں سال کی ہونے والی تھی۔ اس کی عقل، شعور اور چھٹی حس عمر سے ذرا زیادہ ہی بے دار تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ اس محبت اور خلوص کے مظاہرے کے پیچھے کون سی غرض کا فرما ہے، مگر وہ بے وقوف نہیں تھی تو بے ادب بھی نہیں تھی۔ کام سے گہرائی بھی نہیں تھی۔

تایا ابا کے گھر اس احسان کی وجہ سے ذمے داریاں اپنے سر لے لی تھیں کہ وہ اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ عزت اور تحفظ کے ساتھ اس کی چھوٹی بڑی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر شکر ادا کیا تھا۔ اب چچا اور چچی کی غرض کو بھی اس نے مار جن دے دیا تھا۔ اسی حالت میں تو غیر لوگ بھی کام آجاتے ہیں، میں تو پھر بھی ان کی



اٹھ رہا تھا کہ دو سنگی بنیں گھر میں موجود ہیں۔ گل رخ نے اسے اندر سے اٹھتا سوال نظر انداز کر دیا اور زائرہ اور مائرہ کو بڑھائی کا مار جن دے دیا۔

چچا کا گھر بڑے ابو کے فلیٹ کے مقابلے میں کافی کشادہ اور بڑا تھا۔ نیچے کا پورشن انہوں نے کرائے پر دیا ہوا تھا، خود اوپر رہتے تھے۔ چار بیڈروم، بڑا سا ڈرائنگ روم، ٹی وی لاونج، اسٹور، لائڈری روم، صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے الگ الگ ماسیاں آئی تھیں۔ کھانا پکانا چچی خود ہی کرتی تھیں۔

زائرہ، مائرہ کو فرصت اور توفیق ہوتی تو کسی چھوٹے موٹے کام میں ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔ منائل کی شادی کو سال بھی نہیں ہوا تھا، اس کی سسرال کے رواج کے مطابق پہلا بچہ مکے میں ہوتا ہے لہذا نواں مہینہ گلتے ہی اسے میکے بھیج دیا گیا۔ منائل کے ساتھ فقط دو مسئلے تھے، ایک یہ کہ اسے دن یارات کے کسی بھی حصے میں کچھ بھی کھانے کا دل چاہتا اور پھر اسے وہ شے چاہیے ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ ہائی جینک اور ان ہائی جینک کے خط میں مبتلا تھی۔ پہلے پہل اس کے لیے ماسی رکھنے کی تجویز سوچی گئی مگر تیل منڈھے نہ چڑھ سکی، چوبیس گھنٹے کی ملازمہ ملنا ہی دشوار کار پھر صفائی ستھرائی کے حوالے سے منائل بی بی کوئی سمجھوتا کرنے کو تیار نہ تھیں لہذا سوچ بچار کے بعد گل رخ کو بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ماسی گھر کی صفائی کر کے جا چکی تھی۔ گل رخ ناشتے کے برتن دھو اور کچن صاف کر کے مائلوں کا رس نکال رہی تھی، جو منائل کو پیتا تھا۔ ان کی ہدایت کے مطابق ہاتھوں میں شفاف دستیانے چڑھالیے تھے۔ لاونج سے چچی کی آواز آرہی تھی۔

”ارے میرا پرس کدھر ہے۔ تم نے دیکھا منائل؟“

”ابھی تو بیٹھیں تھا۔ یہاں سے کہاں گیا؟“

”میرے قبضے میں جو جن اور منوکل ہیں وہ بتا سکتے ہیں آپ کا پرس کہاں ہے۔“

یہ شوخ و شنگ آواز اور انداز ان کے دوسرے بڑے علی کا تھا۔ جولاؤنج میں کھڑا لا پرواہی سے فٹ بال اچھا ل رہا تھا، اس خدشے سے بے نیاز کہ یہ اچھلتی کودتی فٹ بال لاونج میں موجود فائوس، سیور، آرائشی لائٹوں یا کرسٹل کی قیمتی آرائشی اشیاء پر لگ سکتی تھی اور ہاں جیسا لیس ایچ کی اہل ای ڈی بھی اس خطرے سے مستثنیٰ نہ تھی۔ مگر وہ چچی کے چیخنے چلانے سے بے نیاز بڑی مہارت سے فٹ بال اچھا لے اور کچھ کر رہا تھا۔ اس وقت جن اور منوکل کی بات سن کر چچی نے اسے گھورا۔

”تو نے پھر میرا بٹوہ اٹھایا۔ شرافت سے واپس کر دے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”میں نے اپنے منوکل سے بات کی ہے، ان پر بھی انسانوں کا اثر ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں پانچ سو روپے لے کر پھر پرست ڈھونڈ کر نہیں دیں گے۔“

”دیکھ علی! سدھر جا۔ ورنہ تیرے ابو سے شکایت کر دوں گی۔“

”علی بالکل سدھر جائے گا، جب اسے پانچ سو کا نوٹ ملے گا۔“ وہ بدستور فٹ بال اچھا لے اور پکڑنے میں مگن تھا۔

”میرے پاس کیا خزانے بھرنے ہیں، لکھ لٹ رہا ہے جو تجھے اٹھا کر پانچ سو دے دوں۔“ چچی جھنجھلا رہی تھیں مگر علی ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ گل رخ جوں کا گلاس لے کر اندر آئی تو وہ مستقل اپنے مشغل میں مصروف تھا۔

”دھیان سے علی! گلاس پر نہ لگ جائے یہ نامراد۔“ چچی چیخیں۔

”اللہ نہ کرے، نامراد کیوں ہوتی میری فٹ بال۔ ماشاء اللہ اتنے اتنے گول کرتی ہے میرے لیے۔“ علی نے اتنے پیار سے اپنی فٹ بال کو دیکھا کہ کوئی اپنی بی بی کو بھی خوب صورت محبوبہ کو بھی کیا دیکھتا

”بائی دادے، یہ ہیں وہ محترمہ ہمارے گمشدہ چچا کی نادیہ بیٹی۔“

علی نے اسے آج دیکھا تھا جب نوابوں کی طرح گیارہ بجے اٹھ کر ناشتے کے لیے نیچے آیا تھا اور آ کر اپنی امی کو پرس کے قبضے میں الجھا دیا تھا۔

”ناشتا تو دے دیں مجھے۔“ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے فرمائش کی۔

”پہلے میرا پرس لا کر دے۔“ امی نے شرط عائد کی۔

”وہ تو منوکل ہی لا کر دیں گے فیس کی ادائیگی کے بعد۔“

”اف یہ لڑکا، میں تو اس لڑکے سے سخت عاجز آگئی ہوں۔“ وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

”لڑکا خود بھی اپنے آپ سے سخت عاجز آیا ہوا ہے۔ خدا جانے کیا بنے گا اس لڑکے کا۔“

علی بالکل ان ہی کے لہجے میں بول رہا تھا۔ جوں پیتے پیتے منائل کی ہنسی نکل گئی، ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے گل رخ کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔ امی کو بھی ہنسی آگئی تھی۔

”میرا پرس لا دے، لے لیتا پانچ سو روپے۔“ فوراً ہی پرس ان کے ہاتھ میں آ گیا، وہ اسے کھولنے لگیں۔

”منوکل نے اپنی فیس پہلے ہی لے لی ہے، آپ زحمت نہ کریں اور مجھے ناشتا دے دیں۔“

”گل رخ کو بتادے، کیا کھائے گا وہ بتادے گی۔“ امی نے اپنے سر سے بلانا ٹالی۔

”سن لیا آپ نے۔ امی نے کیا کہا ہے؟ آپ کو بتا دوں میں کیا کھاؤں گا، بتا دیں گی؟“ علی اب کچن میں گل رخ کے سر پہنچ گیا۔

”جی..... بتا دوں گی۔“

”آپ اتنی بالادب اور چپ چپ کیوں ہیں؟“ علی کسی کو بھی کہاں بخشتا تھا۔

”آپ اتنے منہ بھٹ اور باتونی کیوں ہیں؟“

اب ایسی مٹی کی مادھو بھی نہیں تھی کہ جس کا دل چاہے، تاک پکڑ کر گھما دے۔

”ارے واہ۔ آپ تو بولتی بھی ہیں۔ زبان دکھائیے اپنی۔“ وہ چپک کر بولا۔

”آپ ناشتا بنائیے۔“

”آپ کو کون سا آلیٹ بنانا آتا ہے۔ اسپیشل فریج، امریکن، کورین، عربی، تھائی؟“

”مجھے صرف پاکستانی آلیٹ بنانا آتا ہے۔“

”دیری گڈ۔ ہر پاکستانی کو ایسا ہی محبت وطن ہونا چاہیے۔ پاکستانی آلیٹ بناؤ مگر پاکستان کا آلیٹ نہ بناؤ۔“ وہ ٹیلی میں دودھ ڈال کر چوبلے پر رکھ رہا تھا۔

”آپ عقل کی باتیں بھی کرتے ہیں، دیری گڈ۔“ گل رخ کی عادت اور ارادہ اختیار ہونے کا نہیں تھا مگر جانے کیوں بے ساختہ بولے چلی گئی۔

”صرف باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو وطن عزیز میں ہر کوئی کرتا ہے۔ عمل بھی تو ہونا چاہیے۔“

علی نے اگلے دودھ میں چینی پتی ڈالی اور چولہا ہلکا کیا۔

گل رخ اب خاموشی سے علی کو دیکھ رہی تھی جس نے ذرا دیر بعد چائے چھان کنگ میں نکالی اور کینٹ سے جارنگال کراس میں سے بسکٹ نکالے، ایک ٹرے میں دونوں چیزوں کو سلیقے سے رکھا۔ ٹرے اٹھا کر گل رخ کی طرف دیکھا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ اور کچن سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

چچا کے گھر کی طرح ان کا کچن بھی بڑا اور خوب صورت تھا۔ اس بڑے گھر اور بڑے سے کچن میں کام بھی خوب تھا۔

وہ صرف کچن ہی سنبھال رہی تھی، اسی میں صبح سے شام اور شام سے رات ہو جاتی تھی۔ منائل باجی کو ہر تھوڑی دیر بعد کچن سے کچھ کھانے کو کچا ہے ہوتا تھا۔

کچن میں دیر بعد کچن سے کچھ کھانے کو کچا ہے ہوتا تھا۔











”تم جاؤ بیٹا! مجھے ضرورت ہوگی تو بلا لوں گی۔“  
گل رخ انجھی انجھی لاؤنچ کی طرف آنے لگی۔

”جب تک پھوپھو گھر پر ہیں، تمہاری کام کی چھٹی ہے، عیش کرو۔“ علی برابر سے گزرتے ہوئے سرگوشی کر کے گیا تھا۔

”اف یہ جاسوس پلس نیوز رپورٹر۔ چچی نے صحیح نام رکھا ہے موصوف کا چھلاوا۔“

گل رخ لاؤنچ میں پہنچ گئی۔ جہاں کولڈ ڈرنک کا دور چل رہا تھا، پھوپھو کے دونوں چھوٹے صاحب زادے اور ان سے تھوڑی بڑی بیٹی بھی موجود تھی۔ مازہ نے ایک گلاس اٹھا کر اسے دیا۔

”پھوپھو! اپنی زندگی اینورسری کر رہی ہیں اس بار؟“ زارہ نے سوال کیا۔

وہ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی تھیں، سب کو بلاتی تھیں، اس بار ان کی سولہویں تقریب آ رہی تھی۔

”ارے کہاں۔ تمہارے پھوپھو بھانے منع کر دیا۔ کہہ رہے تھے کہ اب یہ جو ٹپکے اچھے نہیں لگتے، بچے بڑے ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے منہ بسورا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، دل جوان ہونا چاہیے۔“ منال بولی۔

”ہاں، یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔“ وہ پر جوش ہوئیں کوئی تو ہم خیال ملا۔

گل رخ وہیں بیٹھی رہی، چچی کے حکم کے مطابق پھوپھو کو کہنی دیتی رہی۔ یہ اور بات کہ کہنی سے زیادہ وہ ان کے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔

چچی نے مازہ کو اپنے ساتھ لگا کر کھانا تیار کر لیا تھا۔ چکن بریانی انہوں نے فافٹ بنائی تھی، کو فٹے بنے رکھے تھے۔ گریوی بنا کر ان کا سالن بھی تیار ہو گیا۔ ماش کی دال اور تلی ہوئی مرچیں بنائی ہوئی تھیں، چپاٹیاں بازار سے آ گئیں۔ سلاد رائیہ بھی تیار

گل رخ کو آج بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی تھی اور آج یوں ریست ملا تو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کی بات کہ منال کو اپنا کچھ کھانا چنایا نہیں آیا جس کے لیے وہ بار بار گل رخ کو دوڑاتی رہتی۔ کھانے کے بعد بیٹھے میں آکس کریم اور پھل تھے۔

”پھوپھو! آکس کریم زیادہ نہ کھائیے گا۔“ علی ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑنے کا عادی تھا۔

”کیوں بھی؟ مجھے تو آکس کریم بہت پسند ہے اور ویسے بھی ہمارے لیے تو آئی ہے۔“ پھوپھو نے چمک کر جواب دیا۔

”سمجھا کر میں نا، موٹی ہو گئیں تو پھوپھو بھادھر ادھر تاک جھانک شروع کر دیں گے۔“

”جی نہیں، میرے میاں ایسے نہیں ہیں۔“

”قربان جاؤں پھوپھو! آپ کے اس یقین اور محبت پر، مگر حقیقت کبھی کبھی بڑی تلخ، بڑی ظالم ہوتی ہے۔“ وہ یکا یک ایکٹر بن گیا۔

”کیا مطلب؟“ آکس کریم کھاتی ہوئی پھوپھو نے الجھ کر پیچھے کودیکھا۔

”مطلب یہ کہ اتنے سیدھے نہیں ہیں آپ کے مجازی خدا۔ جو یوں آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہیں۔“

”علی! خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“ چچی جان کے صبر کا پتہ نہ لبر ہو گیا۔

”ایک شوہر اپنی معصوم بیوی کو دھوکا دے رہا ہے اور آپ کہتی ہیں، میں خاموش ہو جاؤں؟“

”چچ بتا علی! کیا بات ہے تو نے کچھ دیکھا ہے کیا، پانسہ؟“ پھوپھو آکس کریم کھانا بھول گئیں اور گردن منظر سے علی کو دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھا بھی ہے، سنا بھی ہے اور شہوت بھی ہے میرے پاس۔ یہ دیکھیں۔“ وہ اب اپنی جیب سے

اسے دیکھ رہے تھے۔

پھوپھو نے سواگل اس کے ہاتھ سے لیا۔ تصویر ایک ریسٹورنٹ کی تھی، ان کے شوہر ایک خوب صورت بنی سنوری، خاتون کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔

”اے ہائے یہ تو تیرے پھوپھو ہی لگ رہے ہیں؟“ پھوپھو کی آواز صدمے سے پور تھی۔

”لگ کیا رہے ہیں۔ سو فیصد وہی ہیں۔“

”اور یہ ساتھ میں کون ہے؟“ پھوپھو کا بھولپن قابل دید تھا۔

”یہ آپ اپنے مجازی خدا سے پوچھیے۔“

”ان سے تو میں پوچھتی ہوں گھر جا کر یہ تصویر میرے موبائل میں بھیج دے گا؟“

”میں ابھی وائس ایپ کرتا ہوں۔“ علی نے پھرتی دکھائی۔

”اے ہائے، مجھ سے تو اب کچھ کھایا بھی نہیں جائے گا۔“ پھوپھو نے ایک آہ بھری اور ممکن لگا ہوں سے اپنے سامنے رکھے آکس کریم سے بھرے پیالے کو دیکھا۔

”تم کس کی باتوں میں آ رہی ہو، کھانا کھاؤ سکون ہے۔ یہ تو ایک نمبر کا ڈراما ہے باز ہے۔“ ای نے انہیں تسلی دینی چاہی مگر وہ بے چاری اداس ہو گئی تھیں۔

”نہیں بھابھی! دال میں کچھ کالا ہے تب ہی اس بار شادی کی سالگرہ بھی منانے سے انکار کر دیا۔

مازہ ڈرا کا ل کر کے مجھے کیسی تو مشکوٰۃ دے۔“

”ابھی کیوں جارہی ہیں، رات کا کھانا وانا کھا کر آرام سے جائیے گا۔“

”نہ بھی، میرے تو دل کو پیچھے لگ گئے اب کہیں سکون نہیں ملے گا۔“

”گل رخ کو لے جا رہی ہیں؟“

(اف یہ لڑکا) ای نے گھور کر پیٹھے کو دیکھا۔

”بس، ابھی تو نہیں لے جا رہی، بعد میں دیکھو گا۔“

جواب دیا۔

”چچ بتا لڑکے! یہ کیا چکر ہے؟ تیرے باوا کو بھٹک بھی بڑگی نا تو وہ جوتے لگا میں گے، ساری ایکٹنگ بھول جائے گا۔“ پھوپھو شتم شتم بچوں کو سمیٹ کر چلی گئیں اور ان کے جانے کے بعد ای کڑے تیروں کے ساتھ بیٹے سے مخاطب تھیں۔

”یہ کیا ڈراما تھا؟“

”کوئی ڈراما نہیں ہے ای! چچ کی تصویر ہے، میں نے خود دیکھا تھا اور خود ہی پہنچی تھی یہ تصویر۔“

”چچ بتاؤ بھائی! فوٹو شاپ تو نہیں کی؟“ مازہ کو بھی یقین نہیں رہا تھا۔

”نہیں بھئی۔“

”پھوپھو ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔“ منال نے خود کھائی کی۔

”کیسے؟“

”جیسا اس تصویر میں نظر آ رہا ہے۔ آخر کون ہیں یہ خاتون؟“ منال ہاتھ میں موبائل پکڑے تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ خاتون، پھوپھو کا ایک کولیگ ہیں جن کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو انہوں نے بچ پر انوائٹ کیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ اتفاق سے وہیں تھا۔ جا کر پھوپھو سے اور ان کے مہمانوں سے سلام دعا کی، سیٹھی اور دو چار تصویریں بھی لے لیں۔“

”باقی تصویریں کہاں ہیں؟“ منال کو خیال آیا۔

”یہ لو۔“ علی نے موبائل لے کر دو چار چمکیے اور اسکرین اس کے سامنے کر دی۔ چار، پانچ تصاویر میں خاتون کے شوہر صاحب بھی نمایاں نظر آ رہے تھے۔

”بے غیرت انسان، ڈرامے بازی کیوں کر رہا تھا پھوپھو کے ساتھ۔ تیرے باوا سے شکایت کر دی تا

ثلیل (پھوپھو)۔ تو نے مجھے چھوڑیں گے نہیں۔“ چچی

”چچی

”چچی



ٹرمپ کے جانشین ہوں حالانکہ وہ بے چارے تو صدر پاکستان سے بھی زیادہ بے ضرر سے تھے۔  
”کچھ نہیں ہوگا، پھوپھو اپنے میاں جانی سے تھوڑا ناراض ہوں گی اور وہ اپنی پیاری اور تھوڑی سی بے وقوف بیگم کو منانے کے لیے اپنی دینگ اینورسری منانے پر راضی ہو جائیں گے۔“ علی نے ہاتھ ہلا کر فقط کھسی اڑادی تھی، اس کے لیے تو کوئی مسئلہ، مسئلہ ہی نہیں تھا۔  
”پھوپھو کو تو ایسی فکر ہوئی فوراً ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ پھوپھو سے جواب طلبی کے لیے۔“ مارہ نے تبصرہ کیا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات پر بھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔ سوال یہ سوال کر کے اگلے بندے سے وضاحت لے لی جانی چاہیے۔ اب پھوپھو نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، بس تصویر دیکھ کر فوراً سمجھ لیا کہ یہ تصویر ایک سچ ہے۔ اس کے پیچھے بھی ایک سچائی ہے، اس حقیقت کو جاننے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔“  
”اب تم رپورٹر بن گئے تو سب کو اپنی طرح جاسوس بناؤ گے، ہر خبر کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔“ منائل بولی۔

”کیا حرج ہے یہ میڈیا ورلڈ ہے، ہر دیکھی اور سنی جانے والی چیز کی پرکھ ضروری ہے۔ آنکھیں بند کر کے، یقین کرنا بے یقینوں کا کام ہے۔“ اس کے مخاطب تو جملہ حاضرین تھے مگر نظریں فقط گل رخ پر جمی تھیں، جنہیں محسوس کر کے وہ جبر ہورہی تھی۔  
”میری تو سمجھ سے باہر ہے یہ تیری نوکری۔ نہ کوئی جانے کا نام ہے، نہ آنے کا یا تو سارا سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے، لپ ٹاپ کے آگے یا آدھی آدھی رات کو گھر میں گھستا ہے۔“ امی نے اپنے لاڈلے مگر عجیب و غریب بیٹے کو گھورا۔

”ہائیں تو فائیکو نوکری تو ہر کوئی کر رہا ہے۔ مزا تو تب ہے جب انسان اپنے کام کو عبادت سمجھے یا

تھکن کی پردا کیے بغیر۔“

”خدا خیر کرے، علی بھائی اور فلاسفی۔ خدا جانے کس کس پر برا وقت آنے والا ہے۔“ زائرہ نے بولتے ہوئے اپنے بالوں کو کچھ میں جکڑا۔ گل رخ برتن دھونے کچن میں چلی گئی، بچی کو اچانک ہی یاد آیا تھا، علی کو بل بھر نے کو دیا تھا۔  
”بل بھر دیا تھا؟“ وہ بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔  
”بالکل۔“

”ساڑھے پانچ سو بچے ہوں گے، کہاں ہیں؟“

”کیا، یہ معمولی معمولی رقموں کا حساب لیتی ہیں آپ امی حضور۔“  
”دو کلو چکن آتی ہے اس میں۔“ امی نے بتایا۔  
”دو کلو چکن، آپ کے بیٹے کے جذبات اور جیب سے بڑھ کر ہے؟“ اف کیا دور آ گیا ہے۔ پہلے زمانے کی مائیں اپنی اولاد پر واری صدے جانی تھیں اور ایک آج کل کی مائیں ہیں، پانی پانی کا حساب رکھتی ہیں۔“ علی کی ایک ننگ کا کوئی وقت تھوڑی مقرر تھا، جب دل چاہے، اس کا تھیر شروع ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

گرمی کی شدت میں کچھ کمی آ چکی تھی، بڑی پیاری ہوائیں چل پڑی تھیں۔ نہ بہت گرم نہ بالکل سرد، ایسے خوش گوار موسم میں ایک گلابی سی شام منائل نے ایک کول منٹل، اپنے جیسی خوب صورت بیٹی کو جنم دیا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر پھیل گئی، بچی اپنے خیمیاں میں بھی پہلی تھی اور دھیمیاں میں بھی۔ سسرال والے اسپتال بھی آئے پھر چھٹی کے بعد جب وہ گھر آ گئی تو شوہر صاحب ساس اور سرسرد بارہ بھی آئے، خوشی کا اظہار تو کر رہے تھے بہت، پھر بھی ساس ایک موقع پر بول ہی پڑیں۔

”چھٹی اولاد بیٹا ہو تو ذرا اچھا رہتا ہے۔ جلدی بڑا ہو کر باپ کا بازو بنتا ہے۔ اچھی تو خیر بیٹی بھی ہوتی تو اب مالا کا راجت مگر بھی آج کے اس

مہنگائی کے دور میں بیٹی ایک ہی کافی ہے۔“

اور ان کی تقریر بھی مزید جاری رہتی مگر ان کے بیٹے نے آگے بڑھ کر بچی کو گود میں اٹھالیا اور پیار کرنے لگا اور شوہر صاحب نے کھنکار کر حالات حاضرہ اور سیاست پر گفتگو شروع کر دی۔  
بچی کی پیدائش کے بعد گل رخ کا کام اور ذمہ داریوں کا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ چچی کی ہدایات کے مطابق منائل کے لیے پرہیزی ناشتہ اور کھانے بنانی اور بانی گھروالوں کے لیے وہی معمول کے مطابق پکنا۔

ویسے چچی خود بھی کبھی کبھی اس کے ساتھ لگ جاتی تھیں۔ زائرہ موڈی تھی، دل چاہتا تو سلا د وغیرہ بنا لیتی یا کبھی کبھی جانے بنا لیتی، اس سے زیادہ کی توقع اور امید رکھنا فضول تھا۔ مارہ گھر کے کاموں کے معاملے میں بڑے ابا کی بیٹی نوشی کی بہن تھی۔ بقول چچی کے، اسے تو کچن میں کھڑے ہونے کے نام سے موت آتی ہے، دونوں کے پاس اپنی پڑھائی کا بہانا موجود تھا، یہ بہانا نہ بھی ہوتا تو مفت کی ملی بے زبانی نوکرائی کے ہوتے ہوئے کون بے وقوف کام کی زحمت کرے گا؟

منائل کے لیے منٹن کا سالن چڑھا کر اس نے گھر کے لیے دال نکال کر بھگو دی۔ چچی نے دال چاول پکانے کو کہا تھا۔ رات کا لوکی گوشت بھی رکھا تھا۔ وہ آٹا نکال کر گوندھنے لگی، منائل اور چچی کی روٹی پکی تھی۔ ابھی آٹے میں پانی ملا ہی رہی تھی کہ وہ بلائے جان پھر نازل ہو گیا۔

”پھر کیا سبق سیکھا آپ نے اپنی اور اپنے والدین کی زندگی سے؟“ وہ آتے ہی بات یوں شروع کرتا تھا، جیسے بہت دیر سے اسی موضوع پر بات کر رہا ہو۔

”آپ بتائے، آپ کو کیا سبق مل رہا ہے میری اور میرے والدین کی زندگی سے؟“ گل رخ آٹا، پانی اور نمک بیکان کر کے سمیٹنے لگی۔

”بھئی کہ بندہ اگر پسند کی شادی کرے تو دولت

مند سے کرے، تاکہ اگر بعد میں اولاد کو اکیلا چھوڑ جائیں تو اسے کسی کی نوکرائی یا نوکر نہ بننا پڑے۔“ علی بڑا بد لحاظ اور ظالم بھی تھا، رخصتوں پہ نشتر چلانے میں تو اسے کمال حاصل تھا۔

گل رخ نے ایک نظر اسے دیکھا اور چپ چاپ آٹے میں مکیاں مارنے لگی۔

”اسی لیے میں نے ایک مال دار اسامی کو بھانس رکھا ہے، کل کو ہم دنیا میں نہ ہوں تو ہماری اولاد کو در بدر انہوں کی یا دوسروں کی غلامی نہ کرنی پڑے۔“

بولنے کے دوران اس نے فریق سے کچھرا، ٹماٹر، بند گوبھی، نکال کر اس نے دھو کر کاؤنٹر پر رکھیں اور ایک ایک کر کے کنگ بورڈ پر رکھ کر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

”میرے پاس ڈھیروں دولت ہوتی تو آپ کی طرح کوئی لاچی اور اپنی غرض کا شخص مل جاتا، کھانے کا سودا تو وہ بھی ہوتا۔“

گل رخ کی سادگی سے کئی بات پردہ ایک لمحے کو لا جواب ہوا تھا، اگلے ہی لمحے نیا پینتر ابدل کر میدان میں آ گیا۔

”اسے بارے میں سوچ کر کبھی احساس کمتری نہیں ہوتا؟ دکھ نہیں ہوتا؟“

گل رخ آٹا گوندھ چکی تھی، اسے ڈھک کر ایک طرف رکھا اور ہاتھ دھونے لگی، ہاتھ دھو کر اس نے دال پکینے کو رکھ دی۔

”کیا بات ہے میرا سوال برا لگ گیا کیا؟“  
”نہیں، برا تو نہیں لگا۔ دراصل ابھی تک اتنی سنجیدگی اور تفصیل سے اس بارے میں سوچا نہیں۔“  
”اچھا تو پھر تم کیا سوچتی ہو؟“ علی کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے گل رخ کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”میں.....“ گل رخ نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں یہ سوچتی ہوں کہ میرے والدین اور بہن بھائی نہیں ہیں، پھر بھی میں عزت اور تحفظ کے ساتھ



ایک چار دیواری میں ہوں۔ میرے پاس کچھ قریبی رشتے موجود ہیں، جن میں کچھ خود غرض بھی ہیں اور تھوڑی اپنائیت بھی ہے اور میری چھوٹی بڑی بہت سی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں، جن کے لیے مجھے گھر سے باہر نکل کر محنت کر کے کماتا نہیں پڑتا، میری دماغی اور جسمانی نشوونما میں کوئی عیب، کوئی کمی نہیں ہے۔ میں گمن نہیں سکتی، بیتا نہیں سکتی، مجھے اللہ نے کتنا نوازا ہے۔“

علی کنگ بورڈ اور کھرے، پیاز کو فراموش کر کے حیرت سے اسے تنک رہا تھا، جو اس کی نگاہوں سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔

”انتہا صبر شکر تمہارے اندر کہاں سے آیا؟“  
”پتا نہیں، شاید والدین سے ہی آیا ہوگا، جن کے اوپر پسند کی شادی کا لیبل لگا ہوا ہے۔“ ایک پھینکی سی مسکراہٹ گل رخ کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔  
”کیا مطلب؟“

”آپ جاسوس جمع صحافی ہیں، سراغ لگائیں برسوں پہلے جن لوگوں نے یہاں سے دور جا کر اپنی دنیا آباد کی، اس کے پیچھے کیا کہانی تھی؟“  
”چلیج دے رہی ہو مجھے؟“

”جی ہاں!“ اہلٹی ہوئی دال کے اوپر جمع جھاگ کو جیسے سے نکالتے ہوئے گل رخ نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

☆☆☆

ہواؤں نے تیور بدلنے شروع کر دیے تھے، موسم کسی بد مزاج انسان کی طرح خشک ہونے لگا تھا اور ذرا سرد مہم بھی، ہواؤں نے بھی یہی رنگ ڈھنگ اختیار کرنا شروع کر دیے تھے، زائرہ اور مائرہ دونوں نے قسم قسم کے موچر انڈرز کا استعمال زیادہ کر دیا تھا۔ مائرہ کو اپنے ریشمی بالوں کی فکر ہو چلی تھی جو سرد موسم کا آغاز ہوتے ہی اس کے سر سے یوں جھڑنے کو تیار ہو جاتے جیسے خزاں آلود پتے درخت سے.....

ایسی ہی ایک خشک اور بے کیف شام مائرہ، گل رخ کے پاس آئی تھی۔

”ذرا تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ بازار چلو گی؟ ایک دوست کا برتھ ڈے ہے گفٹ لینا ہے۔“  
”کتنی دیر لگے گی؟ رات کا کھانا پکانا ہے۔“

”بہت زیادہ بھی لگا تو ایک گھنٹہ، بس سمجھ لو، آنے جانے میں ٹائم لگے گا، گفٹ میں پچھلے ہفتے دیکھ کر آئی تھی، وہی مل گیا تو نے لوں گی ورنہ کچھ اور خرید لوں گی، مگر زیادہ وقت نہیں لگے گا، مجھے بھی آ کر اپنے ٹیٹ کی تیاری کرنی ہے۔“ گل رخ کا اندیشہ زائل کرنے کے لیے مائرہ نے پوری ایک تقریر جھاڑ دی تھی۔

”اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ گل رخ اس کی تقریر سے شاید گھبرا گئی تھی۔

”تم جب تک ساتھ منہ دھو کر چینی کرلو، میں آتی ہوں۔“ مائرہ چلی گئی، گل رخ کی تیاری میں گھنٹہ بھر نہیں لگتا تھا، خلاف توقع مائرہ بھی جلدی آ گئی۔  
”چلیں؟“

”چچی کو بتادیا؟“  
”ہاں۔ میں نے بتادیا ہے۔“

”جلدی چلو۔“ مائرہ ادھر ادھر توجہ دینے کے بجائے تیز تیز چل رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے بھی تھکات رہی تھی۔

میں روڈ پر آ کر وہ کھڑی ہو گئیں۔ مائرہ اپنے فون میں لگی ہوئی تھی۔

”کیسے جانیں گے؟“ گل رخ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”فون کر دیا ہے میں نے، ابھی آ جائے گی سواری۔“

ماائرہ نے تسلی دی، گل رخ نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ کہیں بھی آنے جانے میں آن لائن سواری کی سہولت سے فائدہ اٹھاتی تھیں، وہ مطمئن ہو گئی۔  
بشکل پانچ منٹ بعد سفید کار آ کر رکی۔  
”چلو بیٹھو۔“ مائرہ نے گل رخ کو ٹھوک دیا۔

”پہلے کفرم تو کر لو، وہی ہے، جسے بلایا تھا۔“

گل رخ نہ جانے کیوں کنفیوز ہو رہی تھی۔

”ہاں بھئی۔ وہی ہے، تم بیٹھو تو۔“ مائرہ نے کچھل سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اسنے میں ڈرائیور نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

”ماائرہ! تم تو بیٹھو۔“ وہ کھڑکی سے سر نکالے مائرہ سے مخاطب تھا۔ گل رخ، اس کے یوں بے تکلف انداز پر ششدر رہ گئی۔

”کون ہے یہ؟ اور تمہیں کیسے جانتا ہے؟“ وہ یکدم پیچھے ہٹی۔

”افوہ۔“ مائرہ جھنجھلائی۔ ”تم بیٹھو تو سہی، میں ساری بات بتاتی ہوں۔“

”نہیں، مجھے نہیں بیٹھنا۔“ گل رخ بدک گئی تھی۔

”کیا یار؟ تم سمجھا کر نہیں لاتی تھیں اسے؟ تم تو کہہ رہی تھیں سب کچھ سیٹ ہے، کوئی پرابلم نہیں ہے۔“ کار میں بیٹھے اس ہینڈ سم نو جوان کا لہجہ درشت تھا، مائرہ، گل رخ کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ریان! پلیز تم تو خاموش ہو جاؤ، وہ بیٹھ رہی ہے نا..... گل تم.....!“ مائرہ اس سے کچھ کہنے جا رہی تھی، مگر گل رخ نے بات کاٹ دی۔

”مجھے تمہارے ایسے ارادوں کا علم ہوتا تو کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔“ اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

”تم اکیلی نہیں آ سکتی تھیں۔ کیا ضرورت تھی، کسی کو ساتھ لانے کی؟“ ریان مائرہ پر برس رہا تھا۔  
جواباً مائرہ کو کبھی غصہ آ گیا۔

”بتایا تو تھا، امی ایک بار تمہارے ساتھ دیکھ چکی ہیں مجھے، اکیلی گھر سے نہیں نکل سکتی، اسی لیے اس ڈفر کو ساتھ لائی تھی، مجھے کیا پتا تھا یہ اتنی اکر دکھائے گی۔“ مائرہ اسے جواب دے کر گل رخ کے پیچھے بھاگی، جو تیز تیز قدموں سے جا رہی تھی۔

”پلیز گل! بس آج کی بات ہے، ایک بار کی، میرے ساتھ چلو، ورنہ ریان مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔“

”فصلوں باتیں مت کرو مائرہ!“ گل رخ نے

خنتی سے جواب دیا۔

”تم خود کو کتنی کیا ہو؟“ مائرہ کو طیش آ گیا۔  
”میں، خود کو کچھ نہیں سمجھتی، تم ذفر بھتی ہو مجھے، مگر اس ذفر کو یہ معلوم ہے کہ اپنی اور اپنی عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے اور اس ذفر کو یہ سکھایا گیا ہے کہ والدین کو دھوکا دے کر نہ عزت ملتی ہے نہ محبت۔“ گل رخ کی آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔

”اور کس نے سکھائی تمہیں یہ بات، جنہوں نے خود گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی؟“ مائرہ نے بے حد کم ظرفی بلکہ یکنکلی کا مظاہرہ کیا تھا۔

گل رخ کا ضبط اٹھنا کو بچ گیا، اپنی بھینکتی ہوئی آنکھیں اس نے خنتی سے پوچھ ڈالیں اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ یہ خیال کیسے بغیر کہ مائرہ اس کے ساتھ ہے یا کتنی پیچھے، اس وقت وہ نہ مائرہ کی شکل دیکھنا چاہتی تھی نہ اس کی آواز سننا چاہتی تھی۔

☆☆☆

رات میں بڑے ابا اسے لینے آئے تھے ساتھ میں روئی بھی آئی تھی۔

”ہاں بھئی، مزید رکنے کا دل ہے یا گھر چلو گی؟“ وہ گل رخ سے مخاطب ہوئے۔

”گھر چلوں گی۔“ گل رخ ان کے کہنے سے پہلے ہی، ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔

”تمہارا چیلنج یاد ہے، آدمی اسٹوری معلوم ہو گئی ہے۔“ چلتے سے پہلے ہی اس کے پاس آیا۔

”باقی آدمی بھی معلوم کر لیں پھر چیلنج پورا ہوگا۔“

☆☆☆

وہ بتایا ابا کے گھر واپس آ گئی تھی، سب کچھ دیا ہی تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی اور فقط دو ماہ میں بھلا کیا تبدیلی آئی تھی۔ تانی امی نے پر جوش تھیں نہ سرد مہر، نوشی مطمئن تھی کہ اس کے سر سے کچن کے کاموں کا بوجھ ہٹ جائے گا۔ روئی بے غرض تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کی شہیلی واپس آ گئی۔ اشعر معمول کے مطابق بے نیاز اور لا پرواہ۔



تائی امی اور نوشی نے رکی حال احوال پوچھا، روی دیر تک اس سے اپنے اسکول، سہیلیوں، ٹیٹ، پڑھائی اور اپنی پسند کے ڈراموں کی باتیں کرتی رہی۔ رات گئے تک نوشی سو بائیں میں لگی ہوئی تھی، بڑے ابا، تائی امی اور اشعر بھائی سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ روی بھی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ ایک گل رخ بھی جس کی آنکھوں میں نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

خاموشی سے اٹھ کر وہ لنگی میں جا کھڑی ہوئی۔ دور تک پھیلے ہوئے شہر میں کہیں روشنیاں نظر آرہی تھیں، کہیں تاریکی، جیسے کسی کی زندگی، جس پر بھی احوال کا راج ہوتا ہے۔ بھی اندھیروں کا، وہ کتنی ہی دیر کھڑی اندھیروں اور اجالوں کا سگم دیکھتی رہی۔ رات گئے تک بھی سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ہوا میں خنکی گھٹنے ملنے لگی تھی۔ ٹھنڈ زیادہ محسوس ہوئی تو وہ آ کر لیٹ گئی۔

ماہرہ کی حرکت نے، اس کے لیے روئے اور لفظوں نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ ماہرہ کی اخلاقیات کی ٹھیکے دار نہیں تھی مگر اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے غیر اخلاقی معاملات میں گل رخ کا استعمال کرے اور پھر اس کا اہانت آمیز رویہ، توہین آمیز الفاظ، جن کی گونج ابھی تک گل رخ کے کانوں میں باقی تھی۔

اس نے آج تک خود کو اتنا بے بس اور حقیر محسوس نہیں کیا تھا، اس وقت بھی نہیں جب اس کی امی کا انتقال ہوا تھا اور وہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ مگر آج اس کے احساسات کچھ مختلف تھے، آج اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی میں بہت سی کمیوں کا، اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انسان کے لیے اس کا اپنا گھر اور اس گھر میں اس سے بڑے رشتے کتنے ضروری، کتنے اہم ہوتے ہیں۔ جن سے وابستہ فرد، خود کو اس معاشرے میں مضبوط سمجھتا ہے۔

ماہرہ نے اسے بے مول کر دیا تھا۔ اپنے

خیالوں میں الجھے الجھے اسے کب نیند آئی، پتا نہ چلا۔

☆☆☆

دونوں بہنوں میں محبت تھی، ان کے شوہروں کے درمیان عداوت، محل کرکشی جھگڑا نہ ہوا تھا، بظاہر میل ملاپ تھا مگر اندر ہی اندر بغض، کینہ اور عناد کی آگ تھی جو دونوں کے دلوں میں جل رہی تھی، اس کی بنیاد کب پڑی، کچھ پتا نہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے جب بنیاد پڑ گئی تو اس پر بغض و عناد کی عمارت بلند سے بلند ہوتی رہی۔

حفیظہ بیگم کی شدید علالت نے انہیں بستر مرگ پر پہنچا دیا تھا۔ ان کی آخری خواہش کے آگے شوہر اور بہنوں خاموش ہو گئے۔ زہیر اور عدیلہ کا نکاح کر دیا گیا۔ رخصتی چھ ماہ بعد تھی، ابھی تو عدیلہ کا انتر بھی مکمل نہیں ہوا تھا اور زہیر کی کہیں نوکری نہ تھی، مگر یہ چھ ماہ گزرنے سے پہلے ہی حفیظہ بیگم وفات پا گئیں۔

عدیلہ کا انتر اور پھر بی۔ اے بھی مکمل ہو گیا۔ زہیر کو نوکری بھی ملے ایک عرصہ ہو گیا مگر عدیلہ کی رخصتی عمل میں نہیں آ رہی تھی، اس کے والد کا اصرار تھا۔ زہیر کے ابا آ کر خود رخصتی کے لیے التجا کریں، ادھر زہیر کے والد کی ضد تھی کہ ہم زلف ان کے گھر آ کر بارات لانے کا کہیں، اسی ضد بحث میں وقت گزر رہا تھا مگر محل کوئی نہیں نکل رہا تھا۔

ان ہی گزرتے دنوں میں ایک روز عدیلہ کی والدہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئیں، عدیلہ سے ایک سال چھوٹے بھائی ناظم کا غم و غصہ سے برا حال تھا اگر مناسب وقت پر رخصتی ہو جاتی تو ایک ماں اپنی بیٹی کی خوشیاں اور بستا ہوا گھر دیکھ سکتی مگر دو اتنا پرستوں کی بے کار ضد، زندوں کو مردہ اور زندہ درگور ہوتے ہوئے دیکھ کر قہقہہ لگا رہی تھی۔

زہیر کے ابا نے اس کی دوسری شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔ عدیلہ کے والد بھی کچھ کم نہ تھے انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنی مرضی سے خلع کا نوٹس بھیج دیا۔ عدیلہ کا کٹھ کی پتی بنی اپنے نصیب کو تماشا بننے دیکھ رہی تھی۔ مگر کچھ ہونے کی تاب بھی نہ بجالا،

بلا خر ناظم نے ہی فیصلہ کن قدم اٹھایا۔ اس قدم کو اٹھانے کی ہمت اور شہزیر نے دی تھی جو اپنے بڑوں کے اس تماشے سے تنگ آ چکا تھا۔

نکاح کے دو بولوں سے پہلے ہی من موہنی عدیلہ نے اس کے دل میں گھر بنایا ہوا تھا، نکاح کے بعد دل کا یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا اب اس لڑکی اور اس رشتے کو کھونا سوہان روح تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی اور ناظم سے بات کی۔ نوکری کے سلسلے میں سکھرتا رہا، رہنے کے لیے ایک چھوٹے سے مکان کا بندوبست وہ کر آیا تھا۔

ناظم نے ایک صبح جیسے ہی اپنی اپنی ڈیوٹی پہ گئے، زہیر اور بڑے بھائی جان کو بلا کر اپنے گھر سے اپنی بڑی بہن کو رخصت کر دیا۔ جب بڑے اپنی انا اور ضد کے پہاڑ تلے اولاد کو پینے پر تل جائیں تو چھوٹوں کو بڑا بن کر فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ باپ کی ضد اور انا کو اچھی طرح جانتا تھا اور زہیر کے والد یعنی اپنے خالو کی خصلت سے بھی خوب واقف تھا۔

اپنے چھوٹے بھائی، بہن کی محبت اور دعاؤں تلے رخصتی کو عدیلہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر دوسری صورت پھر یہی ہوتی کہ اس کے لیے خلع لے لی جاتی، جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھی، وہ رخصت ہو کر زہیر کے سنگ چلی تو گئی مگر یہ خوشی بڑی عجیب تھی، ادا کی اور آنسوؤں کے ہالے میں لیٹی ہوئی۔

ندامت کا بوجھ اٹھائی ہوئی خوشی اس کے ہمراہ عمر بھر رہی۔ دونوں کو زندگی بھر اجازت نہیں ملی کہ اپنے اپنے باپ کے گھر آ سکیں یا اپنے بہن بھائیوں سے مل سکیں۔ انتقال پر ان کے جنازوں پہ آئے اور پھر واپس چلے گئے، زندگی وہاں سیٹ ہو چکی تھی، یہاں خاندان بھر میں ان کے متعلق یہی بات پھیلی ہوئی تھی کہ دونوں نے اپنی مرضی سے اپنا گھر خود ہی بسالیا۔

ناظم نے، زہیر کے بڑے بھائی نے وضاحتیں پیش کیں مگر ان لوگوں کے صفائیاں پیش کرنے کو اقربا پروری کہا اور سمجھا گیا۔ اس معاشرے میں منفی باتوں

کو پھیلنے میں نہ دقت ہوتی ہے نہ وقت لگتا ہے۔

☆☆☆

موٹر سائیکل وہ ہمیشہ کی طرح احتیاط کے ساتھ چلا کر گھر واپس جا رہے تھے، گھر سے پچھلے اسٹاپ پر جہاں گیراج اور دکانوں کے آگے بنے تھروں پہ چھترے چھانٹ اور ہر کام سے فارغ آوارہ گردوں کا جمع سالگرہ ہوتا تھا۔ ان ہی میں ایک راجا کا گروپ تھا جس میں چڑی موالی زیادہ تھے، عثمان صاحب کے لیے یہ منظر روز کا معمول تھا مگر آج وہ بری طرح چونکے تھے، ان چڑی موالیوں کے بیچ میں ان کا بیٹا بیٹھا سوئے لگا رہا تھا، انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔

دل تو چاہا کہ موٹر سائیکل روک کر دو چھتر لگا کر اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں مگر ایک تو وہ قدم میں ان سے کتنی دواغ لٹکا ہوا ہی تھا، پھر ایک خیال اور آیا تھا، وہ خاموشی سے موٹر سائیکل آگے بڑھا گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سیدھے بیٹے کے کمرے میں گئے، بیگم بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئیں۔

”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ بیگم نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

ڈیوٹی سے آتے ہی اپنے روزمرہ معمول پر عمل کرنے کے بجائے وہ سیدھے بیٹے کے کمرے میں پہنچے تھے جبکہ بیٹا گھر میں بھی نہیں تھا۔

عثمان صاحب، بیگم کی تشویش اور سوالوں کا جواب دینے کے بجائے الماری اور دراز میں کھول کھول کر دیکھ رہے تھے اور ایک دراز میں جو کچھ رکھا ہوا تھا، وہ دیکھ کر انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”کیا بات ہے؟“ بیگم حیران پریشان آگے آئیں۔

”لو، دیکھو اپنے بیٹے کے کروت، نشر کرنے لگے ہیں صاحبزادے۔“ عثمان صیاحب یک دم ہی بھٹ پڑے تھے۔ دراز کھلی ہوئی تھی جس میں سے انجشن، سگریٹ کی ڈیا اور پلاسٹک کی ٹیلی میں بھجورا



بھورا سانسوف تھا۔ بیگم صاحبہ نے آگے بڑھ کر دیکھا اور اپنا دل تمام لیا۔

”یہ کیسے ہو گیا؟“ ان کی کیفیت اور حالت بھی شوہر سے مختلف نہ تھی۔

”تم بتاؤ؟“ تم تو کہہ رہی تھیں کہ کسی اخبار میں جاب کرنے لگا ہے۔ مجھے تو اس کی نوکری پہلے بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ کیسی نوکری ہے، جب دل چاہا گھر پر، جب موڈ ہوا، گھر سے غائب، اب دیکھ لو، یہ ہے اس آوارہ کی مصروفیت اور نوکری، اس وقت بھی راجا کے اڈے یہ دیکھ کر آ رہا ہوں اسے، چری، موالی یا دوستوں کے ساتھ بیٹھا دھوئیں میں جانے کون سے غم اڑا رہا ہے۔“ عثمان صاحب کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”اف خدایا، ہم سے کیا کوتاہی ہو گئی اس کی تربیت میں، جو وہ اس راستے پہ چل نکلا۔“ بیگم عثمان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”تب ہی وہ مجھ سے آئے دن رقصیں ایشھتار پتا تھا، میں نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے پیسے لیتا ہے، پتا ہوتا تو ایک چوٹی بھی نہیں دیتی۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بول رہی تھیں، اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

دونوں میاں بیوی نے دروازے کی سمت دیکھا جہاں بے فکری سے بیٹی بجاتا ہوا علی ان دونوں کو وہاں دیکھ کر اک دم ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

موسم سرد اور خشک ہو گیا تھا۔ درختوں نے سونا اوڑھ لیا تھا جہاں جہاں بھی سبزہ تھا، زردی کے پیراہن میں لپوس ہو رہا تھا۔ گل رخ کا دل نہ جانے کیوں اداس ہو چلا تھا۔

باہر کا موسم اگر دل کے موسم پر اثر انداز ہوتا ہے تو آج کل کا موسم گل رخ کے اندر تک سرایت کر رہا تھا۔ کچھ بڑے ابا کے گھر کا ماحول عجیب و غریب ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بڑے ابا اور اشعر کے ڈیوٹی پہ جانے کے بعد ہر دوسرے تیسرے

روز عامر بھائی آتے اور بڑی امی کے ساتھ طویل بیٹھک کر کے جاتے، اندر کمرے میں بیٹھے دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے تھے، نوشی کو اس سب سے کیا، گھر کے کسی معاملے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس کی دنیا اس کے اسمارٹ موبائل سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔

گل رخ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی تو بڑی امی سلائی کے لیے کچھ نہ کچھ تھما دیتیں، اسے کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا مگر بس ایک عجیب پر اسرار سے حالات سے اسے وحشت سی ہو رہی تھی، عامر بھائی کی کبھی بھی معنی خیز نگاہیں اسے شدید الجھن میں مبتلا کر دیتیں اور ایک روز یہ راز گل ہی گیا جب رات گئے وہ حسب عادت بالکنی میں کھڑی دور دور تک پھیلے اس شہر کے اندر عیروں اور اجالوں کے سنگم کو دیکھ رہی تھی۔

بڑے ابا کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔ وہ اپنی بیگم سے مخاطب تھے۔

”میں نے آج بات کی تھی اشعر سے گل رخ کے لیے۔“

”کیا؟“ تائی یوں اچھلیں جیسے بچھونے کاٹ لیا ہو۔

”منع کر دیا اس نے، میں نے کہا بھی کہ یتیم بچی ہے، سہارا دے دو، ثواب کا کام ہے، مگر ماما ہی نہیں۔“ بڑے ابا کی آواز سے بے حد مایوسی جھلک رہی تھی۔

”اب جوان جہان اولاد یہ کہاں زور چلتا ہے؟“ وہ پہلے والا دور تھوڑی ہے کہ پڑا کر کسی بھی کھونٹے سے باندھ دو۔“

تائی امی چمک کر بولی تھیں، ویسے تو انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اشعر نے انکار کر دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجازی خدا کی بات سن کر چونک پڑیں۔

”عثمان کی زائرہ کے لیے کہہ رہا ہے کہ وہاں رشتہ دے دیں۔“

”پاکل ہوا ہے کیا، اماں بھی بیٹیاں بھی، سب ایک سے بڑھ کر ایک خیرے بیٹی ہیں، مشکل ہی ہے، ہاں کریں۔“ وہ صاف کوئی سے بولیں۔

”مجھے تو گل رخ کی فکر کھائے جا رہی ہے، کیا ہوگا اس بچی کا، اپنے ہوں یا پرانے، ہر کوئی پیسے کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ سب کو مال دار سرال چاہیے۔“

”ایک بات کہوں، بھڑک مت اٹھنا، ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔“ بڑی امی نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی۔

”کہہ دو تم بھی، کیا بات ہے۔“

”عامر اپنی بیوی کو چھوڑ رہا ہے۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”کیا پھر جھگڑا ہو گیا دونوں میں؟“ وہ بیزار ہو کر بولے۔ دونوں میاں بیوی کے جھگڑے اب معمول بن گئے تھے۔

”جھگڑا تو کب سے ہے، لیکن یہ بتاؤ، کب تک رہے گا، جنہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ تمہارا بیٹا اولاد کا سکھ دیکھے۔ یہ عورت تو بانجھ ہے، اس سے تو اولاد نہیں ہو گی۔“

”معاملہ کیا ہے؟“

”عامر تو طلاق دینے کو بیٹھا ہے، مہر کی رقم کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ کہہ رہا تھا ایک بار ابا سے بات کروں، پھر فیصلہ کر دوں گا۔“

”جب سارے کام خود ہی کر لیے تو اب مجھ سے کیا پوچھتا رہا ہے؟“

”میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو گل رخ کے ساتھ نکاح کر دیں گے اس کا۔“

”کیا؟“ بڑے ابا داغی بھڑک اٹھے تھے۔

”دیکھو، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ٹھنڈے دل سے میری بات سنتا اور غور کرنا۔“

”بات بھی تو کوئی ڈھنگ کی ہو۔“

”کیا برائی ہے اس میں؟ دس سال پہلے جب عامر نے شادی کی تھی تو تیس سال کا تھا، اس چنڈال نے سٹکی کرا کے اپنے قابو میں کر لیا تھا تب ہی آؤ

دیکھنا تہاؤ بیاہ کر لیا، تمہاری بھتیجی سے دس سال ہی بڑا ہوگا۔ اس سے زیادہ، زیادہ فرق کی شادیاں ہم نے دیکھی ہیں، پھر عیب کیا ہے اس میں، مختص ہے، اچھا کماتا ہے تمہارا بیٹا ہے، چھوٹے سے کرنے پر راضی ہو لڑکی کو، تو بڑے کے لیے سوچ لو۔“

”پھر بھی..... کہاں عامر، کہاں وہ.....؟“ بڑے ابا تذبذب تھے۔

”شکل صورت میں اب بھی ہزاروں میں ایک ہے میرا بیٹا، اس کو تو کوئی بھی لڑکی مل جائے گی۔ تمہیں کیا خبر، لڑکیوں کے رشتوں کے کتنے مسائل ہیں۔ لوگ بچوں والے کو بھی اپنی کنواریاں بیاہ دیتے ہیں۔ مجبوری کی وجہ سے، اب اس یتیم بچی میں کیا ہیرے لگے ہیں؟ دو چار سال یونہی گزر گئے تو عامر جیسا رشتہ بھی نہ ملے گا۔“

بڑی امی اپنی تقریر کر کے خاموش ہو کر سو گئیں مگر اس رات بڑے ابا اور گل رخ دونوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”تم ہی نمونہ لاؤ لے۔“

عثمان صاحب غصے اور کوفت کے مارے کمرے سے ہی باہر نکل گئے، سچ تو یہ تھا کہ بیٹے کی شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان کا کھلنڈرا اور شوخ و شریر بیٹا کس راستے پہ چل نکلا ہے۔

”ارے بیٹا! یہ تو نے کیا کیا؟“ امی تو اسے دیکھتے ہی کراہ اٹھی تھیں۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ اب بھی انجان بن رہا تھا۔

”تو سگریٹیں پینے لگا ہے، وہ بھی بھری ہوئی؟“ امی نے ڈائریکٹ بات کی ان کا چہرہ اور لہجہ صدمے سے چور تھا۔

”کیا ہو گیا ہے امی! کیا خواب دیکھ لیا رات



سوتے میں؟“ علی نے ایک تہقہہ لگایا اور ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”اچھا تو یہ سب کیا ہے؟“ انہوں نے کھلی دراز کی طرف اشارہ کیا، جس میں انجکشن، سگریٹ اور سفوف کے پیکٹ تھے۔

”یہ تو میرے دوست کی چیزیں ہیں، ابھی واپس کر کے آتا ہوں۔“ اس نے پھری سے ساری اشیاء سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالیں۔

”تیرے ابو نے دیکھا تھا ابھی، تو راجا کے اڈے پر ان چری موالی لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور.....“ آگے امی کی آواز رنڈھ گئی۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا اتنا ذہین، لائق فائق بٹاکس دلدل میں جا گھسا ہے، مگر علی ہمیشہ کی طرح مطمئن ہو کر انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔

”کوئی ایسی بات نہیں ہے امی! وہ تو میں وہاں سے گزر رہا تھا لڑکوں نے پکڑ کر زبردستی بٹھالیا۔ باتوں باتوں میں، یونہی شغل میں دو چار کس لگا لیے۔“ وہ بول تو رہا تھا مگر لہجہ کھوکھلا ہو چلا تھا۔

”علی! تو نے بڑا دل دکھایا ہے میرا، میں تو تیرا رشتہ لے جانے والی تھی نفقہ کے گھر۔ کسی کو بھنک بھی پڑی تو ہماری ساری عزت تیل ہو جائے گی۔“

”آپ بے فکر ہو کر جائیں رشتہ لے کر، وہ بھوری بلی اسی گھر میں آئے گی۔“

”پہلے تو وعدہ کر، آئندہ سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

”پکا وعدہ۔“ علی نے ہاتھ کھڑا کر کے عہد کیا۔

”اور اپنے لفتے دوستوں سے بھی دور رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ علی بڑی آسانی سے مان گیا تھا۔

وہ وہاں سے اٹھ تو گئیں مگر دل ہنوز پریشان تھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹے کو اپنے پلو سے باندھ کر ہر وقت اپنے ساتھ ساتھ رکھیں، نہ باہر جائے گا نہ لفتے بار دوستوں سے ملے گا جو اسی کی طرح نکلے ٹھلے سے فٹ پاتھ اور تھڑے پہ محفل جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔

عثمان صاحب روزانہ آتے جاتے خاص طور پر راجا کا اڈہ دیکھتے تھے کہ علی یہاں تو نہیں بیٹھا مگر ج تو یہ ہے کہ انہیں اور ان کی بیگم کو ابھی تک اپنے بیٹے کے گھنوں کا ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اتنے اداس، بے کیف اور اجازت شب و روز گل رخ کی زندگی میں پہلے بھی نہیں آئے تھے، صبح سے وہ مشین کی طرح اپنے کام سرانجام دے رہی تھی۔ نوشی بوقت ضرورت بات کرتی تھی، رومی کی ادھر ادھر کی باتیں ایک پھکی مسکراہٹ کے ساتھ سنی رہتی اور اپنے خیالات میں غلطیاں و چٹاں رہتی۔

”اگر میرے والدین حیات ہوتے تو شاید زندگی کچھ سہل ہوتی۔“ آج پہلی بار وہ اتنی دل گرفتہ تھی کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو بھی چاہ رہا تھا۔

”اللہ تو سب کا ہوتا ہے پگلی! تمہارا بھی ہے، ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرنے والا، اپنے بندوں کی فکر اور نگہبانی کرنے والا۔“ اس کے اندر سے آواز آئی تھی مگر دل بہت باغی ہو رہا تھا۔

لڑکیوں سے نجات کا آسان نسخہ، شادی، ان کے سارے مسائل کا حل شادی، وہ شادی چاہے کسی سے بھی ہو۔ بالکل ایک جوئے کی مانند۔ داؤ لگ گیا تو وارے نیارے ورنہ نیکی دست، تہی دامن رہ جاؤ۔

بڑی امی کی دی ہوئی ایک فیص سیٹے ہوئے اس کا دل باغی بھی ہو رہا تھا اور بھر بھر بھی آ رہا تھا۔ عامر بھائی اندر بیٹھے تھے بڑی امی کے ساتھ۔ پہلے تو دونوں سرگوشتیوں میں بات کرتے تھے، اب ان کی آواز لاؤنج میں گل رخ تک پہنچ رہی تھی۔

”اے ہاں، مان جائیں گے تیرے ابا، آدھے

تو راضی ہیں، باقی آدھے بھی ہو جائیں گے، میں نے تو جتا دیا کہ ابھی تو یہ رشتہ مل بھی رہا ہے، بعد میں یہ بھی ہاتھ سے جائے گا۔“

”ہاں اماں! آج کل اچھے لڑکے ملتے ہی کہاں ہیں۔“ بلیک ڈریسڈ پینٹ اور سفید دھاریوں والی شرٹ میں لمبوس، اپنے بالوں کو سلیقے سے جمائے، صاف رنگت والے عامر بھائی کمرے سے باہر آئے۔

”ارے بھی گل! ایک کپ چائے پلاؤ گی، اچھی سی۔“ وہ تخت پر براجمان ہو گئے، نظریں اسی پر جمی تھیں۔

”جی!“ کچھ توقف کے بعد گل رخ کی مری مری سی انگلی۔

جیسے آپ تو زندگی کا مقصد سب کی جی حضوری اور تابعداری تھی، چاہے چچا تایا کا گھر ہو یا چھپو کا۔ ہر کوئی اپنے گھر رکھنے کا خراج پوری طرح وصول کر رہا تھا۔

ماموں کے گھر گئی تھی مگر مل کر واپس آ گئی۔ وہ بے چارے خود خد فاج کا شکار ہوئے بستر پہ پڑے تھے، ان کی بیگم سخت مزاج اور بلا کی کنجوس، کسی کو ایک کپ چائے نہیں پوچھتی تھیں، یا پھر یہ ان کی معاشی مجبوری تھی مگر بہر حال اس گھر میں گل رخ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، خالہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ملک سے باہر تھیں۔ گل رخ کو پانچ ہزار روپے بھیج کر انہوں نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ چائے بنا تے ہوئے وہ اپنے خیالات میں غرق تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عامر بھائی کاؤنٹر کے قریب کھڑے اس سے مخاطب تھے۔

”کچھ نہیں۔“ گل رخ اپنا رخ موڑ کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ارے بھئی۔“ خوش رہا کرو، تم تو ہنسی مسکراتی اچھی لگتی ہو۔“ وہ بے تکلفی کی ساری حدود پار کیے جا رہے تھے۔

”آپ وہاں جا کر بیٹھیں، میں چائے لا رہی

ہوں۔“ گل رخ نے اپنا لہجہ اور چہرے کے عضلات سخت کر لیے، ایسی گلاب جاسن تو نہیں تھی کہ جس کا جی چاہے اٹھا کر منہ میں رکھ لے اور ہڑپ کر جائے۔

”چلو بھئی، جیسے تمہارا حکم، ہم تو تانی دار ہیں۔“ اس کے سخت لہجے کو نظر انداز کر کے وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ بڑی امی بھی اتنے میں وہیں آ کر بیٹھ گئیں۔

”فیص سل گئی؟“

”تھوڑی سی رہ گئی ہے۔“ چائے کا کپ عامر بھائی کے آگے رکھتی ہوئی وہ دھیرے سے بولی اور پھر جا کر مشین پہ جھک گئی۔

”ارے اماں! آپ نے کچھ سنا، علی کے بارے میں؟“ عامر کو اچانک ہی کچھ یاد آیا تھا۔

”کیا ہوا؟ نکاح کر لیا کسی سے، پیسے لے کر بھاگ گیا؟ آج کل تو ہر طرف سے ایسی ہی خبریں ملتی رہتی ہیں۔“ بڑی امی نے اندازہ لگایا۔

”نفسہ کرنے لگا ہے۔“ عامر نے چائے کی چسکی لی۔

”ہائیں، یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ وہ حیران ہوئیں۔

سلائی کرتی گل رخ نے یک دم ہی مشین روکی تھی۔ دھا کہ ٹوٹ گیا تھا۔ دھا کہ سوئی میں ڈالتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

”خیرت ہے آپ کو نہیں معلوم، پورے خاندان میں پھیل گئی ہے بات، بلکہ اپنے چری دوستوں کے ساتھ اس کی تصویریں بھی کسی نے نہیں بک بر ڈالی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھیں۔“ عامر بھائی موبائل گھول کر انہیں تصویریں دکھانے لگے۔

”آئے ہائے، اچھا بھلا لڑکا تھا، یہ کن چکروں میں پڑ گیا اور کزور کتنا ہو رہا ہے؟“ تانی امی افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔ عامر بھائی مزے سے چائے پینے میں مگن تھے اور گل رخ کو اتنی دیر ہو گئی تھی مگر سوئی میں دھا کہ ڈل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆



امی نے آتے ہی اپنا براؤڈ لیڈر بیگ صوفے پر چھک ہی دیا تھا۔ ان کا قیمتی جوڑا ان کے جسم پر اب بھی جھکا رہا تھا مگر چہرہ بالکل بچہ کر رہ گیا تھا۔  
 ”پانی پلاؤ زائرہ!“ انہوں نے بیٹی کو آواز دی مگر مشکل تھا کہ آواز اس کے کانوں تک پہنچے، کانوں میں پیئڈ فری کھسیوے نظریں موبائل اسکرین پر تھیں۔

علی ان کی آواز سن کر لاؤنج میں آ گیا تھا۔ پانی کی بوتل اور گلاس لے آیا۔  
 ”بہت نام روشن کر دیا تمہارے لاڈلے نے، ہر طرف اسی کا چرچا ہو رہا ہے۔“  
 عثمان صاحب جو بیگم کے ہمراہ واپس آئے تھے، زہر خند لہجے میں بولے، مخاطب بیگم تھیں مگر بیٹے کو سنار ہے تھے۔

”علی! تم نے تو دو کوڑی کی عزت کر کے رکھ دی ہماری۔“ امی جان تو رہا کسی ہو رہی تھیں۔  
 ”نقہ کے ماموں تمہاری تصویریں دکھا رہے تھے۔ فیس بک پر موجود ہیں تمہارے لفظی دوستوں کے ساتھ، راجا کے گروپ کے ساتھ، کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے لڑکے سے کریں گے؟“  
 ”ذلیل کر کے رکھ دیا سب میں ہمیں، ایسی اولاد سے بے اولاد ہی بھلے تھے۔“ عثمان صاحب کا غم وغصے سے برا حال تھا۔

”اچھی بھلی بات بن گئی تھی نقہ راضی تھی، ماموں کو بھی راضی کر لیتی نصیب والوں کو ملتی ہے ایسی بہو، کروڑوں کی جائیداد کی ایکلی وارث، معمولی سا تو عیب ہے بس، چہرے پہ جگہ جگہ بھورے بھورے تل ہیں۔“ (حالانکہ یہ کوئی عیب نہیں مگر جس لڑکی کو بہو کی حیثیت سے دیکھتی تھیں، اس کے لیے ان کی نگاہ بڑی تنقیدی تھی) عیب چھپ جاتے ہیں چہرے کے، کیسے کیسے خواب دیکھتے تھے میں نے۔ پہناؤ کی میں سونے کے کڑے ملنے، اس لڑکے نے سب کچھ غارت کر کے رکھ دیا۔“

امی اور ابو دونوں کا رخ اور غصے کے مارے برا

حال تھا۔ بیٹے کی شادی کے حوالے سے جو خواب دیکھے تھے سب چکنا چور ہو گئے تھے۔  
 ”میں نے تم سے تھا نا کہ ان بد معاشوں اور اداشوں میں اٹھنا بیٹھنا بند کرو۔ پھر یہ سلیم لنگڑا نہیں بلانے کیوں آیا تھا؟“ عثمان صاحب علی کی کلاس لے رہے تھے۔

”آپ ہی کی نصیحت پہ عمل کر رہا ہوں، وہاں جاتا ہی نہیں ہوں، اسی لیے وہ بلائے آیا تھا۔ چھوڑ دیا ہے سب کو۔“ علی نے ملاعت سے جواب دیا۔  
 ”اب چھوڑنے سے کیا فائدہ، کون یقین کرے گا تمہارے سدھرنے کا۔ سب جگہ بدنامی ہو گئی، ایسی ذلت کا تو میں نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔“

”ادھر سے اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔“ امی کو اب تک نقہ کے رشتے کا غم کھائے جا رہا تھا۔  
 ”اب کون دے گا اپنی لڑکی، پتا نہیں کس لنگڑے پار دوست نے تصویریں بھی آپ کو ڈر دیں، جس کو نہیں بھی پتا تھا، پتا چل گیا۔“

”اب تو میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں، یار دوستوں کو بھی اور سگریٹ بھی۔“ علی نے احتجاج کیا۔  
 ”کون یقین کرے گا، بدامچھا، بدنام برا۔“ امی نے ایک آہ بھری۔

”پہلے تو میں ہی یقین نہیں کروں گا کہ تمہارے صاحبزادے نے جو کہا ہے، وہ سچ ہے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“ ابو کی آنکھوں سے خشک و شبہات چھلک رہے تھے۔

☆☆☆

زرد پتے درختوں سے جدا ہو کر نیچے قدموں میں چرمارہے تھے، قانون قدرت اٹل ہے، جو پتے اپنی جڑوں سے کٹ جائیں، شاخوں سے علیحدہ ہو جائیں ان کے لیے پھر قدموں کے نیچے ہی جگہ بچتی ہے یا پھر تیز ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر اڑتے رہتے ہیں، نہ سفر اپنے بس میں نہ منزل کا نشان۔  
 شام کے وقت بالکٹی میں کھڑی وہ دور نظر آنے

والے ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی، شاید میری حیثیت اور اوقات بھی شاخ سے ٹوٹنے پتے سے زیادہ نہیں، کوئی ٹھکانا نہ منزل، بس اک بے سمت سفر ہے، ذہنی شام میں آسمان پہ مخو پرواز پرندوں پہ اس نے نگاہ کی جو واپس اپنے اپنے مسکن پہ لوٹ رہے تھے۔

یہ پرندے کتنے خوش نصیب ہیں، اندھیرا ہونے سے قبل اپنی پناہ گاہوں میں لوٹ آتے ہیں اور میرے لیے..... آگے اندھیرا نظر آ رہا ہے مجھے، مگر پناہ گاہ کوئی نہیں۔“

گل رخ پہ بری طرح یاسیت اور اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فضا میں دھیرے دھیرے سرخی غبار چھا رہا تھا۔ افق پہ نیلگوں آسمان پر ڈوبتے سورج کی سرخی غالب آ رہی تھی۔ یکایک وہ دکھتا ہوا تاریکی گولہ بن گیا اور ڈوبتے ہوئے چاروں اور اندھیرے کی چادر پھیلا گیا، غریبی مساجد سے اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہونے لگی۔

گل رخ مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اندر آ گئی۔ جب سارے در بند نظر آئیں تو انسان کے لیے ایک درمیشہ کھلا رہتا ہے جس پر دستک دینے والا اور مدد مانگنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ اربوں انسانوں سے بھری اس دنیا میں بھی کسی ایک انسان سے بھی کوئی امید نہیں ہوتی، کوئی چارہ ساز، غم گسار نظر نہیں آتا مگر گھپ اندھیرے میں روشنی کی، امید کی ایک کرن ہمیشہ ہوتی ہے۔

وہ ذات پاک جس نے اپنے ہر بندے کو بڑی محبت سے تخلیق کر کے اس دنیا میں بھیجا۔ وہ بندہ جب اپنی مشکلات میں اپنے خالق کو، اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ پہلے ہی اپنے بندے کے قریب ہوتا ہے۔ شہ رگ سے بھی زیادہ فریب۔

نماز پڑھ کر گل رخ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سوائے آنسوؤں کے اور کوئی التجا اپنے رب کے حضور پیش نہ کر سکی۔

☆☆☆

عثمان صاحب کی پریشانی اور فکر کی کوئی حد نہ تھی، پریشان تو ان کی بیوی بھی تھیں اور بانی گھر والے بھی، یار دوستوں کو اور سگریٹ اور نشہ چھوڑنے کے علی کے سارے وعدے ریت کی دیوار ثابت ہوئے، سارے عہد سائل پہ پڑے خاشاک کی طرح کمزور اور بے بس، جنہیں فقط ایک لہر ہی اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

علی کی حرکتیں دن بدن ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ دن بھر میلے چیلے کپڑوں میں ادھر ادھر گھومتا رہتا یا راجا کے اڈے پہ ان ہی لفظوں کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ امی تو کڑھ کڑھ کر آدمی ہو گئی تھیں، ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ منام ملنے آئی تو اس کے سامنے رو پڑیں۔

”کیا کروں اس لڑکے کا، خود کو تباہ کر رہا ہے۔ میں نے اور تمہارے ابو نے کتنا زور دیا کہ علاج کروالے ڈاکٹر سے، جہاں نفٹ کے عادی افراد کا علاج ہوتا ہے، کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، پتا نہیں کس حاسد نے میرے بیچے پہ جادو ٹوٹا کروا دیا۔ خدا غارت کرے ایسے حاسدوں کو، اپنے ہی حسد کی آگ میں جل کر مریں۔“

امی بھرتی ہوئی آواز میں نادیدہ دشمنوں کو کوسنے دیے لگیں۔

”ایک بات کہوں امی؟“ منام مل کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”آپ علی کی شادی کر دیں۔“  
 ”حالت دیکھ رہی ہو، کیا بنائی ہوئی ہے اس نے؟ کوئی کام دھندا کرتا نہیں، اچھی بھلی اخبار میں نوکری لگی تھی، وہ بھی چھوڑ دی۔ ایسے نکمے اور نشہ باز کو کون لڑکی دے گا؟“

”لڑکی ہے میری نظر میں، آپ دیکھیے گا شادی کے بعد بیوی بچوں کی ذمہ داری پڑے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

منام مل بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔ امی اس کی بات بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔



”کون لڑکی ہے نظر میں؟ پھر علی..... وہ راضی ہوگا شادی کے لیے؟“

”اسے منانا میرا کام ہے۔“ منائل جلدی سے بولی۔

”لڑکی کون ہے نظر میں؟“ ای نے سوال کیا۔ منائل نے نام بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں، پھر ایک آہ بھری۔

”پہلے والا علی ہوتا تو کبھی اس لڑکی کو بہو بنانے کا سوچتی تھی مگر اب تو.....“ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”اس لڑکے نے بڑا ہی ذلیل و خوار کر دیا ہمیں۔“

☆☆☆

بڑے ابا اور ان کی بیگم کی گفتگو مباحثے میں بدل جاتی اور وہ مباحثہ، چھوٹے موٹے جھگڑے میں، عامر نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مستحکم فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ چاہ رہا تھا کہ ابا گل رخ کے لیے ہائی بھر لیں تاکہ پرانا رشتہ ختم کر کے وہ فوراً ہی نیا رشتہ جوڑ لے۔ زائرہ کے لیے اشعر کا رشتہ نامعلوم ہو گیا تھا۔ بڑے ابا چاہ رہے تھے کہ اشعر کو گل رخ کے لیے راضی کر لیں۔

اسی بات پر ان کی اپنی بیوی سے بحث ہوتی تھی۔ شادی شدہ بیٹیاں آتی تھیں۔ گھر کے معاملات اور حالات سے واقف تھیں، انیشا بڑی حد تک سیدھے سادے مزاج اور اچھے اخلاق کی بھی، اسے دنیا کی کوئی لڑکی اپنے بھائی کے لیے پری نہ لگتی تھی۔ وہ اشعر اور گل رخ کے رشتے کی چاہی تھی، بلکہ اپنے بھائی کو چیکے چیکے کوٹیش بھی کر رہی تھی۔

دوسری بہن امی کے رعب میں تھی، ان کی ہاں میں ہاں ملائی رہتی۔ نوشی بے نیاز تھی، رومی بھی گل رخ کی حمایتی تھی مگر وہ بے چاری کس گنتی میں تھی۔ تانی امی اپنی ادھیڑ بن میں بڑی ہوتی تھیں، ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ اشعر کا رشتہ گل رخ سے نہ ہونے دیں۔ اپنے شوہر سے بھی وہ یہی بحث کرتی تھیں۔ ”بڑے والے نے اپنی من مانی کی، اپنی مرضی

سے بیوی لے آیا، اب چھوٹے کے معاملے میں تم من مانی کر رہے ہو، اپنے بیٹے کے لیے میری بھی کوئی خواہش، کوئی تمنا ہے یا نہیں؟“

”بھلی مائیں، بات سمجھتی کیوں نہیں، نیک سیرت بہو آئے گی تو ہم دونوں کا بڑھاپا سنور جائے گا۔“ بڑے ابا اپنی بیگم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر انہیں سمجھانا ایسا ہی تھا جیسے بھینس کے آگے بین بجانا اور ان ہی اگلے ہوئے ریشم جیسے دنوں میں عثمان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ بڑے ابا اور بڑی امی کے پاس آئے تھے۔

☆☆☆

وہ خاموش، بے حس و حرکت بیٹھی تھی، کسی سنگی مجسمے کی طرح ایسا مجسمہ جس کے اندر دھڑکنے والی پوری قوت اور رفتار کے ساتھ بغاوت پر آمادہ ہو کر بے بسی کچھ بھی کرنے نہ دے۔

”بنی! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں مجھے امید ہے کہ اپنا باپ سمجھ کر میرا مان رکھ لو گی۔“

وہ گل رخ کے سر پہ ہاتھ رکھے اس سے مخاطب تھے۔ جس کے خاموش وجود میں طوفان برپا تھا۔ ”میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تب بھی یہی فیصلہ کرتے؟“ گل رخ ان سے پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہ سکی، شرم اور مروت نے ہونوں پہ تالا لگا دیا تھا۔

وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی، اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتار لیا تھا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر نکاح ہو گیا تھا۔ دھستی اگلے ہفتے تھی۔

☆☆☆

بڑے ابا نے اس کی رخصتی کے لیے سارے اہتمام اور انتظامات ایسے ہی کیے تھے جیسے اپنی دونوں بیٹیوں کو رخصت کیا تھا۔ گھر پر ہی اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے اسے بالکٹی کا سامنے کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں گگلے میں گلے پودے میں بہار کا پہلا پھول کھل گیا تھا۔ ”تو بہار آگئی!“

گل رخ نے مسکراتے پھول کو غور سے دیکھا۔ زرد دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا یا لگ رہا تھا، کچھ پتیاں چل رہا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں یا قسمت کے مذاق عجیب؟

گل رخ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب قدرت اور تقدیر کے فلسفے کو سمجھ کر کیا کرنا تھا، جو ہونا تھا، وہ ہونے جا رہا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی مگر عجیب بات تھی کہ اسے کسی عجز سے کا انتظار تھا نہ امید۔

اللہ بے مایوس نہیں تھی مگر اس کے بندوں سے مایوس ہو چکی تھی۔

☆☆☆

گھر میں وہی گہما گہمی، ہنگامہ اور شور مچا رہا تھا جو بارات روانگی سے قبل گھر میں ہوتا ہے۔ دولہا تیار ہو کر آ گیا تھا۔ سفید روایتی شیر والی اور کلاہ میں اتنا وجیہہ اور خوش لگ رہا تھا کہ امی نے ہلاک لے لیں۔

”اللہ میرے بچے کے اوپر سے ساری بلائیں دور کر دے۔“ انہوں نے بے ساختہ دعا کی۔

بہو مرضی اور پسند کی نہیں تھی۔ رشتہ طے کرتے وقت انہوں نے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کیا تھا مگر اب کیسی بھی مجبوری سی سی، اس مجبوری کو خوشی سے نبھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں دولہا کے کچھ خاص مہمان آئے بیٹھے تھے، انہیں اطلاع ملی تو دل دھڑک گیا۔

”ارے کہیں ان بد معاشوں کو تو نہیں بلایا، وہ لنگے، چری، موالی، اب ایسے قہر ڈکلاں لوگ بارات کے ساتھ جائیں گے۔“

عثمان صاحب کے بلاوے پر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئیں مگر دل میں ہزاروں دوسو سے اور اندیشے تھے۔

ڈرائنگ روم میں ان کے اندیشوں کے برعکس بڑے پروقار اور سوہر سے تین مہمان بیٹھے تھے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، چہروں سے بڑے معتبر نظر آرہے تھے اور جب انہوں نے منہ کھلے تو دونوں میاں بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”آپ کا بیٹا ماشاء اللہ بڑا بہادر اور باصلاحیت ہے، پچھلے ایک سال سے ہمارے اخبار کے لیے کام کر رہا ہے، پچھلے مہینے اس کی رپورٹ کی مدد سے منشیات کا ایک بہت بڑا سپلائی کرنا گیا ہے، گروہ کے اندر تک گھس کر ثبوت لے کر آیا تھا۔ اس میں جان کا رسک تھا مگر وہ ڈرائیں۔ آپ کو تو اپنے بیٹے پر بہت فخر ہوگا؟“

☆☆☆

باراتی گاڑیوں میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے، بینڈ باجے والے پورے زور و شور سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے، دولہا گھر کے اندر آنے کا والوں کے نرغے میں پھنسا بے چین تھا کہ تقشیر ختم ہو تو وہ بارات لے کر نکلے۔

”کیا تھا وہ سب؟“ عثمان صاحب درحقیقت چکر اگئے تھے۔

”نو کری کے چکر میں سب کرنا پڑتا ہے۔ منشیات کے اصل ڈیلر تک پہنچنے کے لیے اتنا لمبا نالنگ کھیلنا پڑا۔ باری دوستی بڑھائی پڑی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر سونے بھی لگنے پڑے۔ ان کے جیسا نہ بنتا تو ان لوگوں کا اعتماد بھی کبھی نہ جیتتا۔“

”بے غیرت! پہلے نہیں بتا سکتا تھا یہ بات؟“ امی نے غصے میں دانت پیسے۔ انہیں اچانک ہی لغہ کی یاد نے آن ستایا۔ ہائے وہ کروڑوں کی جائیداد۔

”امی حضور، جس راز کو انسان خود اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتا، وہ پھر کسی اور کے پیٹ میں بھی نہیں رہ سکتا، دراصل میرے ڈرائے میں حقیقت کا رنگ آپ سب نے ہی بھرا ہے۔ جو پریشان ہو کر مجھے بھی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے اور کبھی مجھ پہ پابندیاں لگا رہے تھے۔ نشہ چھڑانے کے لیے ہر جن کر رہے تھے۔“ علی بہت دن بعد اپنے مخصوص انداز میں چپک کر بولا تھا۔

بنا کر چرسیوں کا ہم بھیں غالب تماشاے اہل بھرم دیکھتے ہیں ”ویسے مجھے اب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ہمارے ہاں رانی کا پہاڑ اور پرکا کو کیسے بنتا ہے۔“



”نفرہ کو ہی بتا دیتا، وہ تو کم از کم ہمیں بے عزت نہ کرتی۔“

”وہ تو آنکھ کھلنے سے لے کر آنکھ بند کرنے تک ہر لمحے کی سلیٹی اور اپنا سارا بیوڈیا، ساری خبریں فیس بک پہ پہنچا دیتی ہے۔ اسے بتا دیتا تو پورے پاکستان اور پوری دنیا کو فوراً پتا چل جاتا۔ ویسے بھی مجھے پراؤن رنگ شروع سے ہی نہیں پسند اور نہ ہی بلایاں اچھی لگتی ہیں، ہر وقت میاؤں میاؤں کر کے دماغ چاٹتی رہتی ہیں۔“ علی نے برا سامنہ بنایا۔

”گل رخ کے لیے بڑی جلدی راضی ہو گئے۔“ مائرہ نے جیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔  
”امی، ابو کا اسرار تھا، اب ان کی بات ماننا تو میرا فرض ہے اور جوڑ کی مجھ سے شادی پر راضی ہو گئی، اس کا گل رخ ہونا ایک اتفاق ہے، اور اب مجھ غریب کو ساری رات یہیں کھڑا رکھیں گے یا بارات لے جائیں گے؟“

☆☆☆

اسٹج پہ بیٹھا وہ نسبتاً سنجیدہ تھا، ایک کثیر الاشاعت اخبار کے نائب مدیر اور دو جانے پہچانے صحافیوں کی بارات کے ساتھ آمد نے اسے سب کی نگاہوں میں معتبر کر دیا تھا۔ رشتے دار اسٹج پر آ کر شادی کے ساتھ ساتھ اس کے کارنامے کی مبارک باد بھی دے رہے تھے اور اس کے پہلو میں بیٹھی گل رخ بھری تو نہیں تھی، کچھ کچھ معاملہ اس کی سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔ غور کیا تو عقل کے دروازے کچھ اور کھل گئے۔  
رخصتی کے وقت بڑے ابا نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔

”کسی کے رویے اور باتوں کو دل پہ مت لینا۔ خوش رہنا اور یہ لڑکا تمہیں خوش رکھے گا۔“ بڑے ابا نے اسے پیچھے کے سبک گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

برسوں پہلے کی بات تھی، جب انہوں نے اپنے بھائی کی نیا پارلنگانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اب بچے پہلے جیتھیا ان کے پاس مدد کے لیے آتا تھا۔ اپنے بیٹے کو ایک طرف کر کے انہوں نے پیچھے کی مدد کرنے کا

فیصلہ کیا تھا۔ علی کی جو حقیقت لوگوں پہ آج کھلی تھی، انہیں پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی مگر انہوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا، گل رخ کو بھی نہیں۔

راز کو راز رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ گل رخ کی نگاہوں میں شکایت تھی، چہرے پہ اداسی، مگر انہوں نے بیچ کی شکایت اور اداسی دور کرنے کی کوشش نہیں کی، کچھ وقت کے لیے خود برے بن گئے۔

☆☆☆

معاملات کا تانا بانا جوڑنے میں وہ اتنی منہمک بلکہ غرق ہو گئی تھی کہ علی کی آمد اور آہٹ اسے چونکا نہ پائی تب پتا چلی جب اسے اپنے سامنے موجود پایا۔ گل رخ کی نظریں انہیں اور علی کی نگاہوں سے الچھ کر رہ گئیں۔

”افوہ! تم کیا سمجھ رہی ہو، کیا یہ سب ڈراما وہ بھی اتنا لمبا ڈراما تمہارے لیے کیا تھا؟ ہرگز نہیں، اپنا کیرئیر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی ابو نے ڈر کے مارے شادی کا پھندا گلے میں ڈال دیا۔ میں نے تو بھوری ملی کے خواب دیکھے تھے۔ انسوس، سارے خواب خاک میں مل گئے۔“

علی نے ایک آہ بھری اور اپنی کلاہ اتار کر ایک طرف رکھی۔  
”واقعی؟“

”تو اور کیا اور دے یہ تمہاری آنکھوں میں اتنی خوش فہمی کیوں بھری ہوئی ہے، جیسے میں سچ ہی تم پر مر رہا ہوں۔ ایسی بے وقوفی میں نے آج تک نہیں کی اور آئندہ بھی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔“

”چیچی غلط کہتی ہیں کہ آپ ڈرامے باز ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی اک لمحے کور کی۔

”آپ تو بہت بڑے ڈرامے باز ہیں۔“  
گل رخ کی ایک ہل کی سنجیدگی کسی مترنم جھرنے کی ہنسی میں بدل گئی۔ علی مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا جس کی خوب صورت اور بے ساختہ ہنسی میں بہار کے سارے خوش رنگ پھول مسکرا رہے تھے۔

☆

عائشہ تنویر

## خوبی و خرابی زندگی

حُصصہ نے پانی سے بھری پالٹی بیڑھیوں پر الٹائی، پانی بھل بھل نیچے بہنے لگا۔ تب ہی چلی بیڑھیوں کا موڑ مڑ کر حاشر سامنے آیا تھا۔ اس نے بے اختیار شرمندہ ہو کر شکر کیا کہ وہ بھیگا نہیں تھا۔





جانے کیوں اسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں، شاید یہ اس کی آنکھوں میں بہناں نرم گرم جذبات تھے جو اس کے اندر اٹھل پھل مچا دیتے۔

کوئی اور ہوتا تو وہ مٹی بھرے جوتے لانے پر دایا بچا دیتی لیکن سامنے شہر دل کا کین تھا جو شرٹی لڑکا ہونے کے باوجود اس سے زیادہ منظم تھا۔ اپنے جوتوں کو پانی پر تھپتا تا وہ گویا انہیں صاف کر رہا تھا۔ مٹی نکال کر وہ احتیاط سے چڑھا حصہ کے سامنے آیا جو بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔" حاشر نے اس موٹی سی لڑکی پر ایک نظر ڈالتے سنجیدگی سے سوال کیا۔ وہ بہت مضبوط کردار اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔ کزنز ہونے کی حیثیت سے بات تو ہوتی مگر کبھی بلا وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب تک دل کا رشتہ سند حاصل نہیں کر لیتا، وہ اسے کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں دل کی کھڑکی بن کر سارے راز اس نازک سی لڑکی پر کھول دیتی ہیں تو شاید وہ کبھی اس کے سامنے نظر نہ اٹھاتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھا مگر سوچیں واضح تھیں۔ اس کے تمام بچے جذبات اور مہکتے الفاظ اس کی امانت تھے جو مستقبل میں اس کی ہمسفر بنتی۔

"جی، بولیں، کہیں۔" حصہ ہوش میں آئی۔ "ایسے پانی یہاں سے کچھ نہیں ہو گا۔ برش سے دیوار کے ساتھ گلی میل صاف کرو۔"

وہ لب دبا کر مسکرا ہٹ چھپا تا کہہ کر چلا گیا۔ ماحول کا سارا فسون غارت ہو گیا۔ حصہ نے سلگ کر اس کی پشت کو گھورا۔

"ادھبہ، بڑے آئے اصغری کے جانشین۔" وہ ہر جھک کر جلدی جلدی کام کرنے لگی۔ خیال تھا کہ حاشر کے ساتھ کرن یا پچھو بھی یقیناً آئی ہوں گی۔ شاید نیچے چچی کے گھر میں بیٹھی ہوں مگر

کام ختم کر کے اس نے درمیانی دروازے سے چچی کے پورٹن میں جھانکا تو ایسے کوئی آثار نہ ملے۔ سڑھیاں چڑھتے ہوئے نگاہ بے اختیار دیوار کے ساتھ کناروں پر میل ڈھونڈنے لگی۔ پھر خود ہی جلدی سے لا حول پڑھ کر اوپر چڑھ آئی۔

پچھو درکنگ دو مین تھیں۔ ان کے گھر میں سب کو کام کی عادت تھی۔ جس عمر میں وہ اسکول سے آ کر جوتے ادھر ادھر پھینچتے، دادی کی گود میں کھس جاتی تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی تب سے اپنے جوتے خود پالش کرتے تھے۔ آ کر اتارے تو آرام سے ریک میں رکھ دیتے۔ اپنی اوی آرام دینے کے لیے وہ سب بہن بھائی بہت سے کام خود کر لیتے۔ سنگ میں پڑے برتن ضویا دھو دیتی تو حاشر سب کے کپڑے استری کر دیتا۔

ان ہی سوچوں کے ساتھ اوپر آئی تو لاؤنج میں ہی دادی اور حاشر بیٹھے نظر آئے۔ حاشر، اپنی نانی کے پاس بیٹھا ان کی دوائیاں چیک کر رہا تھا۔ دادی اگلوٹے نو اسے کو دیکھ کر حاق و چوبند ہوئی تھیں اور اپنی پیالیوں کی مکمل تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ خدا خواستہ انہیں کوئی بڑی بیماری نہ تھی مگر ڈاکٹر نو اسے کو دیکھ کر خود بخود ہی تمام تکالیف یاد آ جاتیں۔ "کرن نہیں آئی۔"

اس نے لمحہ بھر رک کر دریافت کیا۔ وہ اور کرن ہم عمر ہی نہیں بلکہ بہترین دوست بھی تھیں۔

"نہیں، امی نے اسے کچن کی صفائی پر لگا رکھا تھا۔ ضویا اپنے ہفتہ وار کام نمٹا رہی تھی۔ پھر پورا ہفتہ تو وقت نہیں ملتا۔"

اس نے خوش گواری سے سب کے متعلق بتایا۔ دادی کو اب بیٹی اور نو اس کا خیال آ گیا تھا۔

اس کی پچھو اور دادی کی بے چاری معصوم بیٹی، جو ایک مشہور اسکول کی پرنسپل تھیں۔ گھر اور اسکول

بہت اچھے طریقے سے سنبھالتی تھیں۔ حاشر سے چھوٹی ضویا بھی ماسٹر زک کے ایک

پرائیویٹ کالج میں لیچرر شپ کر رہی تھی جبکہ کرن، حصہ کی کلاس فیلو تھی۔

ان کے خاندان میں خواتین کے کیریئر کے حوالے سے کوئی خاص تحفظات نہ تھے تو کوئی پابندی بھی نہ تھی مگر عموماً کوئی لڑکی نوکری نہیں کرتی۔ سب لڑکیاں پڑھتے پڑھتے ہی بیاہ دی جاتیں۔ صرف نسرین پچھو ہی واحد خاتون تھیں، جنہوں نے شادی کے بعد بھی تعلیم مکمل کر کے نوکری کی۔ انہیں اپنے میاں اور میکے کی مکمل سپورٹ تھی۔ بچے نانی کے پاس آرام سے رہ جاتے اور چھوٹے کزنز سے خوب کھیلے۔ ان کی محنت ہی تھی جواب وہ خاندان پھر میں معاشی حساب سے سب سے زیادہ آسودہ تھیں۔ بچے پڑھ لکھ کھاتے تھے۔ اپنا وسیع و عریض گھر تھا۔ سب کو پچھو کی مصروفیت اور تھکاوٹ نظر آتی۔ صرف حصہ ہی جو ان کی گروڈ پر سناٹا، اب ٹو ڈیٹ طرز زندگی سے متاثر تھی۔ پچھو اس کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ان جیسی بننا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"حصہ، آ جا میری بیٹی، میں تیل ڈال دوں سر میں پڑھ پڑھ کر تو نے تو اپنی صحت کا ستیاناس کر لیا۔" وہ دل جمعی سے نیو میریکل حل کرنے میں مصروف تھی، جب دادی کو اس کی صورت دیکھ کر پیار آیا۔ دادی اور وہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ رات دیر گئے وہ لائٹ جلا کر پڑھتی تو روشنی سے ڈیڑھس کے بجائے اس خیال سے دادی کی نیند اڑ جاتی کہ ان کی لاڈلی پوتی اتنی محنت کر رہی ہے۔ بچے تو سارے ہی پیارے ہوتے ہیں مگر حاشر اگلوٹا نو اس پونے کی وجہ سے زیادہ پیارا تھا۔ تو حصہ اگلوٹی پوتی تھی۔ دو اس کے بھائی اور چار چچا کے بیٹوں میں وہ سب کی اگلوٹی آپنی تھی۔ ابو، چچا، دادا جان، اس نے سب سے ہی خوب لاڈ اٹھوائے تھے۔ دادی کی بھی اس میں جان بندھتی۔

"ابھی نہیں دادی جان، یونیورسٹی سے واپس آ

کر ڈیو لوں گی۔ آپ کی نیند خراب ہو رہی ہے تو میں باہر چلی جاتی ہوں۔"

اس نے جواب دیتے، متشکر انداز میں سر اٹھا کر ایک نظر دادی جان کو دوسری نظر بارہ کا ہندسہ کر اس کرتی گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت سوتے سے وہ یقیناً روشنی کی وجہ سے بیدار ہوئی تھیں۔ "نہیں، نہیں، باہر کہاں بیٹھو گی۔ میں تو دوپٹہ آنکھوں پر رکھوں گی اور سو جاؤں گی۔" انہوں نے فوراً منع کیا۔ حصہ ان کی محبت پر مسکرائی۔

دادا جان سے وراثت میں ملے اس گھر میں وہ لوگ بچپن سے رہ رہے تھے۔ ان کے کمرے کے علاوہ، ایک کمرہ اس کے دونوں بھائیوں کے پاس تو ایک امی، ابو کے پاس تھا۔ وہ یہاں سے نکلتی تو لاؤنج کے علاوہ بیٹھنے کو جگہ نہیں تھی۔

"اکیلا کمانے والا اور اتنے کھانے والے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے، پچھو نے ساتھ محنت کی تو ماشاء اللہ کتنا بڑا گھر بنالیا۔"

اس کے ذہن میں ہمیشہ کی طرح خیال ابھرا۔ "آپ سو جائیں۔ میں بس سونے والی ہوں۔" اس نے دادی کو سلی دی اور دھیان دوبارہ کام پر مرکوز کیا۔

"انتا پڑھ کر تم نے کرنا کیا ہے۔ چار نمبر کم بھی آ جائیں تو کچھ نہیں ہوتا۔"

دوپٹہ آنکھوں پر رکھنے سے روشنی رکی تھی مگر دادی کا دماغ ہنوز اس کی فکر میں جپٹا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

☆☆☆

جاٹ اور گول گپوں کی پلیٹ کے ساتھ کوڈ ڈرنک کی بوتل سنبھالے کرن بارات کی دہلیز کی طرح سچ سچ آگے بڑھ رہی تھی۔ دور سے اس پر نظریں جمائے حصہ اپنی سوچی گئی مثال پر خود ہی مسکرا دی۔ ان کے پاس آج بے شمار نوٹس اور کتابیں تھیں،



حصہ یوں بھی رش میں گھس کر کچھ لینے سے بچتی تھی سو کرن کے اصرار کے باوجود خود سامان رکھ کر یہاں بیٹھ گئی اور اسے اکیلے کینٹین جانے دیا۔ اس وقت کرن ہی بھوک سے پریشان ہوئی تھی، حصہ کو تو پیٹ بھرنا شہ کے بنا گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تب ہی ایک طرف سے یاد رکھ کر کرن کے ساتھ چلنے لگا۔

”لاؤ، میں پکڑ لوں۔“ وہ ہاتھ آگے بڑھائے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔  
”شکریہ، میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔“ کرن نے آرام سے جواب دیا۔  
”مجھے معلوم ہے۔ میں تو صرف تمہارے ساتھ چلنا چاہ رہا تھا۔“

اس کے لہجے میں معنوں کا جہان آباد تھا۔ کرن نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔  
”پبلک پليس ہے۔ سب ہی آ جا رہے ہیں۔ میرے آگے، پیچھے، برابر میں، تم بھی چل لو۔“

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔  
یاد رہے کہ جھلا کر اسے جاتے دیکھا تھا۔ یہ چنچل سی لڑکی ہمیشہ اسے یوں ہی ٹال دیتی تھی۔ وہ پراعتاد تھی۔ پڑھی لکھی لڑکی سے تعلق رکتی تھی۔ ان کے درمیان اچھی دوستی تھی مگر یاد رہے جب کلاس فیلو سے پڑھ کر آگے تعلق بڑھانا چاہا، وہ بہت محدود اور محتاط ہو گئی تھی۔

حصہ نے دور سے سارا منظر دیکھا، کچھ سناکی نہ دینے کے باوجود وہ سب سمجھ گئی تھی۔  
”تم تو بے چارے کو بالکل لفٹ نہیں کروا تیں۔ خوار ہو رہا ہے تمہارے پیچھے۔“

اس نے کرن کو شہرارت سے چھیڑا۔  
”میں نے تو اسے سمجھی نہیں کہا کہ میرے پیچھے آئے۔“

وہ پوری توجہ سے چاٹ مکس کرنے میں مصروف تھی۔  
”وہ دے میری ہے بار۔ اپنے گھر والوں کو

بھیجنا چاہتا ہے۔ تمہیں بھی گھر سے کوئی مسئلہ نہیں تو پھر.....“

حصہ نے دل میں ہلکی الجھن کو زبان دی۔  
”تم نے بھی مجھے اس کے ساتھ اکیلے بیٹھے دیکھا ہے؟ بلا ضرورت ہم ساتھ پھرتے ہیں؟“  
اس نے جواب میں سوال داغا تھا۔  
”نہیں۔“

حصہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔  
کرن کی سارے ڈیپارٹمنٹ سے ہیلو ہائے بھی مگر دوستی صرف حصہ سے تھی۔

”لیکن اگر ہمارا رشتہ ہو گیا تو سب یہی سمجھیں گے۔ ہمارے طبقے کی لڑکیاں باہر نکلیں تو سارا زمانہ انھیں فوکس کر لیتا ہے۔ اکیلی تمہارے گھر آ جاؤ تو میری اپنی مانی ہی کہہ دیتی ہیں کہ سرین خود نوکری میں لگی ہے اور بچی کی فکر نہیں، کیسی آنادی دے رہی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ بھی بھی ایسے کسی مسئلے میں نہ پڑوں۔“

اس نے اب کی بار چاٹ سے انصاف کرتے تفصیل سے جواب دیا تھا۔ حصہ، دادی کی بات پر شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی، گھر میں رہنے والی خواتین دوسروں کی مشکل کا ادراک کے بغیر کسی بھی ورنگ ورن میں نہ پڑتے آرام سے تبصرے کر دیتی ہیں۔  
”ضویا آپ کی شادی کی تاریخ سمجھو رکھ ہی دی۔“

اس کی خاموشی پر کرن نے دانستہ موضوع بدل دیا۔  
”ارے کب، حاشر بھائی آئے تھے تو انہوں نے بتایا ہی نہیں۔“

حصہ بھی یاد کو بھلا کر خوش گواری حیرت سے متوجہ ہوئی۔  
”کل شام میں تو فون آیا تھا آئی کا۔ امی تو کب سے چاہ رہی تھیں، بس انہیں اپنے بڑے بیٹے کی آمد کا انتظار تھا۔ فراز بھائی سے بڑے بھائی آ ستریلیا میں ہوتے ہیں نا۔ اب ان کی میلی کا ویزا

مک گیا، وہ اگلے ماہ آرہے ہیں بیوی، بچوں کو لینے تو یہاں شادی منانا کر ہی جائیں گے۔“  
کرن نے رغبت سے کھاتے تفصیل سے آگاہ کیا۔ اب وہ اس کے سامنے سے گول گپے اٹھا رہی تھی۔

حصہ نے کوفت سے اسے گھورا اور پلیٹ اس کے آگے دھکیل دی۔

”یونیورسٹی آتے ہی تمہیں کھانے پینے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کا بتا رہی ہو، یہ نہیں یاد کہ اگلے ماہ تو ہمارے پیپرز ہوں گے۔“  
وہ پریشان ہوا تھی۔

”چندا! ہمارے گھر میں سب صبح صبح اپنے کاموں پر جاتے ہیں۔ دیر سے اٹھو تو ناشتہ نہیں ملتا۔ تمہاری طرح نہیں کہ امی ناشتہ سجا کر پیش کریں تو دادی منہ میں ٹوالے ڈالیں۔“

کرن نے ٹکڑا توڑ جواب دیتے ہوئے گول کیا منہ میں رکھا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتی رہی۔ منہ خالی ہوا تو کرن نے خود ہی سلسلہ کلام جوڑا۔

”امتحان ہیں تو کیا ہوا۔ تم تو بچہ زکومر پر سوار کر لیتی ہو۔ روز تو پڑھتے ہیں ہم۔ آدھی تیاری تو ہے۔ تم یہ سوچو، کپڑے کیسے بنوانے ہیں۔“

اس کی لاپرواہی پر حصہ ایسے دیکھ کر رہ گئی۔  
پچھو کی میلی میں وہ واحد بندی تھی جو اپنے مستقبل سے اتنی بے فکر تھی۔ نہ پوزیشن کی دوڑ میں شامل ہونے کا شوق، نہ پرفیشن کا سوچ کر بلکان ہوتی۔ بس بے گلے کا شوق تھا، یونیورسٹی آ کر انجوائے کرنی اور ساتھ عادات اپنا پڑھ لیتی کہ پاس ہو جائے۔

گھر جاتے ہی اس نے یہ جبر بریک کی تھی۔ ابھی تک دادی کے پاس پچھو کا فون نہیں آیا تھا۔ وہ پچھو کو فون ملانے کو بے چین ہونے لگیں۔

”کرن بتا رہی تھی کہ رات ہی بات ہوئی ہے دادی! صبح پچھو اسکول چلی گئی ہوں گی۔ اس لیے آپ کو فون نہیں کیا۔ ابھی ہال کا معلوم کر کے تاریخ رکھیں گے تو سب کو بتائیں گے۔“

اس نے انہیں ڈھارس دی۔

”ہزار بار کہا ہے سرین کو، اب جان چھوڑے نوکری کی۔ گھر میں بچی کی شادی ہے اور اسے اسکول سے فرصت نہیں۔“

دادی بڑبڑاتی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔  
سب کو اپنی بڑی تھی۔ وہ پیپر کی فکر میں بلکان تھی۔  
دادی کو بتانے میں دیر کرنا مکمل رہا تھا جبکہ امی اور چچی کو دینے لینے کی فکر ہو رہی تھی۔ آخر خند کے گھر پہلی شادی تھی۔ وہ سب کو باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ گئی۔  
اسے شادی سے پہلے پہلے تیاری پوری کرنی تھی ورنہ پڑھائی کا بہت حرج ہوتا۔

☆☆☆

”امی! بھائی کی شادی بھی ساتھ ہی کر دیں۔“  
کرن نے جوش سے مشورہ دیا تھا۔  
”اتنی جلدی کون رشتہ دے گا۔“ ضویا ہنسی تھی۔  
”رشتہ کیوں، ہم حصہ کو بھابھی بنائیں گے نا۔“ کرن نے امی کو دیکھا۔

مائی اور امی کی یہ خواہش اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ایسے طور پر وہ اکیلے میں ایسی باتیں کرتی تھیں مگر بچے ٹھوڑا سن کر ہی کتنا زباہہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں، یہ انہیں معلوم نہ تھا۔ مائی بیٹی کو بار بار اکساتیں کہ حصہ کو حاشر کے لیے مانگ لو مگر وہ بچپن کے رشتوں کے حق میں نہیں تھیں۔ جانے بڑا ہونے کے بعد بچوں کی کیا مرضی ہوئی۔ پھر بیڑوں کے رشتے بھی خراب ہوتے۔ انہیں جیتی پیاری تھی مگر ماں کی اس خواہش کو ہر بار ٹال جاتیں۔ حصہ کی آنکھوں میں حاشر کا خواب سننے کی وجہ شاید یہی رہی۔ وہ دادی کی لاڈلی تھی۔ ان کے ساتھ ہی رہتی۔ پچھو اسے لپٹا لپٹا کر پیار کرتیں۔ میری گڑیا، میرے گھر کی رونق تھیں تو دھیان کا پچھی اپنی من پسند دنیا کو اڑ جاتا۔

”ارادہ تو یہی ہے بیٹا مگر حاشر سے پوچھتے بغیر تو کچھ نہیں کروں گی۔ کیا پتا، اسے کوئی اور پسند ہو۔ ابھی تو حصہ بھی پڑھ رہی ہے، جب شادی کا وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ تمہاری اور حاشر کی شادی



ساتھ کروں گی۔“

ای نے سبھاؤ سے جواب دیتے پیار سے اسے دیکھا۔

”نہیں امی! پھر میں بھائی کی شادی کیسے انجوائے کروں گی۔“ وہ ہنسی۔

”مشرقی لڑکیاں، اپنی شادی کی بات پر شرمایا کرتی ہیں۔“ ضویا نے اسے چھیڑا۔

”نہیں بھئی، آج کل شرمانے والی لڑکیوں کا ٹریڈ نہیں۔“

اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو ان دونوں کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

”یہ ٹریڈ بھی پرانا نہیں ہوتا۔ مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگتی، اپنے منہ سے شادی کی بات کرنے والی بچیاں۔“

امی نے صاف گوئی سے ناگواری کا اظہار کیا۔

”میں نے کب بات کی اپنی شادی کی۔ میں تو بھائی کی شادی کا پوچھ رہی ہوں۔ آپ نے ہی موضوع بدلا۔ شادی نہیں کرنی تو بھائی کی۔ منگنی ہی

کروں۔ کچھ تو مرا آئے۔“

کرن نے احتجاج کے ساتھ فرمائش بھی ریکارڈ کروائی۔

”بہی لمبی منگنیاں نہیں اچھی لگتیں مجھے۔ تم فالٹو باتیں چھوڑو اور مہمانوں کی فہرست بناؤ۔“ امی نے اسے ڈپٹ کر کام پر لگایا۔

☆☆☆

”پلیز حصہ! بہن نہیں ہو۔ چلو نامیرے ساتھ مارکیٹ۔“ بچاری ضویا کا بھی بازار جا جا کر حشر ہو گیا ہے۔

کرن بہت لمبا جت سے منت کر رہی تھی۔

”فراز بھائی نے جہیز سے تو سختی سے منع کر دیا تو بازار کے اتنے چکر کیوں لگ رہے ہیں۔“

حصہ تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

”جتا تو ہے ہمیں ضویا کے خڑے۔ اپنے کپڑوں، جوتا، کے لئے اسے کسی رشتہ دار نہیں۔ کہہ رہی تھی

بری میں اللہ جانے کیا ہو۔ میں اپنی پسند کے کپڑے تو بنوا لوں۔ پھر اس کے بیوی پارٹرز کے چکر، میرے سینڈل اب تک نہیں ملے۔ امی اپنے اسکول میں مصروف۔ میں اکیلی کیسے جاؤں۔ تم آج واپسی پر میرے ساتھ چلو تو لے لوں۔ تمہاری تیاری ہوگئی پوری؟“

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا۔ ضویا ان دونوں سے بڑی تھی مگر وہ نام لینے کی ہی عادی تھیں۔

ضویا کی خوش لباسی اور حسن پورے کالج میں مشہور تھا۔ وہ اپنا خیال رکھتی بھی بہت تھی۔ لڑکیوں نے اسے ”بیوی دو برہن“ کا خطاب دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ دونوں مست ملنگ تھیں۔ کرن غیر

نصائی سرگرمیوں میں تو حصہ نصائی سرگرمیوں میں آگے آگے ہوتی مگر لباس اور فیشن کا وہ کریزان میں نہیں تھا جو ضویا میں تھا۔ اب بھی بہن کی شادی کی

خوشی میں کرن تیار یوں میں لگی تھی جبکہ حصہ کو امتحانات کی فکر تھی۔

”سوٹ تو سلوا لیا میرا امی نے۔ سینڈل چچی کے میچ ہو گئے۔ بس ایک اور ریڈی میڈ لینے کا ارادہ ہے ویسے کے لیے۔“

اس نے سکون سے جواب دیا۔

”تو میرے ساتھ چلو، تم بھی لے لینا۔ امی نے اپنا اے بی ایم کارڈ دے دیا تھا۔ جتنی ضرورت ہوگی، پیسے نکالیں گے۔“

کرن فوراً اپنے مطلب پر آئی۔

”یونیورسٹی میں اتنی خوار کی کے بعد بھی تمہارے اندر ہمت ہے کہ بازار جاؤ گی۔“

حصہ نے آنکھیں پھیلا لیں مگر کرن کے غصیلے تیور دیکھ کر اسے ماننا ہی پڑا۔

شائنگ مال میں پہنچے ہی پہلے وہ لوگ فوڈ کورٹ گئے تھے۔ کھانا کھا کر جان آئی تو کچھ خریدتے۔

فوڈ کورٹ میں ایک طرف لڑکے، لڑکیوں کا بڑا سا گروپ ہنسی مذاق میں مشغول تھا۔

حصہ نے دیکھا، ان میں حاشر بھی تھا۔ وہ سب

دوست کسی پارٹی کے لیے یہاں جمع تھے۔ الگ الگ ہپٹالوں میں جاب کے بعد ایک جگہ ملاقات کرنا ان کے لیے بہت خوشی کا باعث تھا۔

حاشر کے برابر میں بیٹھی پیاری سی لڑکی، اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

حصہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس لڑکی کا دوستانہ انداز اس کے دل میں دھواں بھر گیا۔ اس نے نظریں ہٹا کر، لمبی سانس لے کر خود کو نائل کرنا چاہا مگر تب تک حاشر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ خوش گوار انداز میں اپنے دوستوں سے معذرت کرنا ان تک آیا تھا۔

کرن، بھائی کو دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ اس نے فوراً ہی شاپنگ کے بعد گھر ڈراپ کرنے کا مطالبہ کر دیا تھا تا کہ پبلک کنونینس میں پریشان نہ ہونا پڑے۔

وہ دونوں جلدی جلدی کھا کر اٹھ گئی تھیں۔ کرن نے اپنی شاپنگ کرتے اسے بھی بار بار کچھ خریدنے پر مجبور کیا دل نہ چاہنے کے باوجود حصہ اس کے

ساتھ خریداری میں مصروف تھی۔ اپنی کیفیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی، حاشر، اس کا صرف کزن تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ گھومتا یا لڑکیوں سے بے تکلف

ہوتا، اس کا دل کیوں بچھ رہا تھا۔ ضروری تو نہیں جو جذبات وہ حاشر کے لیے رکھتی تھی، وہ بھی اسے دیے ہی سوچتا۔

اسے آج احساس ہوا تھا کہ حاشر کی بولتی آنکھوں کا لکھا پڑھتے وہ بہت دور نکل آئی ہے۔ ان کے درمیان کوئی وعدہ نہیں تھے۔ حاشر کی اپنائیت تمام کزنز کے لیے یکساں تھی، شاید وہ ہی غلط فہمی کا

شکار ہوگئی تھی۔ میڈیکل کی فیلڈ سے شوق رکھنے والے تو یوں بھی اپنی جیسی شریک حیات ڈھونڈتے تھے۔

وہ خود کو خالق کا سبق پڑھاتی، خوش فہمیوں کے سمندر سے باہر نکال رہی تھی مگر دل میں رکھتے ہوئے خوابوں کا دھواں خلق میں لپی بھر رہا تھا۔ ابھی وہ شاپنگ ہی کر رہی تھیں، جب حاشر بھی اسی لڑکی کے ساتھ ان کے پاس چلا آیا۔ اس کے سارے دوست چلے گئے

تھے۔ اسے حاشر نے ڈراپ کرنا تھا۔ حاشر کی جلدی

جلدی کی رٹ کے باوجود کرن آرام سے حصہ کا سوٹ پسند کرنے میں لگی تھی۔ آخر وہ اس کے ساتھ اتنی دیر دکان دکان پھری، اب اس کی ہی شاپنگ رہ جاتی تو کتنا برا لگتا۔

حاشر کی دوست فضا بہت خوش مزاج لڑکی تھی۔ عجلت چھائے بنا وہ آرام سے انہیں سوٹ پسند کرنے میں مشورے دے رہی تھی۔ ڈارک براؤن لکڑ کا ایک اسٹائش سوٹ پکڑے وہ اس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی، جب حاشر نے وہ سوٹ اس سے لے کر

حصہ کے ہاتھ میں دیا۔

”بس اب لے لو۔ تمہیں تو کوئی سوٹ پسند نہیں آ رہا۔“

وہ حد درجہ اکتایا ہوا تھا۔ حصہ نے ایک نظر اسے اور دوسری مسکراتی فضا پر ڈالی۔ یہ سوٹ حاشر نے اس کے لیے پسند کیا ہوتا تو وہ کھل اچھی مگر یہ فضا کی پسند تھا۔ دل میں درد کی لہر اٹھی مگر اس نے

دبالی۔ جب حاشر نے اسے ہی منتخب نہیں کیا تو اس کے لیے سوٹ کیوں منتخب کرنا۔ اس نے بے دلی سے وہی سوٹ لے لیا تھا۔

☆☆☆

ضویا کی شادی میں شریک ہونا مجبوری تھی۔ خاندان کا معاملہ تھا۔ وہ کسی کو اپنے دل کا بھید نہیں

دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کی محبت کی جھک ہوئی۔ بس پڑھائی کا بھانا کر کے وہ وقت کے وقت جاتی اور جلدی واپس آ جاتی۔ اس کی توجہ دیکھ کر سب کرن کو

اس کی لا پرواہی کا احساس دلاتے مگر وہ بے فکری سے ہنس دیتی۔ سب بھی کہہ رہے تھے کہ حصہ اپنی پچھو کی طرح سختی ہے، ضرور کسی اونچے مقام کو پائے گی۔

خواتین کی نوکری کی مخالف دادی اور امی بھی یہ سنتیں تو انہیں حصہ پر فخر ہوتا۔ وہ خاموشی سے سب کے

تہرے سنی مسکرا دیتی۔

شادی والے دن بھی باہر ہنگاموں میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ پچھو کے کہنے پر ضویا کے

ساتھ پارلر گئی تھی اور واپس آ کر اس کے پاس ہی



برا نیڈل روم میں بیٹھی رہی۔

حاشر بہت تیزی سے اندر کچھ کہنے آیا تھا مگر نظر اس پر پڑی تو لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا۔ پہلی بار اسے اس قدر بجا سنو را دیکھا تھا۔ اس کا بے اختیار ٹھٹھکانا حفسہ اور ضویا نے بھی محسوس کیا تھا۔ محبت کی غیر مرئی شعاعیں اس کے اندر تک اتری تھیں۔ وہ فوراً نظر جھکا گئی تو وہ ہوش میں آیا بہن کے پاس آ کر اسے پیار کرنے لگا۔

”بھائی! خیر تو ہے۔“

کھڑے ہو کر بھائی کے شانے سے لگتے ضویا نے شوقی بھری سرگوشی کی تھی۔ وہ مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا حفسہ پر دوسری نظر ڈالے بنا باہر نکل گیا۔ بہت چاہنے کے باوجود اس نے خود پر ضبط کا بند باندھا تھا۔ البتہ دل میں دہی خواہش ہمک کر اوپر آ گئی تھی۔

حفسہ کے دل میں مرجھایا پودا اس بھر پور نظر سے دوبارہ زندگی پکڑ لیتا اگر شادی میں اس کی ملاقات حفسہ سے نہ ہوتی۔ حاشر کے سب ہی دوست انوائیٹڈ تھے۔ حفسہ کے علاوہ بھی دو، تین لڑکیاں موجود تھیں۔ ان سب کے مابین دوستی بھری فضا سب کو نظر آ رہی تھی مگر حفسہ خود کو دوبارہ کسی خوش فہمی میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جذبات کو عقل کے تابع کرنے کی بے نتیجہ سعی میں مصروف رہی۔

جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ نصیب کے لکھے سے کون بھاگ سکتا ہے۔ خوش باش لوگوں کے درمیان وہ کاغذی سی لڑکی خود سے جنگ میں مصروف تھی۔

ویسے والے دن وہ لوگ مہمان تھے۔ سب اکٹھے ہی ہوئے بیچنے تھے۔ اسی ڈارک براؤن سوٹ میں تک سب سے درست حفسہ، حاشر کو دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی مگر اس کا خوبصورت چہرہ بہت اداس لگ رہا تھا۔

”خیریت تو ہے، تم کس صدمے کا شکار ہو۔“ وہ اور کرن رش چھٹنے کے انتظار میں اس کے ساتھ کھڑی تھیں، جب حاشر بھی وہیں آ گیا۔

وہ اپنے دل کا چور چھپانے کو غیر ارادی طور پر ہاتھ چہرے تک لے گئی تھی۔ لب زبردستی پھیلائے۔ اس کی محبت اتنی ارزاں نہ تھی کہ یوں عیاں ہوتی جبکہ کرن نے دہل کر بھائی کو جواب دیا تھا۔

”اللہ نہ کرے، کوئی صدمہ ہو۔ بس پیپرز کی ٹینشن سر پر سوار کر رکھی ہے اس نے۔“

”تم ہی تو ڈی بے فکری اسے دے دو۔ مجال ہے کبھی بڑھتے دیکھا ہو نہیں۔“

حاشر نے بہن کی کھچائی کا موقع جانے نہیں دیا لیکن وہ اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ مجال ہے جو اثر لے۔

”اس نے تو پوزیشن لینی ہے، کیریئر بنانا ہے اپنی پھپھو کی طرح۔ اب میری کوئی پھپھو ہی نہیں تو میں پوزیشن لے کر کیا کروں۔“

وہ مزے سے بولتی خود پر مصنوعی دلگرفنی طاری کیے بولی۔ حاشر بے اختیار ہنسا تھا جبکہ حفسہ کے چہرے پر بھی مسکان پھیلی تھی۔

”بذمیرہ تم نے واقعی جاب کرنی ہے۔“ بہن کے سر پر چپت لگا تا وہ حفسہ سے پوچھ رہا تھا۔

حفسہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نوکری کرنا اس کی خواہش بھی تھی اور اس وقت اس کی دلی حالت چھپانے کے لیے بہترین پردہ بھی تھی۔

”چلو اس پر ضویا سے مل کر آتے ہیں۔“ وہ مزید تبصرہ کے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔

اس پر ضویا دلی خوشی کا عکاس چمکتا چہرہ لیے ان کی ختہر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

ماسٹرز مکمل ہوتے ہی جہاں کرن نے سکون کا سانس لیا، وہاں حفسہ پہلے سے زیادہ مصروف ہوئی تھی۔ اس نے کان میں جاب کے ساتھ ایم فل میں ایڈمیشن بھی لیا تھا۔ اخبارات میں پبلک سروس کمیشن کے اشتہار دیکھ کر ایک کے بعد ایک دستخط کے لیے اپلائی کر دیتی۔ اس کی اس مصروفیت سے

گھر والے پریشان تھے مگر وہ کافی مطمئن تھی۔ دن، رات مختلف کاموں میں اٹھنے اسے دل کی پکار پر دھیان دینے کا وقت بھی نہیں ملتا۔

جہاں پھپھو زور و شور سے کرن کے لیے رشتے ڈھونڈنے میں مصروف تھیں۔ وہاں امی بھی اس کی شادی کو مقصد حیات بنائے بیٹھی تھیں۔ چچی بھی اپنے بھائی کا رشتہ حفسہ کے لیے لائیں مگر بیرون ملک ہونے کی وجہ سے معذرت کر لی گئی۔ اکلوی بیٹی کو اتنی دور بھیجنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ امی کی تک دودھ کچھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ حفسہ کے لب پر آ جاتی۔

سو ثابت ہوا کہ اس کا دل بیوقوف تھا، غلط فہم تھا دیتا تھا مگر نہ حاشر چاہتا تو اس کا رشتہ مانگنے میں پھپھو کو کیا عذر مانع ہوتا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی آئیڈیل پھپھو دیکھنے میں جتنی بھی روشن خیال لگیں مگر رواجی مشرقی ماؤں کی طرح وہ بیٹی سے پہلے بیٹے کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ خیال یہی تھا کہ کرن کا رشتہ ہو جائے تو وہ حاشر کے لیے حفسہ کو مانگ لیں گی اور اکٹھے دونوں کی شادی کر دیں گی۔

مگر پھر دادی کے بار بار احساس دلانے پر وہ بیدار ہوئیں۔ اگر ابھی بھی وہ رشتہ نہیں چاہتیں تو بھائی، بھانجی بیٹی کا رشتہ کہیں اور کر دیتے۔ بیٹی کو بہو بنانا ان کی پرانی خواہش تھی۔ حاشر کے رجحان کا بھی اندازہ تھا مگر اس وقت وہ حیران بلکہ پریشان رہ گئیں، جب حاشر نے حفسہ کے لیے رخ کرتے انہیں کہیں بھی رشتہ کرنے کی آزادی دے دی۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ ماں تھیں، اس کے انداز پر بچا پتی تھیں۔ ضویا نے بھی انہیں حاشر کی حفسہ کے لیے پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا۔ تو ان سب کو غلط فہمی ہوئی تھی یا کچھ اور مسئلہ تھا۔

”حفسہ! کیوں نہیں بیٹا۔ جب تمہیں کوئی پسند نہیں تو حفسہ سے اچھا کون ہے۔“

وہ تنجب کی پوچھ رہی تھیں۔

”حفسہ بہت اچھی ہے امی! لیکن مجھے لگتا ہے

کہ ہمارے خیالات بہت مختلف ہیں۔ شاید ہم ایک ساتھ خوش نہیں رہ پائیں۔ بعد کی رجش سے بہتر ہے کہ ابھی سوچ کر فیصلہ کیا جائے۔“

حاشر نے اپنے دل پر پاؤں رکھ کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی دل کے مقابلے میں دماغ کو مقدم رکھتا مگر اب کی بار دل کا احتجاج برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اچھی بھلی بچی ہے۔ تمہارے ایسے کون سے خیالات ہیں جو لڑائیاں کر دے گے۔“

ای اٹھا ہوا بھی تھیں۔ حاشر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کن الفاظ میں اپنا مدعا سمجھائے۔

”وہ بہت کیریئر اور غنڈہ قسم کی لڑکی ہے امی۔ میں ہاؤس وائف چاہتا ہوں۔ بعد کے مسائل سے بہتر نہیں کہ۔“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بار بار اپنی زبان سے راستہ بدلنے کا اعلان کرنا مشکل تھا۔

”سب لڑکیاں ہاؤس وائف ہی ہوتی ہیں۔ مگر وائف سے ہی بنتا ہے۔ چاہے وہ جاب کریں نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم تھا، ہم اتنے تنگ نظر ہو۔“

وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

”میں تنگ نظر نہیں ہوں امی۔ نہ ہی لڑکیوں کی جاب کے خلاف ہوں۔ بس مجھے اچھا لگے گا کہ میری بیوی گھر بیٹھ کر میرا انتظار کرے۔“

وہ ماں کی دل شکنی کے خیال سے کہہ نہ سکا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے ماں کی مشکلات سمجھنے میں اپنا بچپن کھوائیں۔

”بس اب میں تمہاری ایک بات نہیں سنوں گی۔ یہ کوئی بات ہوئی بھلا۔ میں تو تمہیں بہت ذمہ دار، محبہ ور انسان سمجھتی تھی اور تم.....“

وہ کہتی جا رہی تھیں۔ مستقبل کے بے شمار اندیشوں کے باوجود حاشر نے اپنے دل میں سکون سا اثر محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ خود چاہتا تھا کہ امی اس کی بات نہ مانیں، تب ہی اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے مسلسل ڈراتے دماغ کو چپ کر دیا تھا۔



اگلے ہی دن پچھو سکے گی تھیں۔ باقاعدہ رشتہ لے جانے سے پہلے وہ بھانجی سے نہ صرف اجازت لینا چاہتی تھیں بلکہ حاشر کے تحفظات بھی ان کے علم میں لانا چاہتی تھیں۔

حسب توقع وہ سب ان کی خواہش جان کر خوش ہو گئے تھے۔ مگر بھری لاڈلی حصہ نظروں کے سامنے محفوظ ہاتھوں میں رہتی، اس سے بڑھ کر کیا تھا۔ حصہ کا نوکری کرنا ویسے بھی اسی اور دادی کو پسند نہیں تھا سو یہ ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اسی لیے انہوں نے حصہ کو بھی اس بارے میں بتانے کی زحمت نہیں کی۔

گھر میں مشورے کے بعد اگلا اتوار باقاعدہ رشتہ لاکر رسم کرنے کے لیے مختص ہوا۔ حصہ کے لیے یہ خوش گوار جھکا تھا۔ اب جب وہ مایوس ہو چکی تھی، اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے من کی مراد پوری کر دی۔ وہ خوشی سے لگ رہ گئی تھی۔ اس کا رواں رواں شکرانہ ادا کر رہا تھا مگر خوشی کا یہ وقت بہت محدود تھا۔

☆☆☆

گھر میں چہل پہل اور رونق تھی۔ پچھو لوگ اس کا رشتہ لائے تھے۔ اپنی نوعمری کے پہلے خواب کی تعبیر حاصل کرنے پر وہ شادی ہواؤں میں اڑ رہی تھی، رسم کے بعد سب باہر محفل جمائے بیٹھے تھے، جب کرن کی بے خیالی میں کئی باتوں نے اسے آسمان سے زمین پر دے مارا تھا۔

”تمہیں بھانجی بنانا میری بچپن کی خواہش تھی۔ پتا ہے، میں تو ہزار بار اسی سے کہہ چکی تھی کہ ہم منگنی کر دیتے ہیں مگر ای کوئی منگنیاں پسند نہیں، دیکھنا اب وہ جلد ہی شادی کریں گی۔ اچھی اتنا وقت بھی بھائی کی وجہ سے لگ گیا، جانے ان کے دل میں کیا سودا سما یا، کہنے لگے حصہ نہیں، اس کے علاوہ جو بھی ہو۔ اسی نے اچھی بھنچائی کی ان کی۔“

کرن مزے سے کہتی جا رہی تھی اور حصہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ ایسی بے عزتی۔

”کیا کہاتے تھے۔“

اس نے بمشکل کھپائی آواز میں پوچھا۔

کرن نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ راضی نہیں تھے اس رشتے پر؟“ اب وہ سختی سے پوچھ رہی تھی۔ گزریے وقت اور زمانے کی ہوا نے اسے مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اب ٹین ایئر لڑکی نہیں تھی جو نرم لفظوں کو محبت سمجھ سکتی تھی۔

”نہیں، بھائی کی مرضی کے بنا کیا ہوتا بھلا۔ وہ تو تمہیں پسند کرتے ہیں۔ بس انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ تم لوگوں کا مزاج الگ ہے۔“ کرن نے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانتی تھی کہ اب وہ اسے بہلا رہی ہے۔

دل میں پھیلا خوشی کا سارا احساس بھاپ بن کر اڑا تھا۔ اب وہاں آبلے تھے۔ بکھرے خوابوں کی کرچیاں تھیں اور اس کی ایک طرف محبت ایک کونے میں منہ دیے سک رہی تھی۔

اپنے ایک طرف احساسات کو بے قونی سمجھ کر ان پر ہنسنا، خوش گمانی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنا اس کے لیے مشکل تھا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا کہ وہ اس کے جذبات سے بے خبر ہے۔ محبت خود رو پودے کی طرح نہیں بھی اگ جاتی ہے۔ وہ نہ تو زبردستی اس کے دل میں اپنی محبت کا بیج ڈال سکتی تھی، نہ یوں اسے پاسکتی تھی۔

لیکن یہ خیال کہ وہ اس پر مسلط کی گئی ہے۔ وہ اسے اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنانا چاہتا تھا، اس کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ محبت کا وہ تناور درخت جو وہ اپنے تئیں کاٹ چکی تھی۔ پھر جڑیں پھیلا کر راتوں رات اگ آ رہا تھا۔ اب کی بار دل میں جدائی کا اندیشہ نہیں بلکہ اپنی بے وقوفی کا غم تھا۔ جو شخص اس کے لیے شادمانی کا دوسرا نام تھا۔ وہ اس کے لیے اتنی کم مایہ تھی۔

طے ہوا تھا۔

اچانک سے کرن کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا۔ یاد اب کی بار ان کی کلاس کی ایک لڑکی کے ذریعے گھر تک آیا تھا۔ اب وہ بے روزگار زیر تعلیم نوجوان نہیں تھا بلکہ ایک اچھی جاب کا حامل تھا۔ اس کی محبت بھی تھی۔ شاید اس کی دعاؤں کا ہی اثر تھا جو اب تک کرن کا رشتہ نہیں طے نہیں ہو سکا تھا۔

آنا فنا دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ امی نے اسے مزید جاب پر جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہی جھجک سوچوں میں مگن تھی پڑمردہ ہو رہی تھی کہ خاموشی سے ان کی بات مان لی۔

کسی کام میں دلچسپی لیے بنا وہ سر منہ لیپے لیٹی رہتی۔ دادی کو اب اس کی بے رونق صورت دیکھ کر تشویش ہونے لگی تھی۔

اس دن امی اور چچی شادی کی تیاریوں کے لیے شاپنگ پر گئی تھیں، جب حاشر ثانی کی خیریت معلوم کرنے آ گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی ٹائمنگ کے حساب سے آتا تھا۔ جاب اور یونیورسٹی کی مصروفیات میں کافی عرصے سے ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ رسم والے دن دیکھی جھجک کے بعد سے حاشر کا دل اسے دیکھنے کے لیے چل رہا تھا۔ اسی لیے بہانے سے چلا آیا۔

حاشر کو دیکھ کر وہ مارے باندھے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سب بچے ٹیوشن گئے تھے۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ یہاں سے اٹھ کر امی کے کمرے میں چلی جائے گی مگر دادی نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی سستی کی تفصیل بتا کر حاشر سے نسخہ لکھوانے کو بے تاب تھیں۔

”دادی! میں ان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی ہوں۔“

دماغ میں ابھرتے سوالات سے تنگ آ کر حصہ نے محول میں فیصلہ کیا۔ وہ اس سے حساب لینا چاہتی تھی۔ اس کی ذات اتنی ارزانی نہیں تھی کہ

زبردستی کسی کے سر منہ ہدی جاتی۔ بچی محبت کرنے والے یاد کی طرح راستے ڈھونڈ لیتے ہیں مگر زبردستی کسی کا راستہ نہیں کاٹتے۔ اگر حاشر اسے پسند نہیں کرتا تو وہ بھی اپنی محبت کی بے توقیری برداشت کیے بغیر پوری عزت کے ساتھ یہ رشتہ ختم کر دے گی۔

”ڈاکٹر تو یہ خود ہے۔“

دادی نے منہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ حاشر نہ سمجھنے والے انداز میں دادی پوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی موجودگی کیمر بھلائے آپس میں لگی تھیں۔

”ٹیسٹ کروانا ہے دادی! مجھے لگ رہا ہے خون کی کمی ہو گئی ہے۔“

حصہ نے دادی کی کم زوری پکڑی۔ دادی نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

”تب ہی رنگ اتنا پیلا ہو رہا ہے۔ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ حاشر جابنا! اسے خون کی بوتل لگوا دے۔ بچے ٹیوشن سے آئیں گے تو گھر خالی ہو گا ورنہ تو میں خود ساتھ جاتی۔“

دادی نے افسوس سے ہاتھ ملتے حاشر کو حکم دیا۔ ان کے یوں گھر بیٹھے مرض کی تشخیص سے علاج تک پہنچنے پر وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر جان چکا تھا کہ یہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی اس کے ساتھ باہر جانا چاہتی ہے اور یہ وقت میڈیکل سائنس پڑھانے کا نہیں سو خاموشی سے باہر نکل گیا۔

وہ دادی کو تسلیاں دیتی آ کر گاڑی میں بیٹھی تو حاشر نے گاڑی آگے بڑھاتے اسے دیکھا۔

”اب کیا کرتا ہے۔ کہاں سے خون لے کر پڑھاؤں تمہیں۔“

اس کے انداز پر حصہ کے لب بے اختیار پھیلے۔

”ضروری بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔“

”ضرور کرو، مگر یہ اپنا حشر کیا بنا لیا ہے۔ نانی

ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بہت کمزور لگ رہی ہو۔“

وہ فکر مند کیسا لگتا تھا کہ



نے سر جھٹکا۔ اس کی یہی باتیں اسے خوش فہمی میں مبتلا کرتی تھیں۔

”آپ کو پھپھو نے زبردستی مجھ سے شادی کے لیے راضی کیا ہے۔“

اس نے بلا تہدید پوچھا۔

”کیا مطلب۔“ حاشر کا پاؤں بے اختیار بریک پر گیا۔ یہ سوال غیر متوقع تھا۔

”زبردستی تو خیر کوئی نہیں ہوئی۔“

وہ اسے جواب دیتا اب گاڑی سڑک کے ایک طرف کر کے لگا رہا تھا تاکہ فرصت سے اسے دیکھ کر بات کر سکے۔

”مجھے کرن نے خود بتایا ہے کہ آپ نے منع کر دیا تھا اور پھپھو کے کہنے پر راضی ہوئے۔“

وہ اس کے یوں انکار کر دینے پر ایک دم غصے میں آئی تھی۔

”کرن تو بے وقوف ہے اور تم اس سے بڑی بے وقوف ہو۔ مجھے لگتا تھا بلکہ ہے کہ ہمارے خیالات میں تضاد کی وجہ سے ہم میں بہت اختلافات ہوں گے۔ اسی لیے منع کر رہا تھا، پھر سوچا کہ ایسی فضول بات پر اپنی محبت کون چھوڑتا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ مل جل کر گزارا کر ہی لیں گے۔“

حاشر نے اس کی طرف رخ کر کے حرف پر زور دیتے دھیان سے اسے دیکھا۔

اس کا اچانک اظہار محبت حشہ کو ہڑبڑانے پر مجبور کر گیا۔

”محبت کون۔“ ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔

حاشر زور سے ہنسا تھا۔

”تم، یہ وقوف لڑکی تم خود۔ ہمیشہ یہ ہی سوچا تھا کہ اظہار محبت اپنی بیوی سے ہی کروں گا مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا۔“

اپنی عادت کے برخلاف وہ چپک رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔

”باتیں مت بنائیں، منع کیوں کیا تھا آپ

نے۔“ وہ فوراً پچھلی بات پر آئی۔

”تمہیں مای اور نانی نے کچھ نہیں بتایا۔“

اس نے حشہ کو بغور دیکھا۔ حشہ نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”کیونکہ تم اپنے کیریر کے لیے اتنی سنجیدہ ہو، جبکہ میری خواہش ہے کہ میری بیوی ایک فل ٹائم ہاؤس وانف ہو۔ میں جب تمہیں جاب سے منع کروں گا تو جھگڑا ہوگا۔ تمہاری جاب میرے کہنے پر ہی مای نے چھڑائی ہے۔“

حاشر نے صاف کوئی سے کہا۔

”بس! حشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

انداز کھودا ہوا نکلا جو جیسا تھا۔ امی کے بعد حشہ کا یہ رد عمل دیکھ کر حاشر کو خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ جس بات نے اس کا سکون چھین لیا۔ وہ ان سب کے لیے اہمیت ہی نہیں رکھتی۔

”تم جاب نہیں کرو گی ناشادی کے بعد۔“

اس نے حشہ سے یقین دہانی چاہی۔

”آپ کو خواتین کا جاب کرنا کیوں پسند نہیں ہے جب کہ آپ کی تو اپنی امی جاب کرنی ہیں۔“

حشہ کے لہجے میں اب بھی استغاب تھا۔ اس نے حاشر کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

”اسی لیے نہیں پسند ہے۔ اپنی امی کی روٹین دیکھ کر ہی میں چاہتا ہوں کہ میرے بچوں کی امی جاب نہ کرے۔ ان کے ساتھ مکمل وقت بتائے۔“

اس نے مکمل سنجیدگی سے کہتے حشہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ حاشر کی آنکھوں میں مچلتی شوفی نے اس کے گال تپا دیے تھے۔ وہ نظریں چرا گئی۔ پھر بات بدلنے کو بولی۔

”ملک کی آدمی آبادی خواتین کی ہے اگر آدمی آبادی کام نہیں کرے گی، گھر بیٹھے گی تو ملک کیسے ترقی کرے گا۔“

”قوموں کا سرمایہ ان کے جوان، ان کے بچے ہوتے ہیں۔ مادی اشیاء نہیں۔ ہماری آدمی آبادی

جس نے اگلی نسل کی تربیت کرنی ہے، وہ زبردستی کی مشقت میں مصروف ہوگی تو ہماری اگلی نسل کیا کیسے گی۔ تمہارے وقت اور علم کی ضرورت ہمارے گھر کو زیادہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے اسکول سے آئیں تو انہیں سینے میں چھپا کر ان کی باتیں سننے والی ماں خود تھکاوٹ کا شکار ہو۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ماں کے پیچھے پھرنا پڑے اور ماں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ گھر اور جاب کو چلانے میں خود کو بھول جائے۔“

حاشر کے لہجے میں یاسیت تھی۔ ماں کو بانی کی تڑپ تھی۔ بچپن کے کھوئے ہوئے لمحوں کی پکار تھی۔ وہ خاموش رہ گئی۔

پھپھو کی گروڈ پر سناٹائی اور معاشی آسودگی اسے جاب کی طرف مائل کرتی تھی مگر خود جاب کی مشکلات برداشت کر کے اسے اندازہ ہوا کہ ورکنگ دومن کے لیے گھر داری آسان نہیں۔ سارے دن کی تھکاوٹ گھر میں منتظر کام دیکھ کر دو چہرہ ہو جاتی ہے مگر، معاملے کا یہ پہلو اس کی نظر سے بالکل اوجھل تھا۔

خود مختار، خود انحصار، بااعتماد نظر آنے والے حاشر کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی، دل میں جانے کیسی کک پنہاں تھی، جو اس کے اندر تک اتری تھی۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا، اسی لیے منع کر رہا تھا۔ سب کا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ تمہیں جاب کا شوق ہے۔ ساری زندگی ہم دونوں بلا وجہ کی بحث کرتے رہیں، اس سے بہتر کنارہ کر لینا ہے۔ فیصلہ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

حاشر نے اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھا کہ ساری بات سمیٹ کر اس کی خواہش اور خواب کو ترازو کے پلڑوں میں رکھ دیا۔ حاشر نہیں جانتا تھا مگر وہ تو جانتی تھی کہ جاب ایک شوق تھا مگر وہ خود اس کی ادا کی عمری کا خواب تھا۔ اس نے مسکرا کر اپنے ست رنگے خواب کی حسین تعبیر کو دیکھا۔ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”آپ بعد میں بھی مجھے روڈ پر کھڑا کر کے صرف لیکچر ہی پلایا کریں گے یا ابھی کچھ اور بھی ملے گا۔“

اس کے شرارت سے کیے سوال میں حاشر کے لیے جواب پوشیدہ تھا۔ اطمینان، سکون، محبت، خوشی جانے کیا احساس تھے، جو اس کی روح پر پھوار بن کر برسے تھے۔ وہ سرشار ہو گیا تھا۔

”بعد میں تو تمہیں اپنے پیار کا امرت دھارا پلاؤں گا۔“ وہ ایک دم بے باک ہو گیا۔ حشہ کا چہرہ سرخ ہوا۔

”بس، زیادہ اور مت ہوں۔ مجھے گھر ڈراپ کر دیں۔“

حشہ کے لیے اس کی نظروں کا سامنا مشکل ہو رہا تھا۔

”نانی کو کیا بتاؤ گی، کتنی بوتلیں خولنے کی چڑھائی ہیں۔ پیلے چہرے کو لال کر دیا میں نے۔“

وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہی نہیں رہا تھا۔ حشہ بھی ہنس پڑی۔ تضادات کو اختلاف نہ بنایا جائے تو زیست سہل ہو جاتی ہے۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

گل کھستار

نور مجیدی

قیمت - 400/- روپے

منگوانے کا پتہ:

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی





”زندگی پورے من کے ساتھ گزارنی چاہیے۔“

میں نے اپنے سامنے کھلی کتاب میں سے یہ جملہ پڑھا۔ مجھے کتابوں کا شوق نہیں ہے، یہ تو زرفشاں کا شوق ہے۔ وہی شاید پڑھتے پڑھتے کتاب پوں ہی کھلی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور پتا نہیں کیوں میری نظریں اس جملے پر ٹھہر گئیں۔

ناولٹ

میں نے اسے پڑھا اور اپنے آپ سے پوچھا ”کیا میں نے زندگی پورے من کے ساتھ گزار لی ہے؟“ میں ایک کامیاب شخص ہوں۔ میں نے جو چاہا وہ حاصل کر لیا۔ اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں بہت خوش قسمت ہوں تو شاید کچھ غلط نہیں کہتے۔ میں مفعول حیدر، حیدر شاہ کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک مجھے بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی، پھر پتا نہیں کیوں میں اس جملے پر اٹک گیا ہوں اور مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے زندگی پورے من کے ساتھ نہیں گزار لی۔ کہیں تو کچھ کمی تھی، میری زندگی میں جو مجھے ایسا لگ رہا ہے۔

ہاں شاید محبت کی..... ایک مطمئن پرسکون زندگی۔

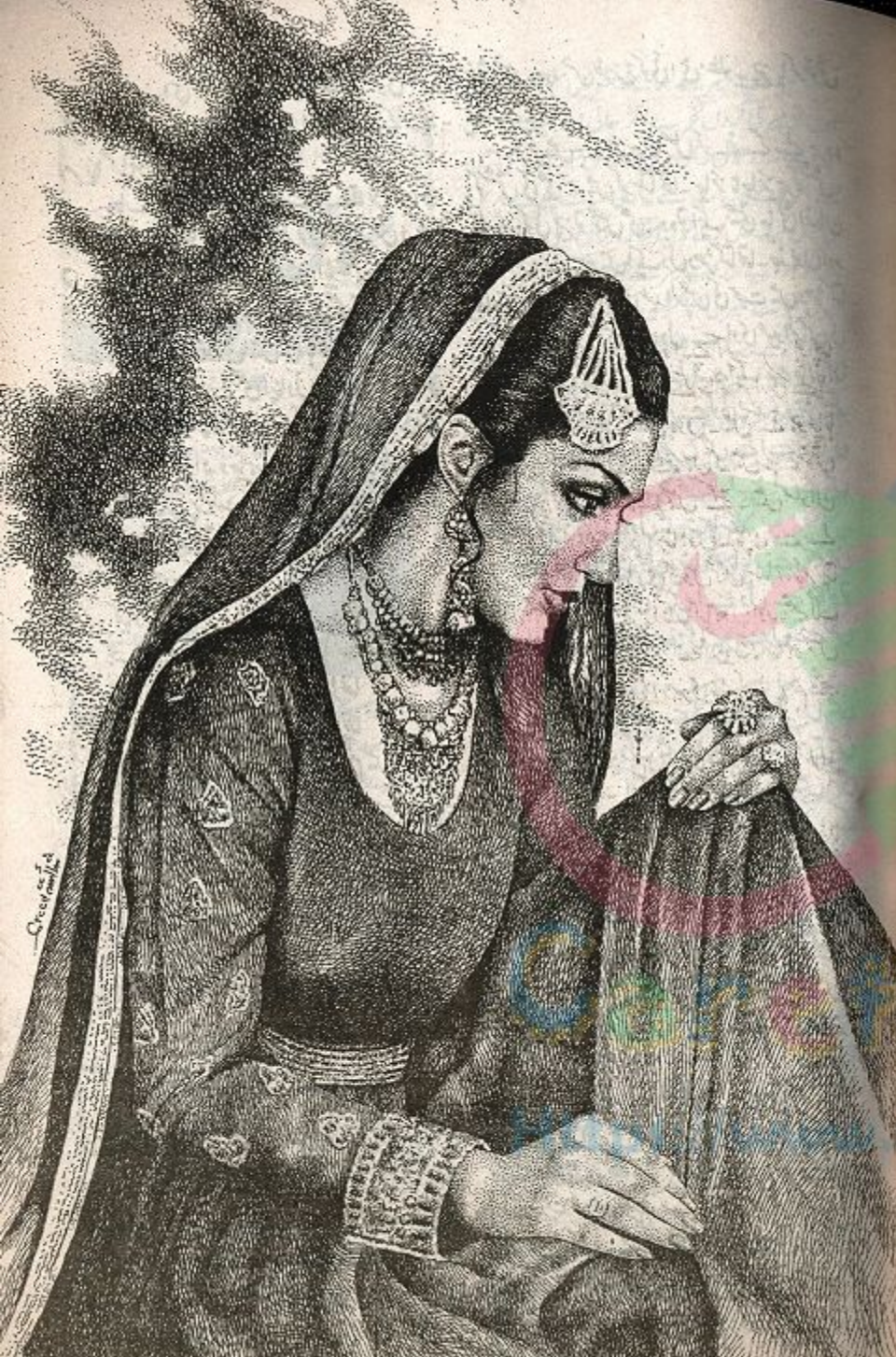
لیکن اس مطمئن، پرسکون زندگی میں محبت تو کہیں بھی نہیں تھی۔ تو کیا میں نے شادی شدہ زندگی کے یہ اٹھارہ سال بغیر محبت کے گزار دیے۔

کیا میں ان اٹھارہ سالوں میں زرفشاں سے محبت نہیں کر سکا اور یہ اٹھارہ سال جیت کے نشے میں گزار دیے۔ زرفشاں کو ہراوئے، اسے جیت لینے کی خوشی میں محبت تو کہیں بھی نہیں تھی۔

محبت تو میں نے صرف کوئل رضا سے کی تھی۔ نیلی آنکھوں والی بے حد خوب صورت، اپنے نام کی طرح ہی نرم و نازک کوئل رضا جسے پہلی بار دیکھتے ہی میں اپنا دل اس کے قدموں میں ہار بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ بابا کے بہت گہرے دوست سید رضا گیلانی کی بیٹی تھی۔ کرئل رضا نے ریٹائرمنٹ کے بعد





ہمارے قریب اسی کالونی میں گھر لیا تھا۔ مختصر سی فیملی تھی، ایک بیٹا ایک بیٹی۔ بیٹا ہائر ایجوکیشن کے لیے امریکا گیا ہوا تھا۔

باپانے ان کے یہاں شفٹ ہوتے ہی ان کی دعوت کی تھی اور پہلی بار میں نے کوئل کو تب ہی دیکھا تھا۔ کوئل نے میری ہی یونیورسٹی میں ایڈمنسٹریشن لیا تھا اور مجھ سے ایک سال جونیئر تھی۔ وہ ایسی تھی کہ اس سے محبت کی جاتی۔ یونیورسٹی میں کئی ہاتھ اس کی طرف بڑھے تھے لیکن اس نے بھی اپنا دل میرے سامنے ہی بارا تھا۔ میں بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ اللہ نے مجھے جی بھر کر نوازا تھا۔ مردانہ وجاہت تو مجھ پر ختم تھی۔ میرا دوست علی ہمیں پرفیکٹ کپل کہتا تھا۔ ہمارا بہت سا وقت اکٹھا ہی گزرتا تھا۔

کیا حسین دن تھے وہ  
کیا وقت تھا

جب وہ پہرے میرے پاس رہا کرتا تھا میں اسے پیار سے باتوں کی کہا کرتا تھا اس کی آواز پہ میں ہر روز چپا کرتا تھا جانے کیوں چھوڑ گیا وہ مجھے دشت غم میں

لیکن اس نے کہاں مجھے چھوڑا تھا۔ یہ تو میں تھا جس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ہاں میں نے خود اپنی محبت سے منہ موڑ لیا تھا۔ حالانکہ ہماری راہ میں تو کوئی ظالم سماج بھی نہیں تھا۔ میں نے بابا کو اپنی پسند بتادی تھی، نہ انہیں اعتراض تھا، نہ ماما کو اور یقیناً کوئل کے مام ڈیڈ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ پھر بھی.....

پھر بھی میں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ میں صفوان حیدر، سدا کا خود پسند اور نا پسند۔

میں نے کوئل رضا کے بجائے زرفشاں عباس سے شادی کر لی۔ زرفشاں جو میری محبت نہیں تھی لیکن پھر بھی اسے حاصل کرنے کے لیے میں نے سر دھڑکی بازی لگادی اور اپنی تمام توانائیاں اسے حاصل کرنے میں لگادیں اور آخر اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اپنی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں خوش نہیں یا مجھے اس طرح کہنا چاہیے کہ میں اس طرح

خوش نہیں ہوا جس طرح کوئی اپنی مطلوبہ چیز پا کر خوش ہوتا ہے۔

آخر میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے ہر وہ کوشش کی تھی جو میں کر سکتا تھا۔ جائز ناجائز ہر کوشش، لیکن وہ کوئی چیز تو نہیں تھی۔ وہ تو ایک جیتی جاگتی انسان تھی، جس کے سنے میں ایک دل دھڑکتا تھا۔ جذبول اور خواہشات سے پر، ہادی عبدالرحمن کی محبت میں دھڑکتا دل۔ میری قربانی بھی جس دل سے ہادی عبدالرحمن کی محبت نہیں نکال سکتی تھی۔ میں نے اسے ایک بے جان ٹکڑا سمجھا تھا۔ جس طرح میں بازار سے کوئی پسندیدہ چیز مہنگے داموں بھی خرید لیتا تھا، اسی طرح میں نے اسے بھی اپنی محبت کی قیمت دے کر اپنے گھر بلکہ اپنے کمرے میں سجالیا تھا لیکن کبھی اپنے دل میں نہ جاسکا۔

دل میں تو ہمیشہ کوئل رضا دھرتا مارے، مسکراتی رہی، چڑاتی رہی۔ ہاں ہمیں اپنے دل سے نکالو تو جانیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی میرے دل سے نکل ہی نہیں سکی۔

زرفشاں ٹھیک کہتی ہے کہ جی محبت تو دل میں اتر جاتی ہے۔ رگ رگ میں سما جاتی ہے۔ روح میں کھب جاتی ہے۔ لاکھ نکالو نہیں نکلتی، تو میں بھی زرفشاں سے محبت نہیں کر سکا اور نہ ہی زرفشاں کے دل میں کبھی جگہ بنا سکا۔ وہاں تو پہلے ہی ہادی عبدالرحمن کا قبضہ تھا کہ میں زرفشاں عباس کی نظروں میں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے ایک دھوکے باز اور فریبی کے جس نے اپنی انا کی خاطر چاروں طرف برباد کیے تھے۔

میں جو سمجھتا تھا کہ میں نے اس پر احسان کر کے اسے خرید لیا ہے۔ اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن میں نے اٹھارہ سال ایک غلط فہمی بلکہ خوش فہمی میں گزار دیے۔ کہ وہ جو ہر وقت میرے سامنے لگا ہوا جھکائے رکھتی ہے۔ اس لیے کہ احسان مندی اور محبت کے بوجھ سے یہ نظریں جھکی رہتی ہیں۔ اس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہی نہیں۔ ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔

وہ جب میرے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی ہوتی تو میری گردن فخر سے اکڑ جاتی اور جیت کی خوشی میرے اندر دھماکے ڈال دیتی اور اس شور میں کبھی میں نے اس کے جذبات سے عاری سیاٹ چہرے پر غور ہی نہیں کیا۔ میں نے تو یہ اٹھارہ سال اپنی سچ کے زعم میں گزار دیے اور محبت میرے اندر بین کر لیتی رہی لیکن میری انا نے میری سماعتوں تک یہ بین کیجئے ہی نہ دیے اور اس نے ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی نظریں اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ ورنہ میں دیکھ پاتا کہ ان نظروں میں میرے لیے احسان مندی اور محبت کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ترس ہے، تاسف ہے، ہوردی ہے اور شاید کبھی بھی میرے لیے تسخیر بھی ہوتا ہوگا لیکن میں کبھی جان ہی نہ پایا اور کیسے جان پاتا اس نے بھی مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

لیکن آج میں نے اس کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ تاسف، ہوردی، ترس، تسخیر..... ہاں سب کچھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ میرے لیے جانے لے کر آئی تھی تو میں نے اپنے سامنے پڑی کتاب کو دیکھا تھا۔

یہ لکھنے والے بھی پتا نہیں کیا کیا کچھ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں روح و دل اور جسم کا سنگم نہ ہو۔ وہاں زندگی پورے من کے ساتھ نہیں گزرتی۔ زندگی پورے من کے ساتھ نہ اترنا چاہیے۔

پتا نہیں یہ جملہ کیوں میرے ذہن کے میں چپک کر رہ گیا تھا اور میں اس سے بے اختیار پوچھ بیٹھا تھا کہ.....

”کیا اس نے زندگی پورے من کے ساتھ گزار دی ہے۔“ اور میرے سوال کے جواب میں اس نے اٹھارہ سال میں پہلی بار میری طرف نظریں اٹھائی تھیں اور میری نظروں میں جھانکتے ہوئے جو انکشاف کیا تھا اس نے مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں بھر بھری مٹی کا ڈھیر ہوں، جیسے ایک دم کوئی اٹھارہ منزلہ پلازہ گر گیا ہو اور میں اس

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے  
سے بال اکڑا ہے۔

بالوں کو خشک اور چھلکا دیتا ہے۔

مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے

یکساں مفید۔

ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیار کی کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ کوئی مقدس شے تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں ایک دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کرنا ہی میں خریدنا جاسکتا ہے، ایک بول کی قیمت صرف 80/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے ڈسٹری بیوٹر کر جیٹر ڈسٹری بیوٹر سے منگوانے والے کسی آؤ اس حساب سے سمجھائیں۔

2 بٹلوں کے لیے 350/- روپے

3 بٹلوں کے لیے 500/- روپے

6 بٹلوں کے لیے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھرنے کے لئے ہمارا ہتھ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگریب مارکیٹ، سیکٹر 4، جٹان روڈ، کراچی  
دستخط خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگریب مارکیٹ، سیکٹر 4، جٹان روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈسٹری بیوٹ، 37- اورنگریب مارکیٹ، کراچی

فون نمبر: 32735021



کے بلے کے نیچے دب گیا ہوں۔ اس کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ میری آنکھوں سے جیسے چپک کر رہ گئی ہے۔ ہاں! جب اس نے اپنی بات مکمل کر کے میری طرف دیکھا تھا تو اس کے لبوں پر ایسی ہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے رنگ میں کوئی باکسر اپنے حریف کو شکست دینے کے بعد مسکرا کر دیکھے۔ اس نے بھی تو ایسے ہی دیکھا تھا مجھے۔

میری بیوی زرفشاں نے..... اور میں نے زرفشاں کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا حالانکہ میں نے اس سے بھی محبت نہیں کی۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی اس سے چڑ اور ضدھی۔

وہ میرے چچا عباس کی بیٹی تھی۔

☆☆☆

عباس چاچو بابا سے دس سال چھوٹے تھے اور بابا ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ عمر میں اگرچہ صرف دس سال کا فرق تھا لیکن بابا ہمیشہ انہیں عباس بیٹا کہہ کر بلاتے تھے۔ عباس چاچو کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور بابا نے ان کی پوری حمایت کی تھی۔ حالانکہ دادا جان چاہتے تھے وہ ایم بی اے کر کے بزنس میں ان کا اور بابا جان کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹروں کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ صبح وشام وقت بے وقت مریضوں میں گھرے رہو۔ لیکن پھر بابا جان کے اصرار پر انہوں نے چاچو کو اجازت دے دی اور ہاؤس جاب کرنے کے بعد چاچو نے نوکری کر لی تھی اور ان کی پسند سے ان کی شادی صبا چچی سے ہو گئی تھی۔ جو بابا اور ان کی کرن تھیں۔

بابا چاہتے تھے کہ وہ لاہور آجائیں اور اپنا کلینک کھول لیں لیکن چاچو ابھی گورنمنٹ کے اسپتالوں میں نوکری کر کے اپنا تجربہ بڑھانا چاہتے تھے اور بابا نے ان کی کسی بات سے بھی انکار نہیں کیا تھا۔ سو وہ صبا چچی اور زرفشاں کے ساتھ ملتان میں رہتے تھے جہاں انہیں نوکری ملی تھی۔ لیکن وہ مہینے میں دو تین دن کے لیے ضرور آتے تھے۔

اور وہ تین دن جیسے بابا مجھے بھول ہی جاتے تھے۔ میں جو بابا کا بے حد لاڈلا تھا، مجھے لگتا جیسے میں اگنور ہو رہا ہوں، چاچو کی بیٹی زرفشاں ہر وقت ان کی گود میں ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا وہ جب بھی آتی ہے میری جگہ لے لیتی ہے۔ میں کئی بار سب کی نظریں بچا کر اس کو چٹکی کاٹ لیتا۔ وہ ردی تو بابا بے چین ہو جاتے اور میں جل کر راکھ ہو جاتا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہتا کہ اگلے ماہ چاچو کو چھٹی نہ ملے۔ یہ نہیں تھا کہ چاچو کے آنے پر بابا مجھے بالکل اگنور کر دیتے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ چاچو اور وہ میری محبتوں میں حصہ بٹانے آگئے ہیں۔

لیکن میری دعائیں قبول نہیں ہوئی تھیں۔ زرفشاں اور چاچی ہمیشہ کے لیے گیلانی ہاؤس میں آگئی تھیں۔ میں سات سال کا اور زرفشاں چار سال کی تھی، جب عباس چاچو کا انتقال ہو گیا۔ وہ حسب معمول دو تین دن کی چھٹی گزارنے گھر آ رہے تھے کہ ایک ٹرک نے ٹکر مار دی، چاچو تو وہیں پر انتقال کر گئے تھے۔ صبا چاچی زخمی تھیں البتہ زرفشاں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

اس حادثے نے گیلانی ہاؤس کو بلا ڈالا تھا۔ بابا تو جیسے پاگل سے ہو گئے تھے۔ دیواروں سے ٹکرس مارتے، چیمیں مار مار کر روتے اور عباس چاچو کو آوازیں دیتے تھے جب کہ دادا جان اور دادی جان نے بڑے حوصلے سے اس صدمے کو برداشت کیا تھا۔ آہستہ آہستہ بابا بھی سنبھل گئے تھے۔ چاچی بھی ہسپتال سے گھر آگئی تھیں لیکن زرفشاں کو ماما ہی سنبھالتی تھیں بلکہ وہ رات کو بھی ماما کے پاس ہی سوئی تھی۔ اس نے اس بار میرے بابا پر ہی نہیں ماما پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور میں جل جل کر کباب ہوا جاتا تھا۔ بابا کو تو جیسے زرفشاں کے سوا اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

زرفشاں چاچو سے بہت مشابہت رکھتی تھی ویسی ہی گھور سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، ویسی ہی اونچی کھڑی ناک اور ہونٹوں کے خم بھی بالکل چاچو جیسے

تھے تو چاچو کے دیوانے بابا اس کے بھی دیوانے تھے۔ آٹس سے آنے کے بعد وہ ذرا سی دیر نظر نہ آتی تو وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ خود بخود وہ بڑے بابا سے صرف بابا ہو گئے تھے۔ جب وہ انہیں بابا کہتی تو میرے سینے میں آگ سی جل اٹھتی تھی۔ میں سوچتا تھا، وہ صرف میرے بابا ہیں اور اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ میرے بابا کو بابا کہے لیکن میرے سوچنے اور کڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ انہیں بابا ہی کہتی رہی اور ماما بابا دونوں کی محبتوں میں میری حصہ دار بن گئی تھی کہ جسمانی طور پر تو صبا چاچی ٹھیک ہو گئی تھیں لیکن ذہنی طور پر ٹھیک ہونے میں انہیں وقت لگا تھا اور زرفشاں کی ساری ذمہ داری ماما نے ہی اٹھا رکھی تھی۔ دادی تو خود بیمار رہتی تھیں۔ اسے کیا سنبھالیں، کچھ وقت گزرا چاچی ٹھیک ہو گئیں تو زرفشاں کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اس روز میں بہت خوش ہوا تھا اور ضد کر کے ماما کے پاس ہی سویا تھا۔ پھر صبا چاچی کے والدین عدت کے بعد انہیں لینے آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صبا چاچی کی کہیں اور شادی کر دیں۔ صبا چاچی جوان تھیں، خوب صورت تھیں اور یہ ان کا حق تھا۔ دادا دادی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

”زری تو آپ فکر نہ کریں، وہ ہمارے پاس رہے گی۔ اچھا رشتہ ملے تو ضرور شادی کر دیں بلکہ میں خود اپنی بیٹی کو رخصت کر دوں گی۔“

وہ دادی کی پھانچ تھیں تو دادی کو ان سے بیٹیوں کی طرح ہی محبت تھی لیکن صبا چاچی نے انکار کر دیا تھا اور گیلانی ہاؤس میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سب نے ہی سمجھایا تھا لیکن ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

یوں زرفشاں ہمیشہ کے لیے گیلانی ہاؤس میں رہ گئی تھی اسے اس گھر سے نکال نہیں سکتا تھا کہ یہ گھر اس کا بھی اتنا ہی تھا جتنا میرا۔ سو میں اپنے دل کی بھڑاس سے تنگ کر کے نکالتا تھا حالانکہ میں اب سوچتا ہوں کہ وہ بہت بے ضرر تھی، ملنسار اور خاموش تھی۔ میں جتنا بھی تنگ کرتا کسی سے میری شکایت نہ

کرتی۔ پھر بابا نے اسے میرے اسکول میں ہی داخل کر دیا تھا حالانکہ میں نے بہت احتجاج کیا تھا اور ماما سے بار بار کہا تھا کہ زرو کسی اور اسکول میں داخل کروائیں لیکن ماما نے میری بات پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا یوں اب میں اسے اسکول میں بھی تنگ کرتا تھا۔ کبھی جب وہ اپنی کلاس میں نہ ہوتی تو اس کا لٹچ باکس نکال کر پھینک دیتا، کبھی کاپیاں بھاڑ دیتا، کتا میں گندی کر دیتا لیکن اس نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کبھی پوچھا تنگ نہیں کہ میں اس طرح کیوں کرتا ہوں۔ بس بابا سے کہہ کر نئی کاپیاں اور کتابیں منگوائیں۔

میں جانتا تھا کہ اسے پتا ہے کہ یہ سب کچھ میں کرتا ہوں۔ گھر میں بھی میرا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس کے پسندیدہ کھلونے توڑ دیتا، اسے دھکا دے دیتا۔ ایک بار میں نے اسے جھولے سے بھی گرا دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ تنگ آ کر چاچی کے ساتھ اس گھر سے چلی جائے، اپنے نانا کے گھر کہیں بھی۔ لیکن وہ گیلانی ہاؤس میں ہی رہی۔

بابا اس کے ایک آنسو پر تڑپ اٹھتے تھے۔ ایک بار میں نے اس کی ایک خوب صورت گڑیا کے بال کاٹ دیے اور بازو توڑ دیا، چہرے پر مار کر سے لکیریں ڈال دیں تو پہلی بار میں نے اسے کسی چیز کے ٹوٹنے پر روتے دیکھا تھا۔ تب وہ چھ سال کی تھی اور میں نو سال کا۔ بابا نے اسی وقت گھر میں قدم رکھا تھا اسے روتے دیکھ کر انہی قدموں واپس پلٹ گئے تھے اور جب وہ دو تین گھنٹوں بعد واپس آئے تو ان کے پاس بالکل ویسی ہی گڑیا تھی۔ نہ جانے کتنی مارکیٹوں کی خاک چھان کر انہیں بالکل ویسی ہی گڑیا ملی تھی۔ انہوں نے زرفشاں کو گود میں بٹھالیا تھا حالانکہ اس وقت تک وہ چپ ہو چکی تھی۔ چاچی نے اسے بہلایا تھا لیکن بابا نے اسے بے تحاشا پیار کیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اور اس کی پیشانی پر۔

”میرے بچے تم پھر اس طرح کبھی نہ رونا۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں۔“



بابا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”آپ کیوں روتے ہیں بابا؟“ وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے گی۔

”میں اس لیے تو نہیں روتی تھی کہ میری گڑیا کسی نے توڑ دی۔ میرے پاس تو اور بھی بہت ساری ہیں۔ ماما کی، ماموں کی، نانا اور آپ کی دلائی ہوئی۔ میں تو اس لیے روتی تھی کہ وہ گڑیا مجھے چھوئے بابا نے دلائی تھی۔ میرے بابا لائے تھے نانا سے میرے لیے اور میں اسے ہمیشہ ایسے ہی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ کوئی میرے سارے کھلونے، ساری گڑیا خراب کر دیتا پر بابا والی گڑیا کو کچھ نہ کہتا۔“

وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ ٹوٹی ہوئی خراب گڑیا اب بھی اس نے اٹھا رکھی تھی۔

”میری جان!“ بابا بھی جیسے تڑپ اٹھے تھے۔

”کس نے..... کس نے خراب کی یہ گڑیا..... صبا یہ عباس خرید کر لایا تھا میری بچی کے لیے۔ پتا نہیں کس شوق سے، کس چاہ سے خریدی ہوئی اس نے۔ میری بچی کے لیے، میری زر کے لیے یہ کتنی قیمتی، کتنی عزیز بھی اور..... بتاؤ کس نے.....“

صبا چچی اور زرفشاں دونوں ہی جانتی تھیں کہ میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن زرفشاں خاموش رہی۔ صبا چچی نے نرمی سے کہا تھا۔

”چھوڑیں بھائی جان! اب جس نے بھی خراب کی۔ انسان مر جاتے ہیں یہ تو معمولی سی گڑیا ہے۔“

”لیکن زر کے لیے یہ معمولی نہیں تھی صبا! آخر گھر میں کون ایسا ہے؟“

ان کی نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔ میں نے فوراً نظریں جھکا لی تھیں پھر ہمارے خانہ ماں، چاچا کی بیٹی صفوی طرف گئی تھیں جو شاید زرفشاں سے کھیلنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

”تم نے؟“

انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ فوراً ہی بول اٹھی تھی۔

”میں نے نہیں صاحب جی! صفوان بھیا نے..... یہ ہی زر کی چیزیں اور کھلونے خراب کرتے ہیں۔“

اور میرا جی چاہا تھا کہ سمجھ کر اسے تھپڑ لگاؤں لیکن اس سے پہلے ہی بابا نے زرفشاں کو گود سے اتار کر میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا تھا اور اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ مجھ پر اٹھتا، چاچی نے یک دم مجھے ایک ہاتھ سے پیچھے کیا تھا۔

”کیا کرتے ہیں بھائی صاحب! پچھنی ہے نا۔“

وہ بے حد غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے اور نو سالہ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے بہت بری طرح ڈانٹا تھا۔ لیکن پھر اسی رات انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پیار بھی کیا تھا اور بہت دیر تک مجھے سمجھاتے رہے تھے۔

”زر میری چھوٹی بہن ہے اور مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے، نہ کہ تنگ کرنا چاہیے اور یہ کہ اگر آج کے بعد میں نے اسے تنگ کیا یا اس کی کسی چیز کو خراب کیا تو وہ زندگی بھر مجھ سے بات نہیں کریں گے اور نہ میری شکل دیکھیں گے۔“

اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ بابا میری شکل نہ دیکھیں، مجھ سے بات نہ کریں۔ اس لیے اس روز کے بعد میں نے بھی اس کا کوئی کھلونا خراب نہیں کیا، نہ ہی کبھی اسے تنگ کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ میرے دل میں موجود اس کے لیے جلن ختم ہو گئی تھی بلکہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو میں اس کے کھلونے توڑ پھوڑ کر اس کو تنگ کر کے، تکلیف پہنچا کر دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا لیکن اب اندر ہی اندر کھٹا، جلتا رہتا اور دھواں اندر ہی اندر اٹھ کر میرے دل کو سیاہ کر رہا تھا۔ اب میں اس سے بات نہیں کرتا تھا، اس کے ساتھ کھیلتا بھی نہیں تھا لاکھ کی بار اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے ہمیشہ ہی اسے ڈانٹا تھا۔

☆☆☆

بچپن گزرا۔ لڑکپن بھی گزر گیا۔ لیکن میرے دل میں اس کے لیے جو جلن تھی، وہ کبھی ختم نہ ہوئی۔ بابا ہی نہیں ماما بھی اس پر فدا ہوتی رہتی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی تھی یا ماما بابا مجھے اگور کر رہے تھے لیکن مجھے اپنی محبتوں میں اس کی شراکت گوارا نہ تھی لیکن میرے جلتے اور کڑھنے سے کچھ نہ ہوا، وہ اسی طرح سب کی لاڈلی بنی رہی۔

حتیٰ کہ میرے خیال میں بھی اسے بہت پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ وہ ذہین تھی، ہمیشہ اپنی کلاس میں پوزیشن لیتی۔ گندی رنگ، مناسب نقوش اور قد و قامت، بڑی بڑی گھور سیاہ آنکھوں والی وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔

اس میں بلا کا اعتماد تھا۔ سب ہی اسے پسند کرتے تھے اور وہ سب کے لیے بہت نرم خواہر خوش اخلاق تھی لیکن مجھے تو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔

ماما کی تو وہ پسندیدہ تھی۔ وہ اکثر میرے سامنے اس کے سلیٹے اور ذہانت کی تعریف کرتیں۔ اس کی کوکنگ کو سرگوشیاں۔ اپنے ساتھ اس کی محبت کا ذکر کرتیں۔ کبھی کبھی یہ بھی تمہ دیتیں کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ زرفشاں ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ میں ان کا مطلب سمجھتا تھا لیکن نظر انداز کر دیتا تھا کیونکہ میں کوئل سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے بابا کو بھی بتا دیا تھا کہ کوئل رضا کو پسند کرتا ہوں۔ اگرچہ اس سے محبت کرنے کے باوجود میں نے کبھی کوئل سے یہ نہیں کہا تھا کہ آئی کیو یو اور نہ ہی کبھی کوئل نے اس طرح کی بات کی تھی لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔

میں نے سوچا تھا اچانک رشتہ بھیج کر سر پرانز دول کا لیکن اس سے پہلے ہی زرفشاں نے میری اتار پر پاؤں رکھ دیا۔ میں ماما کی تلاش میں صبا بچی کے پورٹن کی طرف گیا تھا لیکن پھر اپنا نام سن کر بالکل غیر ارادی طور پر ان کے لاؤنج کے باہر ہی رک گیا تھا۔

”کون صفوان؟“

یہ زرفشاں کی آواز تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی! صفوان کے ساتھ شادی..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تمہاری تائی جان کی خواہش تھی زر! تمہاری تائی جان اور بابا بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔ ہمیشہ تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔“ شاید ماما نے ایسی کوئی بات کی ہو چاچی سے ورنہ بابا تو جانتے ہی تھے کہ میں کوئل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

”آپ کی بات تو ٹھیک ہے امی! لیکن صفوان مجھے پسند نہیں ہے امی..... میں.....“

وہ ذرا سا جھجکی بھی شاید۔

”میں ہادی کو پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

اس نے اپنے ماموں کے بیٹے کا نام لیا تھا۔

”لیکن اگر بابا جان اور آپ کو ہادی پسند نہیں ہے تو جہاں بھی میری شادی کر دیں، میں بابا جان کی بات سے انکار نہیں کروں گی لیکن صفوان سے تو مر کر بھی شادی نہیں کروں گی۔ زہر لگتا ہے وہ مجھے سخت نا پسند کرتی ہوں میں اسے۔“

میں وہاں سے واپس پلٹ آیا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ یہ وہ لڑکی کہہ رہی تھی جسے میں نے ساری زندگی ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی جو میری نظروں میں کچھ بھی نہیں تھی۔ عام سی شکل و صورت کی عام سی لڑکی سوائے ذہانت کے اس میں تھا ہی کیا۔ لیکن اس عام سی لڑکی نے مجھے..... صفوان حیدر کو نا پسند کیا تھا۔

وہ مجھ سے شادی سے انکار کر رہی تھی۔ میری اتار پر سخت چوٹ پڑی تھی۔ میں اسے زیر کرنا چاہتا تھا، اس مقام پر لانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے میری محبت کا اعتراف کرے۔ وہ میری محبت میں اتنی شدت سے مبتلا ہو جائے کہ میرے بغیر جی نہ سکے۔ وہ میرے سامنے روئے، گڑگڑائے اور مجھ سے التجا کرے کہ میں اسے اپنی زندگی میں شامل کر لوں اور



اسے اپنی رفاقت بخش دوں اور پھر میں اسے ٹھکرا کر اس کی بے بسی کا تماشا دیکھوں۔ اس سے کہوں میں تو کوئل رضا سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اپنی ذات پر عجیب سا زعم تھا کہ میرا ذرا سا التفات اسے میرے سامنے جھکا دے گا۔

میں ساری رات یہی سوچتا ہوا سوپا تھا۔ مجھے اسے اپنے سامنے جھکا تھا۔ اگر میں اپنا تجزیہ کرتا تو شاید وہ اپنے رویے میں حق بجانب بھی کہ میں نے کبھی اس کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھا تھا لیکن میں نے اپنے رویے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ میری تو زنجی انا کر لاکر لاکر مجھے اس سے بدلہ لینے پر اکساری تھی اور صبح جب میں اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تو وہ اپنے پورشن سے نکل کر گیٹ کی طرف جانی دکھائی دی تھی۔ مجھے کل رات خود سے کیا ہوا عہد یاد آیا تھا۔

”ہیلو ڈیر کزن! کدھر کے ارادے ہیں؟“  
اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔  
”یونیورسٹی جاری ہوں۔“  
”کیسے جاؤ گی؟“

میں ایک قدم بڑھا کر اس کے ہم قدم ہوا تھا۔  
”جیسے روز جاتی ہوں۔“  
میں دل ہی دل میں تملایا لیکن لیوں پر مسکراہٹ سجائی۔

”لیکن آج شیر خان چاچا تو چھٹی پر ہیں۔“  
”تو بابا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“  
”لیٹ نہیں ہو جاؤ گی، بابا نے تو ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں، تمہیں بھی ڈراپ کروں گا۔“

”ٹوٹھلس۔ میں دین سے چلی جاؤں گی۔“  
وہ کچھ حیران ہی مجھے دیکھ رہی تھی۔  
”آ جاؤ یا! اتفاق سے ادھر سے ہی گزرتا ہے مجھے۔“

میں نے لہجے میں بے تکلفی پیدا کی۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ کچھ عجیبی ہوئی

سی بیٹھ گئی اور اپنا شولڈر بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔  
”پڑھائی کیسی جاری ہے تمہاری؟“  
میں نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے ذرا سا رخ اس کی طرف موڑ کر پوچھا تھا۔  
”ٹھیک ہی جاری ہے۔“

وہ بے حد سنجیدہ سی بیٹھی تھی۔ مجھے دل ہی دل میں اس کی سنجیدگی پر ہی آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ کہیں مہترم مارے حیرت کے کوچ ہی نہ کر جائیں اور پھر یونیورسٹی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی تھی البتہ جب وہ گاڑی سے اترتی تو میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

”او کے زرا دیسے میں تقریباً روز اسی راستے سے آفس جاتا ہوں۔ تمہیں بھی ڈراپ کر دیا کروں گا۔ واپسی پر ڈرائیور پک کر لے گا۔“

اس کی آنکھوں میں واضح حیرت نظر آئی تھی۔  
زرا سے صرف بابا اور بھی کبھار چچی کہہ کر بلاتی تھیں۔  
”لیکن اس راستے سے تو آپ کا آفس خاصا دور پڑتا ہے۔“

اس کی ذہانت پر مجھے کوئی شبہ نہ تھا۔  
”ہاں دور پڑتا ہے لیکن مجھے اسی راستے سے ایک دوست کو پک کرنا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی گاڑی فروخت کر دی ہے، نئی لینی ہے اسے۔“ مجھے فوراً ہی بہانا سوچا تھا۔

”بابا نے کہا ہوگا۔“  
اس نے اندازہ لگایا تھا۔  
”نہیں، البتہ بابا نے یہ ضرور بتایا تھا کہ تمہیں بتا دوں ڈرائیور چھٹی پر ہے تو وہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔“

”جھینکس۔“  
وہ مسکرائی تھی اور میں ویلکم کہہ کر گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔

آفس جا کر میں نے فون میز پر رکھا تو دیکھا کہ کوئل کی بے شمار کال آئی ہوئی تھیں اور اتنے ہی سچ

بھی تھے۔ میں نے فوراً ہی نمبر ملایا تھا، وہ سخت خفا تھی۔

”مت بات کرو مجھ سے صفی!“  
”سوری یار! میں نے رات کو فون ساکنٹ پر کر کے دراز میں رکھ دیا تھا کیونکہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی، جلدی ہو گیا تھا۔“

اور وہ فوراً مان گئی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی معصوم سی، کچھ دیر باتیں کر کے میں نے فون بند کر دیا اور آئندہ کے متعلق پلاننگ کرنے لگا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے اسے اپنے آگے جھکے ہوئے دیکھنا تھا۔ وہ مجھے عقول پریدہ کر دیکھ کر رہی تھی۔ میں اسے چونکا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مجھے بہت ہولے ہولے صبر کے ساتھ اس پر مہربان ہونا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن یونیورسٹی جاتے ہوئے ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ بھی بھی اس پر ایک گہری نظر ڈال لیتا تھا۔ ایک روز میں اسے آفس کریم کھلانے لے گیا۔ مجھے پتا تھا اسے آفس کریم بہت پسند ہے۔ چھٹی کا دن تھا، وہ میری آفر پر حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ میں آفس کریم کھانے جا رہا تھا، بابا نے کہا تمہیں بھی اس جگہ کی آفس کریم بہت پسند ہے، تمہیں بھی کھلا دوں۔“

میرا خیال تھا کہ شاید وہ میرے ساتھ نہ جائے آخر اس سے پہلے تو ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بابا کا نام لیا تھا لیکن اس نے پھر بھی انکار کر دیا تھا۔

”میرا اس وقت موڈ نہیں ہے، یوں بھی اس وقت میرا پسندیدہ پروگرام چل رہا ہے۔“

”چلی جاؤ زرا! آؤ ٹنگ ہو جائے گی تمہاری بھی۔ کبھی گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں ہو۔“

صبا چاچی نے بھی اصرار کیا تو وہ جیسے مجبوراً انھی تھی۔

لیکن اس روز آفس کریم پارلر میں اپنی اپنی پسندیدہ آفس کریم کھاتے ہوئے ہم نے بہت ساری

باتیں کی تھیں اور ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار گر گئی تھی۔ میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا شروع شروع میں وہ میرے التفات پر حیران ہوتی تھی لیکن پھر اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنی یونیورسٹی کی باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ میں ہر روز ایک لمبے راستے سے آفس جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”کیا آپ کی دوست نے ابھی تک گاڑی نہیں لی۔“

”نہیں، لے لی ہے لیکن اب اچھا نہیں لگتا کہ میرے گھر میں ہوتے ہوئے تم ڈرائیور کے ساتھ جاؤ۔“

میں نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں اب کبھی کبھی اس کی تعریف بھی کر دیتا تھا، بھی اس کی ذہانت کی، کبھی اس کے لمبے بالوں کی۔ خوب صورت قد و قامت کی اور اس کی محو سیاہ آنکھوں کی جو بالکل چاچو جیسی تھیں لیکن وہ عام لڑکیوں کی طرح شرابی نہیں تھی بلکہ میری تعریف کو اپنا حق سمجھ کر قبول کر لیتی تھی جبکہ کوئل تو میری ذرا سی تعریف پر گلانی ہو جاتی تھی اور میں مہو مت سا اس کے رخساروں پر بکھرتے گلال کو دیکھتا رہ جاتا تھا۔

فاخر میرا دوست جو میری اور کوئل کی محبت سے واقف تھا، اکثر کہتا تھا تمہارا پل بہت شان دار ہوگا، پرفیکٹ جوڑی۔ وہ جیسے بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں نا چاند سورج کی جوڑی تو یہ مثال تم پر فٹ آتی ہے۔ تم دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہو۔

”ہاں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا مہلی! بس تمہارے فائل کے فوراً بعد بابا کو تمہارے گھر بھجوا دوں گا۔“

اور اس کے رخساروں پر شفق ٹار ہوئے لگتی تھی، گھنیری پلکیں جھک جاتی تھیں۔



”نہیں، فوراً بعد نہیں۔ ایک سال تو مجھے خوب گھومنا پھرنا ہے۔ پہلے تو ہم بھائی کے پاس امریکہ جائیں گے، پھر لندن خالہ جانی کے پاس۔ امی کب سے میری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔“  
”اوکے۔“  
مجھے اس کی مرضی کے خلاف کب کوئی بات گوارا تھی۔

☆☆☆

لیکن سال تو کیا دو سال ہونے والے تھے اسے فارغ ہوئے۔ وہ لوگ گھوم پھر کر واپس آ گئے تھے لیکن پتا نہیں کیوں پہلے تو میں آفس کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں بے حد مصروف ہو گیا تھا اور پھر اب یہ ایک نیا پروجیکٹ شروع ہو گیا تھا، جس کا نام تھا زرفشاں۔ اب اس سے فارغ ہو کر ہی کوئل کو پروڈکٹ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سے بہت ٹھوس بہانا کیا تھا اور وہ معصوم سی کوئل رضا میری بات مان بھی گئی تھی۔ اگر تاخیر نہ ہوتی تو میں کوئل رضا کے امریکہ سے واپس آنے کے فوراً بعد ہی اپنا پروڈکٹ بھجوا دیتا تو شاید اتنی بڑی ہار میرا مقدر نہ ہوتی۔ لیکن وہ جب واپس آئی تو میں اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں آفس کی طرف سے سبک پور گیا ہوا تھا۔

شاید اوپر آسمانوں میں میری تقدیر کے پتوں پر کچھ اور لکھا جا چکا تھا۔ اسی لیے تاخیر ہوئی تھی۔ آخر مجھے میرے غرور، میری نفرتوں اور حسد کی سزا بھی تو ملنی تھی۔ کوئل رضا میری اولین محبت، میری شدید چاہت تھی۔

پھر زرفشاں کیا تھی میرے لیے جو میں اس کے پیچھے خوار ہو رہا تھا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ میں تو اسے سرے سے پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ ہوتا ہے نا کبھی بھی آدمی کو کسی سے بلا وجہ نفرت ہو جاتی ہے۔ ضد ہو جاتی ہے۔ تو مجھے بھی زرفشاں سے بلا وجہ ہی ضد ہو گئی تھی۔ میں اسے اس حد تک لانا چاہتا تھا کہ وہ میری محبت میں سر تاپا ڈوب جائے لیکن وہ نہ جانے

کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ میرے ذومعنی فغروں پر مسکرا دیتی بلکہ ایک بار وہ ہنس پڑی تھی۔  
”میں تو آپ کو بہت سڑیل اور کھڑوس سمجھتی تھی صفوان! لیکن لگتا ہے کسی کی محبت نے آپ کو بدل ڈالا ہے۔“  
تب مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوئل کی بات کر رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کا اشارہ اپنی طرف ہے۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

میں نے جیسے اسے نظروں میں سموتے ہوئے کہا تھا۔  
جمال ہم نشین برمن اثر کرد (دوست کے حسن نے مجھ پر اثر کیا ہے)  
اور وہ ہنس دی تھی۔

”محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے صفوان! وہ پتھر سے پتھر اور سخت سے سخت دل کو بدل دیتی ہے۔ وہ آدمی کو نرم خوار عاجز اور فیاض بنا دیتی ہے۔“

وہ جس حوالے سے بات کر رہی تھی میں تب نہیں جانتا تھا اور میں نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ میری محبت میں جلتا نہ ہوئی آخر میں صفوان حیدر کوئی معمولی انسان تو نہ تھا۔ جب میں اس پر اتنا مہربان تھا اس کا اتنا خیال رکھتا تھا تو اسے مجھ سے محبت ہونا ہی تھی۔ میں نے زبان سے کبھی اسے آئی کوئی نہیں کہا تھا لیکن میرا ہر عمل، میرا اسے دیکھنا، اس کی ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جانا۔ اس کا خیال رکھنا، خود دیتا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

ایک روز میں نے اس سے اپنے ماضی کے رویوں کی معافی بھی مانگ لی تھی اور اعتراف کیا تھا کہ بابا کی اس سے محبت کی وجہ سے میں اس سے جلتا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”ہاں میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہاری محبتوں میں جھڑ دار بن گئی تھی تو تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ چڑ ہو گئی تھی تمہیں مجھ سے۔“

میرے اصرار پر وہ مجھے تم کہہ کر بلانے لگی تھی لیکن جو بات میں اسے سمجھانا چاہ رہا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ وہ بات اس نے اب بھی سمجھی کہ اس کی محبت نے مجھے بدل دیا ہے۔

مجھے خود پر اعتماد تھا، یقین تھا کہ ایک روز وہ میرے سامنے ہار جائے گی۔ بس کچھ دنوں کی بات تھی کہ وہ اس مقام پر آ جاتی کہ اپنی محبتوں کا اعتراف کرتی۔ مجھ سے کہتی کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اور تب میں اسے انکار کر دیتا۔ وہی الفاظ اسے لوٹا دیتا جو چاہی سے اس نے میرے لیے کہے تھے۔ میں اسے بتاتا کہ میں تو کوئل رضا سے محبت کرتا ہوں، اس نے میرے رویے کا غلط مطلب لیا ہے۔ میں تو بطور کزن اس کے ساتھ خلوص سے پیش آتا تھا اور کچھ میرا مقصد اپنے ماضی کے برے رویے کی تلافی بھی تھا۔

بس ایسا ہی کچھ سوچ رکھتا تھا میں نے لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔ میں جو ہر روز صبح طویل راستے طے کر کے اسے یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے آفس پہنچتا تھا، اکثر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے پسندیدہ پروگرام دیکھتا تھا جو مجھے بالکل پسند نہیں تھے۔ اسے بھی سچ پر، بھی ڈنر پر، بھی کافی بلانے لے جاتا تھا تو میری یہ ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔

وہ امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی مجھے انتظار تھا کہ گھر میں اس کی شادی کی بات چلے اور وہ..... ہاں وہ کہے کہ وہ میرے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ میں نے ماما سے سنا تھا کہ اس کے ماموں ممانی اس کے رشتے کے لیے بات کرنے آنے والے ہیں۔ ان دنوں میں اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا تھا، اسے ذرا سافلو ہوتا تو کئی گھنٹے اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر سے اس کے لیے دوائی لایا۔ ماما سے سوپ بنوا کر لایا۔ وہ ہنس دیتی تھی۔

”تم بہت بدل گئے ہو صفوان!“

”تم نے ہی تو کہا تھا کہ محبت انسان کو بدل دیتی ہے تو مجھے بھی محبت نے بدل دیا ہے۔“  
اور وہ ہنس دی تھی۔

☆☆☆

اس روز بہت دنوں بعد میں کوئل کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر گیا تھا انکل رضا کی اجازت سے اسے ڈنر پر بھی لے گیا تھا اور میں نے کوئل سے کہا تھا کہ ماما بابا چند دنوں میں ان کے گھر کا قاعدہ میرا پڑ پوزل لے کر آرہے ہیں۔

اس روز ہم دونوں بہت خوش تھے۔ پہلی بار کوئل نے اس روز اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔ میں تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کوئل کو گھر ڈراپ کر کے میں بہت خوش خوش گھر آیا تھا۔ ماما میرے بیڈ روم میں کھانے کا پوچھنے آئی تھیں۔

”کھانا کھا کے آئے ہو مافی یا لگواؤں اور کہاں تھے تم۔ آفس سے آ کر جو عائب ہوئے ہو تو اب آئے ہو۔“

”دوستوں کے ساتھ تھا سوئٹ مام اور ڈنر بھی ان ہی کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نے کھالیا۔“

”ہاں، ہم نے تو کھالیا تھا۔ زرفشاں کے ماموں اور ممانی آئے تھے اس کے رشتے کے لیے۔ ہادی اچھا لڑکا ہے۔ تمہارے بابا نے پہلے ہی صبا کے کہنے پر تحقیق کر لی تھی۔ سو ہاں کر دی انہوں نے۔ میرا تو بہت جی چاہتا تھا کہ ڈرکو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر میں رکھ لوں لیکن تمہارے بابا نے بتایا کہ تم کہیں اور اسٹرنڈ ہو۔ خیر زرفشاں کا نکاح ہو جائے، تو تم ہمیں لے چلو اس لڑکی کے گھر۔“

شاید بابا نے کوئل کا نام نہیں بتایا تھا۔

”اسٹرنڈ سنڈے کو نکاح ہے زرفشاں اور ہادی کا۔ رخصتی تین چار ماہ بعد ہادی کے بڑے بھائی کے آنے پر ہوگی۔ وہ اپنی کمپنی کی طرف سے چھ ماہ کے لیے جرجی گیا ہوا ہے۔“

ماما تو بتا کر چلی گئیں اور میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور وہ جو میں ایک سال دو ماہ دس دن سے



اس کے گرد پروانے کی طرح چکر مار رہا تھا، وہ سب ضائع چلا گیا تھا۔ رائیگاں ہو گیا تھا۔ میں صفوان حیدر جو ذرا کسی لڑکی سے نرمی سے مسکرا کر بات کر لیتا تھا، وہ ہواؤں میں اڑنے لگتی تھی۔

ذرا سا التفات پر رتا تو جان ہی ہارنے لگتی تھی اور یہ زرفشاں کیا چیز تھی کہ وہ مجھ سے، صفوان حیدر سے ذرا سی بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی اس کے کمرے میں جاؤں اور اس کی غرور سے انہی ہوئی گردن کو دبا دوں۔ غصہ، جلن، ہار کا دکھ، حسد نہ جانے وہ کیا جذبہ تھا جس نے مجھ سے وہ کام کروایا جس نے میری محبت مجھ سے چھین لی۔ میری زندگی میں وہ سب کچھ بدل ڈالا جس کی میں پلاننگ کرتا تھا۔ ایک منشی جذبہ مجھ پر حاوی ہو کر میرا سب کچھ چھین کر لے گیا تھا۔ میرے سارے کول جذبوں کو کھا گیا تھا۔ وہ جذبے جو کول رضا کے لیے میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ رات بھر جاگ کر اسے جھکانے کے کئی منصوبے میں نے بنائے اور پھر رد کر دیے۔ آخر کار ایک منصوبے پر میرا دل مطمئن ہو گیا۔ صبح کے وقت مجھے نیند آئی تھی۔ اس لیے دیر سے اٹھا تھا، دن کے گیارہ بج رہے تھے جب تیسری بار ماما مجھے جگانے آئی تھیں۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناصبی! آج آفس نہیں جانا تھا کیا تمہارے بابا بھی تمہارے اتنی دیر تک سونے سے پریشان ہو رہے تھے، ابھی آفس جانے کے لیے نکلے ہیں۔“

”طبیعت ٹھیک ہے بس رات دیر سے سویا تھا اس لیے آٹھ نہیں ٹھکی اور آفس جانے کا بھی موڈ نہیں تھا۔ آپ ناشتا لگوائیں، میں فریش ہو کر کرتا ہوں۔“

ماما کو ٹکی دے کر میں واش روم میں گھس گیا اور جب میں ناشتا کر کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوں ہی بے مقصد مختلف چینل آگے پیچھے کر رہا تھا تو وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر چاچی کے ساتھ لاؤنج میں آئی تھی۔

”تم آج آفس نہیں گئے۔ اٹھے بھی دیر سے

ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔“

اس کی یہ فکر مندی مجھے زہر لگ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“

میں نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف دیکھا۔ نیوٹک دیتے میک اپ میں وہ معمول سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ گالوں پر گلاب کھل رہے تھے یقیناً وہ بہت خوش تھی۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

میں نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

”زری فرینڈ کی شادی ہے، دن کی بارات ہے اور ہی جا رہے ہیں۔“

چاچی جواب دے کر لاؤنج سے باہر نکل گئیں، تو میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

”مارک ہو بہت۔“

”تھینک یو۔“

اس کے رخساروں پر جیسے شفق گہری ہوئی تھی۔

”اب تم کب خوش خبری سنارہے ہو۔“

”بہت جلد۔“

”زیادہ دیر مت کرنا۔“

وہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی کہ چاچی نے اسے آواز دے کر بتایا تھا کہ بھابی جان نے گاڑی بھجوا دی ہے۔ میں کچھ دیریوں ہی ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر باہر نکل کر دیکھا ماما شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ مجھے زرفشاں کے کمرے میں جانا تھا۔ رات کو میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے مجھے زرفشاں کی پنڈرائٹنگ کی ضرورت تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھتا رہا ان کے پورشن میں آیا۔ مجھے بتا تھا کہ بیڈروم کی چابیاں کہاں لگی ہوئی ہیں لیکن مجھے زرفشاں کے کمرے میں نہیں جانا پڑا، اس کی چند کتابیں اور ایک فائل لاؤنج میں ہی سینئر ٹیبل پر پڑی تھیں۔ میں نے اس کی نوٹس والی فائل سے ایک صفحہ نکالا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ماما ابھی تک اپنے کمرے میں تھیں۔

☆☆☆

میں بچپن سے ہی دوسروں کی پنڈرائٹنگ کی

نقل کر لیتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر اور دو تین بار زرفشاں کی پنڈرائٹنگ میں لکھنے کی کوشش کی اور تھوڑی سی کوشش سے ہی میں نے زرفشاں کی تحریر کی ہو، ہنسل اتاری تھی۔

اب میں نے کسی نامعلوم شخص کے نام زرفشاں کی طرف سے سات محبت نامے لکھے تھے، جس کے لیے میں نے عام نوٹس والے کاغذ استعمال کیے تھے۔ مخاطب کا نام لکھنے کے بجائے میں نے ڈیر اور پیارے کا لفظ استعمال کیا تھا البتہ آخر میں تمہاری زرفشاں لکھا تھا۔

دو بار ان خطوط کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک خاکی لفافے میں رکھ کر اپنی الماری میں موجود لاگر میں رکھ دیئے تھے اور خود مطمئن ہو کر سو گیا تھا۔ شام کو اٹھا تو ماما نے بتایا کہ زرفشاں کچھ دیر پہلے ہی تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ اب بچن میں تمہارے لیے سوپ بنا رہی ہے۔

ہمارا بچن ایک ہی تھا۔ یوں تو کک تھا لیکن اکثر پایا اور چاچی اپنے ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ ضرور بناتی تھیں۔ چاچی یازرفشاں کو اپنی پسند سے کچھ بنانا ہوتا تو وہ بتا دیتی تھیں۔ ورنہ ماما اپنی مرضی سے پکوا لیتی تھیں۔

”آپ لوگوں نے تو مجھے بیمار ہی بنا ڈالا ماما۔“

میں ہولے سے ہنسا۔

”بس نیند کی کمی سے تھوڑی تھکاوٹ ہو گئی تھی۔“

”تو پھر آ جاؤ اکٹھے مل کر چائے پیتے ہیں۔“

ماما مجھے باہر آنے کا کہہ کر چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں بھی فریش ہو کر آ گیا تھا۔ شام کی چائے پر عموماً ہم کم ہی اکٹھے ہوتے تھے لیکن آج سب ہی تھے۔ خوش گوشت ماحول میں چائے پی گئی۔

پاپا نے نکاح کے لیے ایک اچھے ہال کی بکنگ کروائی تھی۔ وہ ماما اور چاچی مہمانوں اور مینیو کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ زرفشاں اٹھ کر بچن میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد سب اٹھ گئے تو میں بھی ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا اور صبح کا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ طبیعت پر عجیب سا اضطراب اور بے زاری طاری تھی۔ نہیں بھی جانے کو دل نہ چاہ رہا تھا حالانکہ پہلے جب کبھی فرصت ملتی تھی تو میں اور میرا دوست فاخر کہیں کھوٹے نکل جاتے اور آج کل تو فارغ وقت سارا کا سارا کول کے لیے تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اخبار رکھ دیا اور ریوٹ اٹھا لیا، تب ہی زرفشاں آ گئی۔

”تمہاری طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہت بڑھال لگ رہے ہو۔“

”نہیں یار ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی سستی ہے۔“

میں نے ریوٹ رکھ دیا تھا۔

وہ اتنی سادہ مخلص، کیمرنگ اور لوگ تھی۔ میرے گئے پچا کی بیٹی تھی اور یہ میں اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں اس کے ساتھ یہ سب نہ کروں لیکن دوسرے ہی لمحے میرا منی جذبہ مجھ پر غالب آ گیا اور میں نے سوچا مجھے وہی کرنا ہے جو میں نے پلان کیا ہے۔

کچھ دیر وہ بیٹھ کر چلی گئی تھی لیکن جاتے جاتے ملتھین کر گئی تھی کہ اگر طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو تو ڈاکٹر کے پاس ضرور چلا جاؤں۔

☆☆☆

آج جمعہ تھا اور اگلے اتوار کو اس کا نکاح تھا۔ میں نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا۔ شاپنگ کے لیے مبا چاچی اور اسے ساتھ لیے لیے مارکیٹوں میں پھر رہا تھا کہ نکاح کے جوڑے کی ذمہ دار بھی اس کے ماموں ممانی نے اسی پر ڈال دی تھی کہ اپنی پسند ہے لے لو۔ ساتھ ساتھ ہلکی چھلکی چیمیز جھاڑ بھی ہو جانی تھی۔ ہادی کے نام پر اس کے گندم رنگ رخسار گھلوں ہو جاتے اور لبوں پر شرابی سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔

وہ اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ نکاح میں صرف تین دن باقی تھے جب میں نے اس خاکی لفافے پر ہادی عبدالرحمن کا نام لکھا اور نام لکھتے ہوئے اس بات



کا دھیان رکھا تھا کہ میری رائٹنگ سے بالکل مختلف ہو۔

اور پھر آفس جاتے ہوئے میں نے یہ لفافہ ہادی کے گھر کے گیٹ کے اندر ڈال دیا تھا اور اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ آس پاس کوئی نہ ہو، اپنی گاڑی میں نے کافی پیچھے کھڑی کی تھی اور پیدل ہی ہادی کے گھر تک گیا تھا۔ اس پوش رہائشی کالونی میں اس وقت بالکل سناٹا تھا کہ میں وقت سے کچھ پہلے ہی نکلا تھا۔

بہانا یہ کیا تھا کہ مجھے پہلے فاخر کی طرف جانا ہے اس لیے جلدی نکل رہا ہوں۔

اس روز میں اندر سے بے چین تھا۔ اس لیے آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ صبا چچی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

”اچھا ہوا تم آگے ہو۔ یہ زکو ساتھ لے جاؤ، اسے پیچنگ جوتا لیتا تھا۔ کل بھی گھوم گھوم کر ملا نہیں، آج جو بھی لے لے لیتا۔ کل سے اب گھر بیٹھے یہ، ہاں واپسی پر نکاح کا جوڑا بھی اٹھا لیتا، تیار ہو گیا ہوگا۔“

میں اثبات میں سر ہلاتا زرفشاں کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا واپس پلٹ گیا۔

”ارے بیٹا سانس تو لے لو۔ چائے بنواتی ہوں، میرا یہ مطلب نہیں تھا کھڑے کھڑے نکل جاؤ۔“

صبا چچی نے مجھے روکا۔  
”نہیں، واپس آ کر چائے پیتے ہیں۔ ایک کام ختم ہو جائے گا۔“

☆☆☆

”کبھی کبھی میں بہت حیران ہوتی ہوں صفوان! تم بہت بدل گئے ہو۔“ ہم جوتا لے کر نکل رہے تھے تو زرفشاں نے اظہار کیا۔ ”ورنہ پہلے تو تم مجھے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔“

”نہیں، نفرت تو نہیں کرتا تھا بس چڑتا تھا۔“

میرے بابا ماما کو جو بھتیالیا تھا تم نے۔“ میں مسکرایا۔  
”لیکن کوئی لمحہ ایسا آتا ہے زرا آدمی کی زندگی میں جو آدمی کو بدل دیتا ہے، ایسا ہی ایک لمحہ میری زندگی میں بھی آیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اللہ نے بہن کی تمہاری صورت میں پوری کی اور میں بلاوجہ ہی ناشکری کر کے تم سے دشمنی پالے ہوئے تھا۔“

”اور پتا ہے مجھے تو تم کبھی برے لگے ہی نہیں تھے صفوان۔“

فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تھا۔  
”میرا کوئی بڑا بھائی نہیں تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ تم سے چھوٹی بہنوں کی طرح فرمائش کروں۔ تم میرے ساتھ کیلو، میں تم سے لڑوں، جھگڑوں پھر خود ہی مان جاؤں۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے رخصت کرنے کے لیے اکیلے بابا نہیں ہوں گے، میرے بھائی کا ہاتھ بھی میرے سر ہوگا۔“

اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ کتنی سادہ اور معصوم سی تھی اور میں.....

میں نے یہ کیا کر دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے میرا دل کانپ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میری زخمی انا پھنکارنے لگی تھی۔

وہ میرے سگے چچا کی بیٹی اور میرے بابا کی بے حد لاڈلی بیٹی اور میں اس کے ساتھ جو کچھ کر چکا تھا اس کے بعد کیا ہونے والا تھا، میں اندازہ کر سکتا تھا لیکن اس وقت مجھے کوئی شرمندگی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

یہ اسی رات کی بات تھی، کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں ہی بیٹھے تھوہ پی رہے تھے۔ موضوع گفتگو زرفشاں کے نکاح کی تقریب ہی تھی کہ زرفشاں کے ماموں اور ممانی کی اچانک آمد نے سب کو حیران کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے بابا نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

”آئیے عبدالرحمن اور بھابھی! ابھی ہم نکاح کی

تقریب کو ہی ڈسکس کر رہے تھے۔“

ماموں اور مامی کے چہرے تپتے ہوئے تھے جسے صرف میں نے محسوس کیا تھا۔ چچی جان اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”بھائی جان کھانا کھا کر آئے ہیں یا لگو آؤں۔“  
”نہیں، ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔“

عبدالرحمن صاحب کی آواز کی سرد مہری بھی صرف میں نے محسوس کی تھی۔  
”تو پھر میں چائے۔“

”بیٹھ جاؤ صبا!“  
ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ چاچی بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے چہرے کے سرد تاثرات اور مامی کی خوشخوار نظریں جو زرفشاں کی طرف اٹھ رہی تھیں نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ سوائے میرے، جو جانتا تھا کہ اب کیا بم بھٹنے والا ہے۔

”عبدالرحمن صاحب! خیریت ہے نا، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“  
آخر بابا نے ہی پوچھا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے بھائی صاحب۔“  
عبدالرحمن صاحب نے وہ خاکی لفافہ بابا کے سامنے پھینکا تھا۔  
”یہ دیکھیں۔“

بابا نے لفافہ اٹھا لیا تھا۔  
”کھول کر دیکھیں، اپنی شہزادی کا کارنامہ۔“

مامی کی آواز کی کئی میں نے بہت شدت سے محسوس کی تھی اور بابا کا رنگ تو یک دم بدلا تھا۔ انہوں نے لفافے میں سے ایک خط نکال کر کھوڑا سا بڑھ کر آخر میں شاید زرفشاں کا نام پڑھ کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا جو بے حد حیرت سے اپنی ممانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماما اور چاچی، بابا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جن کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا تھا۔

”آپ پڑھے لکھے، سمجھ دار شخص ہیں بھائی صاحب! جب ہم نے رشتہ ڈالا تھا تو آپ نے بچی سے اس کی مرضی پوچھنی تھی۔“

عبدالرحمن صاحب نے بابا سے کہا۔  
”زر سے مرضی پوچھی تھی صبا نے، اسے انکار نہیں تھا۔“ بابا کی آواز میں لرزش تھی۔ بابا کی حالت دیکھ کر میں پشیمان سا ہو رہا تھا۔ یہ میں نے کیا کر دیا تھا، کیوں کیا تھا۔

”نہیں..... نہیں یہ خط میں نے نہیں لکھے بابا۔“  
زرفشاں ایک دم کھڑی ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط لرز رہا تھا۔ گود میں رکھا لفافہ نیچے گر گیا تھا۔

”میرا یقین کریں بابا! یہ خط میں نے نہیں لکھے، کسی نے شرارت کی ہے۔“

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی اور اس کی گندی رنگت میں جیسے زردی گھل گئی تھی۔  
”مجھے یقین ہے..... مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“

بابا نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔  
”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خط کس نے لکھے ہیں۔ کون تمہارا ایسا دشمن ہے۔“  
ان کی نظریں میری طرف اٹھیں تو میں ان کی نظروں سے بچنے کے لیے نیچے جھک کر وہ لفافہ اٹھانے لگا اور پھر میں نے اس میں سے خط نکالا۔

”ہادی کہہ رہا تھا یہ رائٹنگ زرفشاں کی ہی ہے۔“

عبدالرحمن صاحب نے آہستہ سے کہا۔  
”کیوں زر۔“ بابا نے سوالیہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”بالکل، میری بی بیٹھ رائٹنگ لگتی ہے لیکن یقین کریں، میں قسم کھاتی ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔“

آنسو اس کی سیاہ آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

”خط تم نے لکھے ہیں یا نہیں لیکن دل تو برے ہوئے ہمارے، اب آنکھوں دیکھی تھی تو ہم نکل نہیں سکتے۔“

مامی کے لہجے کی کڑواہٹ میں نے اپنے حلق



میں محسوس کی۔

”بہتر تو یہ ہی ہے بھائی صاحب! آپ زرفشاں سے پوچھ کر اس کی شادی اسی لڑکے سے کر دیں۔“

”ہمیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے، وہ جو کچھ کہہ رہی ہے صحیح ہے۔ آپ خود سوچیں آج کل کے دور میں یہ خط لکھنے کی حماقت کون کرتا ہے۔ فون، سیل فون، نیٹ، رابطے کے دوسرے بہت ذریعے ہیں۔ اس لیے سو فیصد یہ کسی نے ہمارے اور آپ کے ساتھ دشمنی کی ہے۔“

بابا کی بات پر میں چونکا۔ بابا نے بڑی مدلل بات کی تھی۔

عبدالرحمن صاحب کچھ متذبذب سے تھے لیکن ان کی بیگم کھڑی ہو گئی تھیں۔

”چلیں اب کیا سوچ رہے ہیں۔ میرا بیٹا اب ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہے کہ ہم ایک بدکردار لڑکی سے.....“

”بس.....“ بابا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔  
”اب ایک لفظ بھی میری بیٹی کے متعلق منہ سے مت نکالے گا۔“

وہ اب بھی ایک ہاتھ زرفشاں کے گرد حائل کیے ہوئے تھے۔

”زرفشاں آپ کی بھانجی ہے، یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا لیکن دوسرا رشتہ.....“

”دوسرا رشتہ اب ختم ہے۔“ مامی نے بابا کی بات کاٹی تھی۔

وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ لڑکی پلکوں پر موتی پروئے ہوئے تھے جو ٹوٹ

ٹوٹ کر رخساروں پر گر رہے تھے۔ بابا اس کے گرد یوں ہی بازو حائل کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

”چلیں جی اب گھر، بھانجی کو بہو بنارہے تھے۔ سارے رشتہ داروں میں کیا عزت رہ جائے گی ہماری۔

کیا کہیں گے کہ بھانجی نے منہ پر کالک مل دی۔“  
عبدالرحمن صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن مامی

انہیں بازو سے پکڑ کر زبردستی باہر لے گئی تھیں۔ چاچی اور ماما دور ہی تھیں، اور وہ زرفشاں، وہ تو جیسے مرنے

والی ہو رہی تھی۔

”چاچی پلیز مت روئیں، اس طرح مت روئیں۔“

میں بے اختیار ہی اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا ہو گیا صفوان! کس نے دشمنی کی۔ دونوں بعد نکاح تھا، رشتے داروں کو کارڈ بھجوا دیے، ہال کی

بکنگ ہو گئی۔ کیا کہیں گے سب کو کہ کیوں.....“  
چاچی اور شدت سے رونے لگی تھیں۔

”صبا بی! حوصلہ کرو۔ مت رو، کچھ نہیں ہوگا۔ ہماری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ نکاح اسی روز ہو گا ان شاء اللہ۔“

بابا اٹھ کر ہمارے قریب آئے تھے اور انہوں نے چاچی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر میری طرف

دیکھا تھا، التجا کرتی سوال کرتی نظر میں۔  
”صفوان تم..... کیا تم زر سے.....“ ان کی آواز

بھرا گئی تھی۔  
”جی بابا۔“ میں بیک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہم اپنی عزت خاک میں نہیں ملنے دیں گے۔ میں کروں گا نکاح زر سے۔“

بابا کی آواز جذبات سے ٹوٹ رہی تھی۔  
انہوں نے مجھے یک دم گلے لگا لیا تھا اور مجھے

بے تحاشا چوم رہے تھے۔  
”مجھے تم پر فخر ہے صفوان! تم نے میرا مان رکھ لیا۔“

بابا..... زرفشاں آپ کی بی بی نہیں میری بھی عزت ہے۔“

میں نے ان سے الگ ہو کر ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تھا۔

”بابا جب بات گھر کی عزت پر آ جائے تو.....“  
میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”مجھے زر پر پورا یقین ہے، یہ کسی نے دشمنی کی ہے۔“

میں نے سارے خط سمیٹ لیے تھے۔ زرفشاں

بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولی تھی پھر بند کر لیتی تھی۔  
بابا خراس نے کہا۔

”بابا..... بابا پلیز۔“  
”تم کچھ نہیں کہو! میرے اس فیصلے کو قبول

کر لو گی، میرا مان رکھو گی! زرا ایسے ہی جیسے صفوان نے رکھا۔“ اور اس نے بابا کی بات سن کر لب سمجھنے لپے تھے

لیکن اس کے آنسو اس کے رخساروں پر روانی سے بہنے لگے تھے۔

ماما نے اسے گلے سے لگایا تھا۔  
”بس میری جان..... بس۔“

اور میں خط اٹھائے کچن میں آ گیا تھا اور انہیں چولے پر رکھ کر آگ لگا دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ

سارے خط جل کر رکھ کا ڈھیر بن گئے تھے اور میرا دل عجیب سی اداسی میں گھر گیا تھا۔ یہی تو چاہتا تھا میں،

پھر یہ سب کچھ میں نے کیوں کیا تھا۔ شاید میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے ایک پلان بنایا تھا اور اس پر

عمل کر رہا تھا۔ شاید میں نے بہت دور تک نہیں سوچا تھا، میں اسے جراتنا چاہتا تھا اور میں نے اسے جراتنا

تھا۔ مات دے دی تھی۔ میری ذہنی انا کو بڑی تسکین ملی تھی، اس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا

تھا لیکن اسے مجھ سے ہی شادی کرنا پڑی تھی۔ نہ صرف مجھ سے شادی کرے گی بلکہ ساری زندگی میری

احسان مند بھی رہے گی، ساری زندگی اس کی نظریں میرے سامنے بچی رہیں گی۔ مجھے خوش ہونا چاہیے

تھا لیکن یہ کیسا احساس زیاں تھا جو مجھے اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ کیا اپنی محبت کھودینے کا احساس.....

ابھی وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ ابھی میں اس نکاح سے منع کر سکتا تھا۔ میں ان جلے ہوئے خطوں کی راکھ

اکٹھی کر کے ڈسٹ بن میں ڈالنے لگا تھا جب زرفشاں نے کچن میں قدیم رکھا۔ شدت گریہ سے اس

کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں، چہرہ ستا ہوا تھا۔ یہ وہ زرفشاں تو نہیں تھی، ابھی ہوئی گردن والی خود شناس

اور خود اعتماد زرفشاں، یہ تو کوئی کسمی ہوئی، ڈرپوک سی لڑکی لگ رہی تھی۔ اعتماد سے عاری، گھبرائی ہوئی۔

ایک دم سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی لہر پیدا ہوئی تھی۔ احساس زیاں بڑھ گیا تھا، یہ کیا کر دیا

تھا میں نے، کتنے دل زخمی کر دیئے تھے۔  
”ایم سوری صفوان.....“

اس نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا تو ان روئی روئی آنکھوں میں مجھے وہی اعتماد نظر آیا تھا ہمیشہ والا۔

”میری وجہ سے تمہیں پریشانی ہوئی ہے۔ اس وقت سب جذباتی ہو رہے ہیں، کوئی میری بات سننے

کو تیار نہیں ہے لیکن میں صبح خود ہادی سے بات کروں گی۔ وہ یقیناً میری بات سمجھ لے گا۔ مجھ پر اعتبار

کرے گا۔ تم بے فکر رہو، تمہارے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم.....“

”پلیز زر.....!“ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

”اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں۔“

”اوکے، لیکن تم پریشان مت ہونا۔ میں خود صبح بابا جان سے کہہ دوں گی۔“

”پلیز زر.....“  
اور وہ چلی گئی تھی لیکن میری انا کا ناگ اپنا پھن

اٹھائے مجھے بار بار ڈنک مار رہا تھا۔ میں اس بدنامی کے باوجود اس سے شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا اور یہ اب بھی

..... اب بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ میرا سارا احساس زیاں کہیں کھو گیا تھا اور کوئل رضا کی

محبت بھی کہیں دور پیچھے رہ گئی تھی۔ مجھے اب زرفشاں سے ہی شادی کرنی تھی، بھلے وہ بابا سے کچھ بھی کہتی۔

میں بے حد خراب موڈ کے ساتھ اسے کرنے میں آیا تھا لیکن وہاں بابا کو بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”بابا آپ..... حیرت ہے نا۔“  
وہ شاید لاؤنج سے اٹھ کر میرے کمرے میں ہی

آ گئے تھے۔  
”ہاں۔“ انہوں نے سر ہلایا تھا۔

”صفوان بیٹا! میں جانتا ہوں تم کوئل سے محبت کرتے ہو۔ باتوں باتوں میں ایک روز رضا سے یوں



ہی میں نے ذکر کر دیا تھا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے کھس کو پتا ہوتا ہے، میں سوچ رہا تھا زرفشاں کے نکاح کے بعد باقاعدہ تمہارے رشتے کے لیے رضا کی طرف جاؤں گا لیکن میں تمہارا احسان مند ہوں تم نے.....“

”کیسی بات کرتے ہیں بابا۔“ میں تڑپ گیا تھا۔ ”بیٹے والدین پر احسان نہیں کرتے۔ یہ تو میرا فرض تھا اور آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں بابا اور میں کوئی کول سے محبت و جنت نہیں کرتا تھا، بس اپنی لگتی تھی وہ مجھے اور پھر آپ ہی تو کہتے ہیں کہ شادی کے بعد سب لڑکیاں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔“

میں ہنسا تھا لیکن میرے اندر کہیں بہت ساری کرجاں ٹوٹ کر بکھری تھیں، وہی احساس زبیاں کول رضا کو کھودینے کا احساس۔ بابا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ”زر بہت اچھی ہے صفوان! تمہاری ماما کہتی ہیں ہماری زر جس گھر میں جائے گی، اجالا کر دے گی۔ مجھے یقین ہے تم بہت خوش رہو گے۔ مجھ سے وعدہ کرو مافی! اسے بھی کوئی دکھ نہیں دو گے، ہر طرح سے اس کا خیال رکھو گے۔“

”وعدہ..... آپ کی بہو کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“ میں نے بابا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

اور میں نے صرف وعدہ نہیں کیا تھا، اسے نبھایا بھی تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کی، کبھی اسے کوئی دکھ نہیں دیا۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کی ہر خواہش پوری کی۔ بابا، ماما، چاچی سب ہی خوش تھے۔ مطمئن تھے۔

کیا میں اور زرفشاں بھی خوش تھے، ان اٹھارہ سالوں میں ایک بار بھی میں نے نہیں سوچا تھا لیکن ہم خوش نہیں تھے۔ ایسے خوش جیسے ہونا چاہیے تھا، ہم دونوں نے ہی زندگی پورے من کے ساتھ نہیں جی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میرے پوچھنے پر زرفشاں نے بتایا تھا کہ وہ بھی پورے من کے ساتھ جی نہیں سکی۔

”کیوں زر..... کیوں.....“

میں جیسے تڑپ اٹھا تھا۔

”کیا میں نے ان اٹھارہ سالوں میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی۔ کیا تمہارا خیال نہیں رکھا۔ ہر لمحہ، ہر مشکل لمحے میں تمہارے ساتھ رہا۔ جب روحان کے وقت تمہاری حالت بگڑ گئی تھی اور جب چاچی بیمار ہو گئی تھیں تو کیا کسی لمحے میں نے تمہیں اکیلا چھوڑا۔“

”نہیں.....“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لوگ ہماری زندگی پر رشک کرتے ہیں زراور تم.....“

”ہاں لوگ.....“

وہ میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”لیکن میں نے بھی اپنی زندگی پر رشک نہیں کیا بلکہ ترس آتا ہے مجھے خود پر اور تم پر بھی۔“

”کیا ہادی یاد آتا ہے تمہیں..... کیا تم اب بھی ہادی سے محبت کرتی ہو۔“

بالکل غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”ہاں۔“

کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی، جس نے مجھے ساکت کر دیا تھا۔

”میں اسے بھول جاتی۔“

اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بڑی ہی زخمی نظریں تھیں۔

”میں یقیناً اسے بھول جاتی اور تم سے محبت کرنے لگتی کہ میاں بیوی کے درمیان نکاح کا بندھن خود بخود ہی محبت کے تانے بانے بن دیتا ہے۔ نکاح کے اس کرشمے پر بنا گیا محبت کا رشتہ۔ بہت مضبوط بہت پائیدار ہوتا ہے۔ ان ساری بغیر کی محرم رشتے کی محبتوں سے زیادہ پائیدار اور مضبوط۔ ہاں میں بھول جاتی اس محبت کو جو اگر مجھے علم نہ ہوتا کہ میرے اور تمہارے رشتے کی بنیاد دھوکے پر رکھی گئی ہے۔

میرا اہم سفر فریبی اور دھوکے باز ہے۔ اس نے مجھے ایک دھوکے سے اپنی زندگی میں شامل کیا اور دھوکا بھی وہ جس نے میری عزت کی چادر میں شگاف ڈالے

تھے۔ مجھے میرے اپنوں کے سامنے شرم سار کیا تھا۔“

ہولے ہولے لگا ہیں جھکائے بول رہی تھی اور میں ساکت بیٹھا سر رہا تھا۔

”میں جانتی تھی صفوان کہ تم کول سے محبت کرتے ہو۔ تمہیں تو علم نہیں تھا لیکن جب انکل رضا یہاں آ کر رہے تھے تو کول سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ یہاں تنہا ہی محسوس کرتی تھی تو میں کبھی کبھار اس سے ملنے چلی جاتی تھی لیکن تم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ تمہیں میرے متعلق نہ بتائے کہ کہیں تم اسے منع نہ کر دو۔ کول مجھ سے ہر بات شیئر کرتی تھی اور میں اتنی خود غرض نہیں تھی کہ تمہیں اپنی محبت کی قربانی دینے دیتی۔

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ہادی نے میری بات نہ بھی سمجھی تو بھی تم سے شادی نہیں کروں گی۔ میں بابا کو بتا دوں گی تمہارے اور کول کے متعلق، وہ ضرور میری بات سمجھ جائے کہ اس طرح نہ تم خوش رہ سکو گے نہ میں لوگوں کے ڈر سے، وہ دو زندگیاں بھی خراب نہ کرتے۔

لیکن ہوا یوں کہ ہادی نے خود ہی رات کو فون کر لیا اور نہ صرف یہ کہ ماما کی معذرت کی بلکہ یقین بھی دلایا کہ اسے مجھ پر پورا یقین ہے اور ماموں آج بابا سے بات کرنے آئیں گے۔

میں بابا سے بات کرنے سے پہلے تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ رات کو تم بہت ڈسٹرب تھے لیکن بڑی آنکھ کچھ دیر سے کھلی تھی۔ میں تمہاری طرف آئی تو تم کمرے میں نہیں تھے۔

شاید تم جلدی آفس چلے گئے تھے۔ میں واپس مڑی تو پھر پاؤں کی ٹوک سے ڈسٹ بن الٹ گئی تھی۔ وہ ہانکےں تمہاری رائیگ نینل کے نیچے ہونے کے بجائے سائینڈ پر کیوں بڑی تھی۔ میں نے اس میں سے گرنے والے کاغذ جھک کر اٹھائے تاکہ دوبارہ ڈسٹ بن میں ڈال دوں لیکن ایک کاغذ نے مجھے چونکا دیا۔

یہ میرے نوٹس کا ورق تھا۔ میری ہینڈ رائیگ میں میرا ہی لکھا ہوا لیکن یہ یہاں کہاں..... میں نے

وہ باسکٹ پھر الٹ دی اور مڑے مڑے کاغذوں کو کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ تم میری ہینڈ رائیگ کی پریکٹس کرتے رہے تھے، ایک ٹکڑے پر چند سطریں اس محبت نامے کی کئی تھیں جو میں نے پڑھا تھا۔ وہ سارے خط و قلم نے جلادئے تھے پھر.....

ہر مجرم کی طرح تم سے بھی چوک ہو گئی تھی۔ تم نے ابھی تک یہ کاغذ ضائع نہیں کیے تھے شاید تمہیں ابھی تک موقع نہیں ملا تھا اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی بھی تمہارے کمرے میں نہیں جاتا اور ماما اگر صفائی بھی کروائیں تو تمہارے کاغذوں کو نہیں چھیرتیں۔ (حتیٰ کہ تمہاری ڈسٹ بن کو بھی نہیں، جس میں تم ردی کاغذ چھینکتے تھے) تو یہ تم تھے صفوان لیکن تم نے یہ سب کیوں کیا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے ایک سال سے تمہارا مہربان رویہ، تمہارے متنی خیز جملے چند لمحوں کے لیے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ شاید تم مجھ سے محبت کرنے لگے تھے کہ محبت بھی تو ایک بڑا غیر اختیاری سا جذبہ ہے، کہیں بھی کبھی بھی کسی بھی وقت دل پر شب خون مار دیتا ہے۔

لیکن اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے تو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں۔ بابا، ماما، امی سب یہی تو چاہتے تھے، نہیں بات کچھ اور بھی صفوان! مجھے سمجھنے میں دیر لگی تھی لیکن میں سمجھ گئی تھی۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے، کسی بات کا بدلہ لینا چاہتے تھے مجھ سے لیکن بابا کی متنی نظروں نے تم سے وہ ہلوا دیا جو کبھی بھی تمہاری خواہش نہیں ہو سکتی تھی۔

تم پھنس گئے تھے صفوان! لیکن مجھے اب کیا کرنا تھا۔ میں وہ کاغذ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا میں یہ ثبوت لے کر سدھی بابا کے پاس چلی جاؤں اور انہیں سب بتا دوں لیکن یہ سب جان کر انہیں کتنی اذیت ہوئی وہ تو ٹوٹ جاتے صفوان! کتنا مان تھا انہیں تم پر، کتنی محبت کرتے تھے وہ تم سے۔ میں ان کا یان نہیں توڑ سکتی تھی۔ انہیں ٹوٹنے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، وہ یہ سب جان کر کیسے زندہ رہ پاتے۔ میں انہیں کچھ بتائے بغیر بھی تمہاری اور کول



کی محبت کا ذکر کر کے ہادی کی غدا مت کا پتا کرتے سے شادی کرنے سے انکار کر سکتی تھی۔

”لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا زرفشاں..... کیوں ہادی سے شادی نہیں کی اور میرے ساتھ آدھے من سے زندگی گزار لی۔“

میں اندر سے پانی پانی ہوا جاتا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم سے شادی کا فیصلہ کیا تھا اور ہادی کو منع کر دیا کہ وہ ماموں کو نہ بھیجے اور نہ ہی خود آئے۔

ہاں وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، بہت اچھا تھا۔ نرم خور کیرنگ۔ میں اور امی نانا کے گھر بہت کم جاتے تھے لیکن جب بھی جاتے تھے، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ بچپن کا یہ خیال جوان ہونے پر محبت میں ڈھل گیا لیکن وہ ایک مرد تھا صفوان! آج وہ اعلا ظرنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنانے کے لیے تیار تھا لیکن پھر بھی کسی لمحے وہ مجھے ان خطوط کا طعنہ دے بیٹھا۔ مجھ سے پوچھ بیٹھا وہ کون تھا جسے میں نے خط لکھے تھے۔ اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ کک ضرور رہتی کہ اس کی بیوی نے کیا خبر کسی کے نام وہ خط لکھے ہی ہوں۔

یہ شک مجھے کھا جاتا صفوان! اور اگر ہادی کے علاوہ میری شادی کہیں، کسی اور سے ہو جاتی تو ہمارے چھپانے کے باوجود بھی کبھی نہ بھی اسے پتا چل جاتا کہ میرا نکاح ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ایسی خبریں تو جتنا بھی چھپاؤ، گھر کے چور دروازوں سے نکل جاتی ہیں اور ہوا میں انہیں اپنے پلوں میں باندھے اڑا کر گھر پہنچا دیتی ہیں۔

ایک تم تھے صفوان! واحد شخص جو جانتے تھے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تم بھی مجھ پر شک نہ کرتے، اس لیے میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے کے لیے کہ یہاں بابا اور ماما بھی تھے میرا اسہارا۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بابا کہتے تھے میری زر بہت ذہین اور عقل مند ہے۔ وہ واقعی عقل

مندھی اور میں کیا تھا ایک حق، بے وقوف مرد جس نے اپنی محبت ہادی سے لے کر اب تک تمہاری کسی مجبور ہو کر۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ اس طرح ہاتھ گود میں رکھے نگاہیں جھکا کر ہوئے ہوئے بول رہی تھی۔

”اس روز کوئل میرے پاس آئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ تم نے اپنی اس قربانی کا بتا دیا تھا، وہ اپنی محبت کے پھٹ جانے پر ٹوٹ رہی تھی اور اپنا دل ہلکا کرنے اور اس سارے واقعے پر افسوس کرنے میرے پاس آئی تھی۔ تم آفس میں تھے تب، وہ ہمیشہ ایسے ہی وقت میرے پاس آتی تھی جب تم گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ وہ بہت رو رہی تھی لیکن اسے تم پر غر تھا۔

اس نے مجھ سے کہا مجھے صفوان سے کوئی گھر نہیں، مجھے فخر ہے کہ میں نے جس شخص سے محبت کی وہ ایک عظیم انسان ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے لیکن اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے اس نے قربانی دی ہے۔ میرے پایا کہتے ہیں کہ وہ شخص جسے اپنے رشتوں کا پاس ہو اور جو ان کی خاطر قربانی دینا اور ان کا بھرم رکھنا جانتا ہو، وہ قابل قدر شخص ہے اور میرے پایا کے دل میں صفوان کی بڑی قدر ہے۔

میں دل ہی دل میں ہنسی تھی کہ یہ کیسا پاس تو رشتوں کا کہ تم نے اپنے پیسے بچا کی بیٹی کو سوا کیا تھا۔ تم نے قربانی تو نہیں دی تھی صفوان! تم نے مجھ سے بدلہ لیا تھا لیکن میں آج تک نہیں جان سکی تھی کہ تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا تھا۔

بچپن کی ضد اور جلن کے لیے کوئی اپنی محبت پر نہیں لگتا لیکن تم نے اپنی محبت داؤ پر لگا دی۔ پتا نہیں کیوں..... میں نے بابا کو تمہارے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا کہ تمہارے متعلق جان کر شاید وہ زندہ نہ رہتے۔ ماما مجھ سے نظریں نہ ملا پائیں اور امی شاید گیلیاں باؤس کو چھوڑ دیتیں تو وہ بھی زندہ نہ رہ پائیں۔ لیکن کوئل..... ہاں کوئل کو دکھ تو ضرور ہوتا تھا تمہارا اصلی چہرہ نظر آ جاتا۔ میں نے ساری جمع تقری

کر لی تھی اور میں نے کوئل کے سامنے وہ کاغذ رکھتے ہوئے سب کچھ بتا دیا تھا۔

میں نے بچپن سے لے کر اب تک تمہاری کسی زیادتی پر اب تک نہیں کی تھی لیکن اب میں نے تم سے بدلہ لے لیا تھا۔ وہ جو تمہیں دیوتا مانا جھٹکتی تھی، اس کے دل میں بتا تھا کہ یہ بت ٹوٹ کر کچی ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے میں نے کوئل کے ساتھ اچھا ہی کیا، یہاں سے جا کر بھی شاید وہ تمہیں نہ بھلا پائی لیکن تمہاری عظمت کا یہ بت ٹوٹنے کے بعد شاید وہ پچھدن اپ سیٹ نوڑے کی لیکن پھر سنبھل جائے گی۔ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہوگا اس کے لیے اور ایسا ہی ہوا۔

اب تک جانے کے صرف دو سال بعد اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ بہت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے، پورے گھر کے ساتھ۔ ہاں یہ اس کی بڑائی ہے کہ اس نے اپنے والدین کے سامنے تمہارا بھرم رکھ لیا تھا، اس محبت کے مدد سے جو اس نے تم سے کی تھی۔ انکل رضا آج بھی تمہاری تعریف کرتے ہیں۔

شاید میں بھی بھی تم سے ذکر نہ کرتی صفوان! لیکن آج جب تم نے پوچھا کہ کیا میں نے زندگی بھرے من کے ساتھ جی ہے تو میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔

میں جانتی ہوں تم چاہتے تھے میں کہوں ہاں۔ میں اعتراف کروں کہ وہ احسان جو تم نے مجھ پر کیا اس کے عوض میرا پور پور تمہاری محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

تم آج بھی سب کے لیے دیوتا سان ہو، اپنے شکستوں پر بیٹھے لیکن میرے لیے نہیں تو میں وہ نہیں کہہ سکتی جو تم سننا چاہتے تھے۔

ہاں میں نے زندگی آدھے من کے ساتھ گزار لی ہے۔ ادھوری کی لیکن پرسکون اور مطمئن۔“

میں تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا یا پھر مٹی کا ڈھیر کہ ساکت بیٹھا اسے بولتا سن رہا تھا۔

اور میری انا کا ناگ اچھن اٹھا اٹھا کر مجھے ڈستا تھا کہ اسے اچھی فارغ کر دو کہہ دوا سے کہ وہاں چلی

جائے۔ جہاں پورے من کے ساتھ جی پائے لیکن وہ نفسیات کی ماسٹر بابا کی ذہن اور عقل مند بیٹی چہرے سے دل کا احوال بھی جان پیتی تھی شاید کہ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول اٹھی تھی۔

”کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا صفوان کہ تمہارے بچے تمہیں اپنا آئیڈل سمجھتے ہیں۔ تم مجھے اپنی زندگی سے نکال دو گے تو وہ سب کچھ جو اٹھارہ سالوں سے چھپا ہوا تھا، ظاہر ہو جائے گا۔“

وہ زرفشاں جسے میں ایک بے وقوف سی لڑکی سمجھتا رہا، اسے اپنے سارے بچے اچھی طرح کھیلنے آتے تھے۔

وہ لیوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

عقان اور روحان میں میری جان تھی، حرا کے بغیر تو میں ایک سانس بھی نہ لے پاتا۔ وہ نظریں جو میری طرف محبت و عقیدت سے اٹھتی تھیں۔ میں ان نظروں میں اپنے لیے نفرت کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

وہ تاسف اور ہمدردی سے مجھے دیکھتے ہوئے لاؤنج سے چلی گئی تھی۔

میں کی ہارے ہوئے شخص کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ اٹھارہ سال میں نے اس خوش بھی میں گزار دیے تھے کہ میں ایک فارغ ہوں لیکن میں جیسے اپنی جیت سمجھتا رہا۔ وہ تو میری مات تھی۔

زرفشاں نے ساری عمر کی زیادتیوں کا بدلہ لے لیا تھا مجھ سے..... اور اب میری پانی کی عمر اس شکست کے زخموں پر مرہم رکھتے گزر جاتی تھی۔ زرفشاں نے مجھے بہت بڑی مات دی تھی اور اس مات کی اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی مجھ سے اور میں صفوان حیدر ایک مرد ہو کر رو رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر، بلند آواز میں.....!!





# جواب

”بس بھی کیا کریں آج کل وقت کے تقاضے کچھ اور ہو چکے ہیں۔ اب لڑکیوں کی شادی کرتے وقت بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔“ میمونہ کھیر لہجے میں بولیں۔

”کیوں نہ دیکھیں آپا.....“ ان سے چھوٹی شمعونہ نے چمک کر کہا۔ ”اب ہم اپنی سادہ لوح ماں کی طرح آنکھ بند کر کے ایسے دیسے رشتے تو کرنے سے رہے۔ ہماری اماں نے تو نجانے کیا دیکھ کر ہماری شادیاں لی تھیں۔ انہوں نے تو نہ ہماری اچھی صورتیں کیش کروائیں اور نہ ہی اپنی مضبوط مالی حیثیت ہی کے مطابق سمجھانے ڈھونڈے۔“

انہوں نے بات کے اختتام پر اتنے زور سے گردن جھٹکی کہ گردن کی ہڈی چیخ مچی ہوگی۔

”تو اور کیا۔“ میمونہ نے شد و مد سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بس جو بھی جیسا بھی رشتہ میسر آیا معمولی سی چھان بین کے بعد جھٹ سے ہاں کر دی۔ جیسے خدا نخواستہ ہم بہنوں میں کوئی عیب تھا۔“

”حالانکہ ایک زمانہ ہم بہنوں کی خوب صورتی، خوش لباسی اور اخلاق کا معترف تھا۔ مگر نہیں۔“ شمعونہ نے دائیں ہاتھ سے اپنی چٹنی ہوئی گردن کی ہڈی سہلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”جیسے بھی کالے پیلے ملے پکڑ کر بیاہ دیا۔“ دراصل انہیں اپنی خوب صورتی اور ان کی دانست میں بے جوڑ شادی کا کچھ زیادہ ہی قلق تھا۔ ان کی اس بات پر میمونہ بے ساختگی سے ہنس پڑیں۔

”کالا تو چلو تمہارا شوہر واقعی ہے..... مگر پیلا تو کوئی بھی نہیں۔“

”آپ کو بہت ہنسی آرہی ہے۔“ وہ ان کے یوں ہنسنے پر باقاعدہ برا ماننے ہوئے بولیں۔ ”کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب میری سہیلیوں نے جمال کو دیکھا تھا تب کتنا مذاق اڑایا تھا میرا۔“ وہ روہاسی کی ہو گئیں۔

”ارے ہاں ہاں!“ میمونہ ان کی خفگی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے منہبل کر بولیں۔

”سب یاد ہے مجھے کہ تم نے کیسے آٹھ آٹھ آنسو بہائے تھے کہ تمہیں اس کالے لکھوٹے سے ہرگز بھی شادی نہیں کرنی..... اور کیا تم بھول گئیں جب میرا ہاتھ منور کے ہاتھ میں تھما تو کتنی قلیل تنخواہی ان کی..... شادی کے ابتدائی ایام میں نے کیسی تنگی، ترشی میں بسر کیے ہیں بس میرا ہی دل جانتا ہے۔“ وہ اپنے کربناک ماضی میں کھسی گئیں۔

”اور ایک وہ ہماری بچی صاحبہ تھیں۔“ شمعونہ جیسے دانت پیستے ہوئے بولیں۔ ”وہ بھی تو اماں ہی کے دور کی عورت تھیں۔ مگر کیسی زیرک اور دوراندیش نکلیں..... اپنی چاروں بچہ چڑھی بیٹیوں کو ڈاکٹروں سے بیاہا..... ایسے زمرے جا ملے تو ہم بھی نہ تھے۔ اس زمانے میں بی ایس سی کیا تھا۔ اماں ذرا ڈھونڈ لیتیں تو انہیں بھی ڈاکٹر نہ سہی کم از کم انجینئر داماد تو مل ہی جاتا مگر نہیں..... ہمیں تو کسی بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔“

”کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا بھی؟“ میمونہ کے اس وقت کے کم آمدنی والے شوہر نامہ اندر جواب ایک بڑے آفیسر بن چکے تھے اور خاصی بگڑی تنخواہ حکومت پاکستان سے پاتے تھے، نے آکر دونوں بہنوں کی باتوں کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”بس دو لہا بھائی!“ شمعونہ نے ذرا محتاط لہجے میں کہا۔ ”ہم نہیں ذرا اپنے ماضی کی یادوں میں کھو گئیں۔“

”اچھا..... اچھا سمجھ گیا۔“ وہ سامنے کے صوفے پر رونق افروز ہوتے ہوئے زور و شور سے

اثبات میں ہلاتے ہوئے بولے۔ ”یعنی آپ لوگ اس وقت اپنا من پسند موضوع چھیڑے بیٹھی ہیں۔“

”آپ کیا جانتیں، ہمارا من پسند موضوع کیا ہے؟“ میمونہ کو اسے شوہر کا پر اعتماد ذرا نہیں بھایا اسی لیے تنگ کر بولیں۔

”ارے بیگم!“ منور ہنس پڑے۔ ”ہماری شادی کو یہ پچیسواں سال ہے کیا اب میں اتنا بھی نہیں جانوں گا کہ جب بھی کسی لڑکی کی شادی میں شرکت کر کے واپس لوٹی ہیں آپ لوگ..... تو آپ کے درد یونہی بیدار ہو جاتے ہیں۔“

”درد؟ کون سے درد؟“ میمونہ نے ان کے کھلکھلاتے چہرے کو کڑی نظروں سے دیکھتے گھبراتے ہوئے استفسار کیا۔

”آپ کا درد یہ ہے کہ آپ کی اماں نے آپ کو مجھ جیسے معمولی تنخواہ دار سے بیاہ دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں اپنی تعلیم مکمل کر کے نیا نیا نوکری پر لگا تھا۔ ترقی کے مواقع تھے..... میں سختی اور شریف تھا۔ آپ کے والدین نے غالباً یہی اوصاف مد نظر رکھے ہوں گے۔ اور ہماری شمعونہ، جو بلاشبہ آج بھی بے حد خوب صورت ہیں انہیں ہمیشہ اپنی شادی ایک کم رو انسان سے کر دیے جانے پر اپنی والدہ سے گلہ رہا جبکہ میرے خیال سے جمال ایک بہترین انسان ہے۔ اس نے شمعونہ کو ہمیشہ اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھا..... انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور رہیں چھوٹی نعمانہ..... جہاں تک مجھے یاد ہے۔ آپ کی والدہ اور گھر والوں نے ان کی شادی تو بڑی دیکھ بھال کر کی تھی..... ظاہر ہے بڑا داماد ہونے کے ناتے آپ کے گھر والے مجھے بھی لے کر گئے تھے فاروق کو دیکھنے کے لیے۔ فاروق تعلیم یافتہ خاندانی ہونے کے ساتھ ساتھ خوب رو بھی تھے۔ نوکری بھی اچھی خاصی کر رہے تھے..... اب اگر بعد میں حالات بگڑ گئے تب اس میں آپ کی والدہ کہاں سے قصور وار ہو گئیں؟“

اس وقت منور صاحب نے اپنی ازلی خطرناک

صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا اور دونوں بہنوں کے ماتھے پر پڑتے بل صاف ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں، منور صاحب کا یہ بے لاگ تبصرہ و تجزیہ بالکل پسند نہیں آیا۔

”جانے دس منور؟“ بیگم ہی نے جملباتے ہوئے لب کشائی کی۔ ”جب آپ کو حقیقی حالات کا کوئی علم نہیں ہے تو آپ کیوں ہماری گفتگو میں دخل دے رہے ہیں۔“

”اور کیا دو لہا بھائی۔“ شمعونہ نے رکھائی سے





کہا۔ ”برامت مایہ کا مگر میرے شوہر سمیت اماں کے تینوں داماد ہی معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ دیکھنے میں بھی بس گزارے لائق اور گھرانے بھی معمولی۔ اس کے برعکس ہماری چچی صاحبہ نے اپنی چاروں بیٹیوں کے لیے کیسے چھان چٹک کر بڑھوٹے..... ڈاکٹر، اوپر سے پینڈسم اور تو اور گھر بھی ایک سے بڑھ کر ایک شان دار۔“ شمعونہ ناراضی سے پولیس۔

”آپ یہ کیوں فراموش کر گئیں کہ آپ کے چچا کی چاروں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ لہذا وہ ڈاکٹروں سے بیانی تھیں تو اس میں اچھے کی تو کوئی بات نہ تھی۔ اور میں نے بھی دیکھا ہے ان کے دامادوں کو..... تین تو صرف قبول صورت کہے جاسکتے ہیں البتہ وہ تھلولا ڈاکٹر جبران واقعی بہت خوب صورت ہے۔ مگر آپ یہ کیوں نہیں دیکھ رہیں کہ یہی خوب صورت، پینڈسم ڈاکٹر اپنی رملین طبیعت کی وجہ سے زندگی بھر اپنی بیوی کے لیے کیسا امتحان ثابت ہوئے۔ اور ان کا دوسرا داماد جس نے اتنا بڑھا لکھا ہونے کے باوجود اولاد نہ ہونے کا قصور وار اپنی بیوی کو گردانتے ہوئے دوسری شادی رچائی اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اولاد اسے دوسری سے بھی نہیں ہو سکی۔“ منور صاحب نے ذرا سنجیدگی سے ان دونوں کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی سعی لا حاصل کی۔

”اب یہ تو خیر ہمارا اور صبا کی قسمت کی بات رہی۔ وگرنہ سیمہ اور نینا بھی تو ہیں۔ ایسی بھرپور زندگی گزار رہی ہیں دونوں۔“ میمونہ کا لہجہ حسرت سے نکل کر حسد کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔

منور نے انہیں ہنسٹ سے دیکھا۔

”ایسی بھانک اور حسرت ناک زندگی تو خیر آپ نے بھی نہیں گزاری۔ ہزاروں سے اچھے حال میں بفضل تعالیٰ میں نے رکھا ہے ہمیشہ آپ کو۔“

”اوکی اللہ؟“ وہ شوہر نامدار کے اس بیان پر یوں اچھلیں گویا انہیں کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اپنی تفریضیں تو کوئی آپ سے کروائے

بس..... ارے آپ تو رہے سدا کنویں کے مینڈک آپ کیا جانیں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور آپ ہیں کہ آج بھی اپنی ذاتی چھت، دو وقت کی روٹی اور تن پر موجود کپڑے ہی کو کافی خیال کیے بیٹھے ہیں ہونہہ!“

”چھوڑیں اس لایعنی بحث کو۔“ اس سے قبل کہ منور صاحب انہیں جواب دینے کے لیے منہ کھول پاتے۔ شمعونہ نے بڑے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”ہماری اماں نے تو کیا سو کیا..... اب اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کے رشتے ناتے طے کرتے وقت ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھی ہے جو ہماری اماں نظر انداز کر گئی تھیں..... خیر پھر چل رہی ہیں نا آپ پرسوں عنایہ کے لیے لڑکا دیکھئے؟“

☆☆☆

پھر جو فاش غلطیاں، شمعونہ کا رشتہ طے کرتے سے اس کی ناقص العقل والدہ سے سرزد ہوئی تھیں، انہیں نہ دہرا کر عین دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے اپنی اکلوتی نور نظر عنایہ کا برابر بلا خر تلاش کر ہی لیا۔

سمیر مشتاق اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ پوسٹ بھی اچھی تھی اور گاڑی بھی..... گلشن میں والد کا چار سو گز کا بنگلہ بھی سمجھواس کا اپنا ہی تو تھا۔ دو بکنیں تھیں اور دونوں ہی شہر کے مختلف کونوں میں بیانی جا چکی تھیں۔ گویا سارے ہی ہیرے اس جھومر میں جڑے تھے۔ جو عنایہ کے ماتھے پر سجے والا تھا۔

عنایہ بھی بہت شاداں و فرحاں، خوش نما و خوب صورت سی تھی کی مانند ادھر ادھر اڑی پھر رہی تھی۔ اسے بھی خوب رویہ میرا بنے لیے ہر لحاظ سے موزوں لگا تھا اور وہ اس بات پر ”تھینک گاڈ..... تھینک گاڈ“ کہتے نہ تھک رہی تھی کہ اس کی والدہ نے اپنی امی والی جہانگیر سے دہرا لیں، وگرنہ اسے تو یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ بھی اس کے لیے کوئی بے جوڑ رشتہ نہ ڈھونڈ بیٹھیں مگر نہیں۔

شمعونہ کوئی پچھلے زمانے کی نادان عورت نہ تھیں..... وقت کی رفتار اور زمانے کے تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے سبب اس امر سے بخوبی واقف تھیں کہ اسودہ حال زندگی کا راز روپے پیسے ہی میں مضمر ہے۔ اور جہاں تک شوہر حضرات کا تعلق ہے، وہ تو سارے ہی بعد میں ایک جیسے ثابت ہوتے ہیں اتو اسی لیے انہوں نے اپنی سادہ لوح والدہ محترمہ کی طرح کسی بھی قسم کی بے وفائیاں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا تھا اپنی عنایہ کے معاملے میں۔ یوں انہیں تھوڑا وقت تو ضرور لگا گھر بلا خر وہ گوہر مقصود انہیں مل ہی گیا۔ جو خود ان کے لیے ان کی والدہ نہ تلاش کر سکیں۔

یوں عنایہ بڑی دھوم دھام سے سمیر کے سنگ رخصت ہوئی اور پورے خاندان میں شمعونہ کے داماد کی دھاک بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”اسے کہتے ہیں نا جوڑ، جو تم نے اپنی بیٹی کا ڈھونڈا..... بس بھئی، اب تو میری رحمہ کے لیے بھی پرتم ہی نے تلاش کرنا ہے۔“ میمونہ پولیس..... تو شمعونہ فخر و انبساط سے پھولی نہ ساتے ہوئے جھٹ اثبات میں سر ہلا کر کہنے لگیں۔

دراصل آج وہ تینوں بڑے دن بعد بہت فرصت سے شمعونہ کے ہاں اکٹھا ہوئی تھیں..... اور بڑے موقع پر ہوئی تھیں کہ آج سوئے اتفاق نو بیا ہاتھی رات ٹھہرنے کی غرض سے اپنی والدہ کی طرف آئی ہوئی تھی اور اس وقت سادہ سے سوئی جوڑے میں لمبوس، صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کیے، خلاف عادت بڑی خاموشی سے بیٹھی ان سب کو بولتے سن رہی تھی۔

”ہاں بھئی.....“ دھان پان سی نعمانہ بھی ہمشیر گان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے عنایہ کی جانب دیکھ کر گویا ہوئیں۔ ”تم خوش قسمت ہو جو تمہاری ماں کی کچھ داری کی بدولت ہمیں ایک امیر کبیر سسرال ملا نہیں تو ایک ہماری اماں تھیں۔ جنہوں نے پتا نہیں کیا دیکھ کر ہمیں تو جیسے تیسوں سے بیاہ کر اپنے سر سے

گویا بلا ٹالی۔“

انہوں نے جملے کے آخر میں ان سب کا من پسند مخصوص فقرہ دہرایا تو اتنی دیر سے لب بستہ عنایہ ایک دم، بے ساختہ، بے اختیار بول پڑی۔

”خالہ..... آپ لوگوں کو ہمیشہ ہی سے یہ سوال پریشان کرتا آیا ہے نا کہ آخر نانی نے ”کیا“ دیکھ کر آپ تینوں کو ایسے ویسے اور ”معمولی“ لوگوں سے بیاہ دیا تو اس سوال کا جواب مجھے سسرال میں گزارے گئے ان تین ماہ میں مل چکا ہے۔ کیا آپ وہ جواب سننا پسند کریں گی؟“

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“ نعمانہ نے بہت الجھ کر اس کی اتری صورت دیکھی اور اس کا چہرہ تو خیر اس وقت بڑی حیرت سے شمعونہ اور بڑے لمپٹے سے میمونہ بھی تک رہی تھیں۔ تب ہی وہ رندھی ہوئی آواز میں دوبارہ گویا ہوئی۔

”مطلب یہ خالہ کہ نانی نے دیکھے سادہ، مخلص اور قدردان لوگ..... وہ لوگ..... جنہیں میری امی میرے لیے تلاش نہ کر سکیں..... اور میں نے یہ جانا کہ نمود و نمائش کے شوقین، مادہ پرست لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا کسی آزمائش سے کم نہیں..... نانی تو بڑی مردم شناس خاتون رہی ہوں گی جو انہوں نے آپ لوگوں کے لیے نیک اطوار و وضع دار گھرانوں کا انتخاب کر کے آپ کی زندگی کو گل و گلزار بنا دیا۔ شکایت تو مجھے ہوئی چاہیے مگر میں کروں گی نہیں کہ جانتی ہوں امی نے اپنی دانست میں میری خوشیوں ہی کا سامان کیا تھا اب یہ اور بات کہ ان کا پچا نہ غلط نکلا۔“

وہ اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بنا کسی کی جانب دیکھے سرعت سے کمرہ عبور کر گئی۔

اور پیچھے، آنکھوں میں آنسو لیے دم بخود بیٹھی رہ گئیں وہ تینوں کہ جنہیں آج اپنے دیرینہ سوال کا جواب کسی طمانچے کی صورت مل چکا تھا!!





عنیزہ سید

# انٹی وکی دھار

مکمل ناول

اس کے چھوٹے سے لان کی کیاریاں بے ترتیب تھیں۔ اشوکا اور میکونل کے درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے، موسمی اور امرود بے توجہی اور غفلت کے باعث مرجھائی ہوئی شکل کے ساتھ سرنبوڑائے لئے نظر آرہے تھے۔

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ زنگ آلود پھل والی کھربنی ہاتھ میں لیے کیارپوں میں بھرے مرجھائے پتے نکالتی ان کی تراش خراش میں مصروف تھی۔





کھربا کا دستہ ڈھیلا تھا اور اس کا ہاتھ کئی بار اس پر سے پھسل چکا تھا، ڈھیلے دستے کی کیل بھی اس کے ہاتھ میں چبھ رہی، لیکن اس روز وہ اس اجڑے، بے ترتیب لان کو ایک بہتر شکل دینے کا تہیہ کر کے اس میں داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ اس کا جھکا سر بھی ہلتا اور اس کے گردن تک کئے بال جھٹکا کھا کر گردن، کانوں اور ماتھے پر چھوٹے لگتے تھے۔

”خود سے ضد لگانا بھی کیسی عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔“ وہ اس مشقت بھری مصروفیت کے دوران سوچ رہی تھی۔ انسان اپنی ہٹ دھرمی کے سامنے شکست کھا جائے تو اپنی ہی نظروں میں شرمندہ شرمندہ رہنے کا حوصلہ کرنا پڑتا ہے اور اگر اپنی ضد میں جیت جائے تو جتنا سرخ و خود کو اپنے آئینہ دل میں دیکھ پاتا ہے وہ منظر کسی دوسرے کی نظر میں سہی نہیں سکتا۔ ”اپنے آپ کے سامنے دو انگلیوں سے رخ کا نشان بناتے، خود اپنے آپ سے ہائی فائیو کے انداز میں ہاتھ ملانے، خود اپنی نظروں کے سامنے پھونک سے پیشانی پر آتے بال ہٹانے اور کار اوپر نیچے کرنے کا مزہ اسی کچھ الگ ہوتا ہے۔“

اور یہ آخری الذکر سوچ ہی اس کے عزم اور جوش میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ سر جھکائے، نظریں کھربا اور ہاتھ کی جنبش پر جمائے، دماغ کو کام پر یکسو کیے وہ اپنے کام میں پوری طرح مگن تھی جب ہی تو کچھ دیر تک اسے دبے پاؤں چلتے، اپنے عقب میں آ کر کھڑے، دلچسپی سے اپنے کام کو سمجھنے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا

تھا۔ لیکن وہ فارسیہ سعودی جس کی قوت شامہ غیر معمولی تیز تھی۔ اپنے عقب پر موجود کسی دوسرے ذی روح کی موجودگی کا احساس اسے اس وجہ سے اتنی خوشبو کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ بل بھر میں اس کا کام میں مصروف ہاتھ رکھا تھا۔ یقیناً وہ خوشبو اپنی منگنی قیمت کا احساس چہار سو پچھلانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس نے دنیا کی مہنگی ترین خوشبوؤں کے بارے میں

تفصیل سے پڑھ رکھا تھا۔ یہ یقیناً ایسے ہی کسی برائے کی خوشبو تھی جس کے صرف ایک اونس کی قیمت ہزار ڈیڑھ ہزار ڈالر بتائی جاتی تھی۔

اس نے لمحہ بھر میں انداز لگایا اور اگلے ہی لمحے گردن موڑ کر دیکھنے پر بچپن میں پڑھی کہانیوں میں لکھے الفاظ ”پچھلے مڑ کر نہ دیکھنا پھر کے ہو جاؤ گے“ یکدم سچ لگنے لگے تھے۔ وہ یک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس کی بے یقین نظریں اپنے سامنے کھڑی لڑکی پر جمی تھیں۔ اس کی اپنے گھر میں موجودگی پر وہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اس کے ارد گرد کا پورا منظر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

اگر کوئی احساس باقی تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی اسی شان و شوکت، خوب صورتی اور انداز کے ساتھ جس نے پورے چار سال اسے ایک عجیب — اور ناقابل بیان احساس کمتری میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں سر اٹھا کر جینے کی عادی تھی، اس لڑکی نے اسے چار سال مرعوب کیے رکھا تھا اور اس وقت بھی اسے اپنے سامنے کھڑے پا کر وہی مرعوبیت اچانک اس کے ذہن پر طاری ہوئی تھی۔ اسے لگا وہ بولے کی تو اس کی زبان بھی لڑکھڑاہٹ کا شکار ہوئی۔ شاید اس لیے وہ جب چپ کھڑی اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ ”ہیلو.....!“ اس کی طرف سے استقبالیہ الفاظ سے مایوس ہو کر آنے والی نے اپنی ہلکتی آواز میں خود ہی اسے مخاطب کیا۔ جواب میں اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیلنے کی ناکام سی کوشش کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

”آ.....“ آنے والی نے ایک مرتبہ پھر اس کی طرف سے جواب سے مایوس ہو کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”بیٹھے کو نہیں کہو گی کیا؟“ ”اوہ، ہاں!“ دماغ کو ذرا سا جھٹکا لگا تھا اور ارد گرد کا منظر واپس اپنی جگہ آ کر جم گیا تھا۔ ”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا اور بغیر سوچے اپنے منہ بھرے ہاتھوں کو سفید قمیص کی پشت سے رگڑتے ہوئے

دائیں بائیں گردن گھمائی مینکولیا والی کپاری کے قریب لوہے کی پرانی زنگ آلود کرسی رکھی تھی جس پر کبھی کبھار ”بابا“ بیٹھ کر صبح کا اخبار پڑھتے نظر آتے تھے۔ اس کی نظریں اس کرسی پر جا کر رک گئیں، تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے وہ کرسی اٹھائی ہاتھ جھٹک کر اس پر گرے زرد پتے جھاڑے اور مختصر لان کے درمیان لاکر کھڑی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ کرسی اس کے شایان شان نہیں تھی۔ وہ ضرور ناک بھوں چڑھائے کی۔ اس کرسی کا پیش کیا جانا اسے سراسر اپنی بے عزتی محسوس ہوگا، لیکن اس وقت اس کا ذہن اس کے قابو میں نہیں تھا وہ بری طرح مرعوب تھی۔ لیکن اس کی توقع کے برعکس آنے والی مہمان ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ کہتی ہوئی اس کرسی پر براجمان ہوئی۔ تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

”بیٹھو نا۔ تم بھی تو بیٹھ جاؤ نا فارسیہ!“ وہ اس غیر آرام دہ کرسی پر خاصے آرام دہ انداز میں بیٹھنے کے بعد اس سے مخاطب تھی۔

”فارسیہ!“ اس نے زیر لب اپنا نام دہرایا اسے اسے تو میرا نام بھی یاد ہے۔ لیکن یہ یہاں..... کیسے، آخر کیوں؟“ اس کے ذہن میں سوال اٹھا تھا۔ ”کم آن بار..... میں تمہارے گھر تم سے ملنے آئی ہوں۔“ اس کی مخاطب جسے صرف دور دور سے دیکھ کر ہی متاثر ہوتے اس نے چار سال گزار دیے تھے اس کے ساتھ یوں بات کر رہی تھی جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ ”جانتی بھی ہو کہ کتنی مشکل سے گھر ملا ہے تمہارا۔“ وہ مسکراتی تھی۔

”بارا۔“ کالونی شہر سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر نہیں ہے۔ اور تمہارا گھر تو اس آخری لین میں ہے۔ میرے ذرا نیور نے تمہارا گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے گاڑی کا آدھے سے زیادہ فیول تو ضرور ہی جلا دیا ہوگا۔“ اس کے چہرے پر ابھی بھی وہی دلکش مسکراہٹ تھی۔

”لیکن تم..... تم تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے یہاں آنے پر تم خوش نہیں ہو..... ہے نا؟“ وہ جو کمریہ ہاتھ رکھے یورے دھیان سے اس

کی بات سن رہی تھی ایک دم چونکی۔ ”نہیں۔“ اس نے بے اختیار سر ہلایا۔ ”نہیں تو“ اور پھر گہرا سانس لینے ہوئے جیسی آواز میں بولی۔ ”میں ناخوش تو نہیں البتہ حیران ضرور ہوں۔ غیر۔“ وہ وہیں اس کی کرسی کے قریب بیچلان کی گھاس پر بیٹھ گئی۔ ”ارے نیچے..... نیچے نہیں بھی۔“ وہ مضطرب ہو کر کھڑی ہوئی۔

”اس اوکے، تم بیٹھو پلیز۔“ فارسیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کا کہا۔ ”میں تمہیں یاد بھی ہوں یا ایک سال کے وقفے میں سب بھول گئیں۔“ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اسے نہ صرف یاد تھی بلکہ شاید اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس سے نا صرف مرعوب تھی بلکہ وہ اس جذبے کو کوئی نام دینے سے بھی قاصر تھی جو اس کے دل میں اس کے لیے پلٹا تھا۔ کوئی جان لیتا تو نجانے اس کو کیا نام دیتا، رشک، حسد یا پھر کچھ اور۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے بے نیازی کا سا چولا اوڑھنے کی کوشش کی۔ جبکہ اسے پکا یقین تھا کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہی رہی ہوگی۔ جب ہی تو اس کے گھر آنے والی مہمان نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ناک سیکڑ کر مودبانہ انداز میں اس سے پوچھا تھا کہ اسے پینے کو پانی مل سکتا تھا۔

”اوہ..... ضرور!“ فارسیہ کے دماغ میں کرنٹ سا دوڑا، وہ اس کی مہمان تھی اور مہمان نوازی کا تقاضا تھا کہ وہ اسے خوش دلی سے چائے پانی کا پوچھتی۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ ”میں ابھی لائی“ وہ رہائشی عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

کچن تک پہنچتے پہنچتے اس نے شاید سوطر طرح کے مشروب سوچ لیے تھے جو اس کی مہمان کو پینے کی عادت ہو سکتی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی مشروب اس کے گھر میں موجود نہیں تھا۔







”نہیں۔“ جواب میں حرم کا سر بھی اٹکار کی صورت ہی میں ہلاتا تھا۔ ”میں جانتی تھی وہ یہاں نہیں مل سکتا تھا، بھیجی بھی نہیں۔“ فاریہ نے اس کی نظروں اور لہجے میں چمکتا مسخر محسوس کیا اور دل ہی دل میں تلخ ہوئی۔

”لیکن۔“ حرم کی آنکھیں چند لمحوں کے وقفے کے بعد دوبارہ سے برسنے لگیں۔ ”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا مسئلہ اس دنیا میں صرف تم حل کر سکتی ہو صرف تم۔“

فاریہ اسے نا سنجھی سے دیکھتی رہ گئی۔ اب وہ صرف وہ الفاظ سن رہی تھی جو حرم خرم خان کے منہ سے نکل کر اس کی سماعت تک پہنچ رہے تھے۔

☆☆☆

”اس نے تم سے کہا اور تم نے مان لیا۔“ عموماً ابنا ہنسنے کی میز پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ ناشہ کرتے ہوئے اس کی بات دھیان سے نہیں سنتے تھے۔ لیکن یہ بات ایسی تھی جس نے انہیں بھی بری طرح چونکا دیا تھا۔ انہوں نے اخبار سے نظر ہٹا کر فاریہ کو دیکھا وہ سر جھکائے ہاتھ کی انگلیاں جھنجھاتی نظر آئی۔

”مطلب تم نے واقعی؟“ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ کو کیا پتا وہ کس بری طرح رو رہی تھی۔“ فاریہ جانتی تھی اب اس کی یہ بات سن کر بری طرح چونکیں گے۔ پھر بھی اس نے شکوہ بھری نظروں سے انہیں یوں دیکھا جیسے ان کے چونکنے پر پرمان لگی ہو۔ ”وہ روئی اور تمہارا دل بچ گیا۔“ ابانے تشویش کے مارے آنکھوں پر لگا چشمہ بھی اتار دیا۔ ”جانتی بھی ہو کہ تم نے اس سے کس کام کا وعدہ کر لیا؟“

جواب میں فاریہ کا انکار میں ہلکا سر دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئے۔

”نہیں جانتی کیا؟“

”اس وقت مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس

کے سامنے کس کام کی ہامی بھر رہی تھی۔ میں صرف اس کی روٹی آنکھیں دیکھ رہی تھی جو مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی اور کھڑکی کے قریب جا کر رک گئی۔ کھڑکی کے شیشے کے پار اس کا جانا پہچانا منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ”وہ کہاں ایسے رونے کی عادی ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔“ اس نے گردن موڑ کر ابا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کون ہے، کہاں سے آئی تھی اور اپنا کام نکالنے کے لیے اس کی نظر کرم تم ہی پر کیوں پڑی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ دو طاقت ور بیویوں کی لڑائی کے درمیان تم اپنے سینک گھسانے کا وعدہ کر بیٹھی ہو، جبکہ تمہارے اپنے سینکوں کے کنارے گھسے ہوئے ہیں، بلکہ تمہارے سینک بالکل ناکارہ ہیں۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ جو سینک اس لڑائی کے درمیان گھسیں گے وہ میرے ہوں گے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”مطلب؟“ ابانے ایک بار پھر چونک گئے۔ ”اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب، حرم سے وعدہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں تو آپ تھے۔ آپ کر سکتے ہیں اس کا کام۔“

اسے لگا ابانے کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا جب ہی وہ اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے جواب کے بعد بھی وہ اپنا سوال بار بار دہرانا چاہتے ہوں۔

”آپ کی بات سن لے گا وہ، آپ کہیں گے تو۔“ اس نے ابا کے قریب جا کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اپنا شانہ جھٹک کر اس کا ہاتھ گرا دیا۔

”بہت غلط توقع لگا بیٹھیں تم مجھ سے۔“ انہوں نے غصے سے انداز میں کہا۔

”دیکھیں ابا!“ اس نے عقل مند بننے کا مظاہرہ

کیا۔ ”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔ ”ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔“

”مطلب آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام میں خود کروں، میں اس منکر، مفرد، خود کو آسان سمجھ کر زمین پر رہنے والوں سے بھی بکھار مخاطب ہونے والے سے بات کروں۔“ وہ ان کی نظروں کے عین سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔

”میرے چاہنے نہ چاہنے کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ اس لڑکی سے وہ جو کوئی بھی تھی اس کی مدد کا وعدہ تم نے کیا تھا میں نے نہیں۔“ ابانے خود کو اس سارے قصے سے صاف نکال لیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔“ وہ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا لہجہ دھیما ہوا اور اس نے ملتی جلتی نظروں سے ابا کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن یہ کہ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے تم کو اس بے مقصد اور فضول وعدے سے بچر جانا ہے یا اسے نباہنا ہے۔“ ابانے اپنے اخبار اور ناشہ کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے۔

”وہ لڑکی بھی اسی شہر میں رہتی ہے اور اس کا محبوب بھی، وعدے سے مکر نہ اور نہ اپنے دونوں کے راستے ایسے ہیں جن سے تم واقف ہو۔“

”آپ جانتے ہیں میں یہ دونوں کام ہی نہیں کر سکتی۔“ فاریہ کا لہجہ بھگ گیا تھا۔

”یہ خیال تو مجھیں بلا سوچے سمجھے وعدہ کرنے سے پہلے آنا چاہیے تھا اور یہ بات میں جنہیں ہمیشہ سمجھاتا آیا ہوں۔“ وہ اس کا جواب سنتا نہیں چاہتے تھے جب ہی اخبار پر پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر ابا کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنی کرسی ٹھیک کر میز کے قریب کی۔ ”یونہی تو بونہی تھی۔“

ٹوسٹ کے سلاخ پر جیم لگاتے ہوئے وہ دانستہ بلند آواز میں بولی تھی تاکہ ابانے اس کی طرف سے چیلنج قبول کر لیا ہے۔ لیکن ان کی نظروں نے جنبش کی نہ ہی

زبان نے، گویا وہ اس معاملے سے مکمل لائق اختیار کرنے کے موڈ میں جا چکے تھے۔

☆☆☆

”دیکھیں نا باجی! کتنی عجیب سی بات ہوئی۔“ ریشماں نے فرش پر پونچھا لگاتے ہاتھ روک کر کہا اور اپنی ٹانگیں سیڑی کرنے کی خاطر فرش پر بیٹھ گئی۔ ”جب مراد نے پچھلے علاقے سے اس نئی کالونی میں آ کر بس جانے کا پروگرام بنالیا تو میں بڑی اداس ہو گئی۔“

ریشماں نے رک کر کن آنکھوں سے فاریہ کی طرف دیکھا جو لپ ٹاپ گود میں رکھے اس کی روٹن اسکرین پر نظریں جمائے کچھ دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر باؤسی اور نظروں میں الجھن کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا لیکن وہ ریشماں بھی جس کا دھیان اپنے مخاطب کی توجہ یا بے توجہی پر کم ہی جاتا تھا وہ صرف اپنی بات کرنے اور کرتے چلے جانے کی عادی تھی۔ سو اس وقت بھی اس نے فاریہ کی بے توجہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”یقین مانیں باجی! یہاں آ کر کتنے ہی مہینے میرا دل نہیں لگا۔ میں مراد سے کتنی بھی لوبھلا رہی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے، کہنے کو کالونی مگر اتنی بے آباد اور ویران، اس وقت تک تو اس بلاک میں کتنی کی صرف تین کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں، اب تو خیر سے کوئی پندرہ سولہ تو ہو ہی گئی ہوں گی۔“ اس نے تصور میں گفتی کرتے ہوئے کہا۔ ”یقین کریں باجی جس وقت مراد نے مجھے بتایا کہ اس نے چھوٹے صاحب جی کو یہاں دیکھا ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی اپنی نئی کوٹھی ادھر ہی بنوا رہے ہیں تو مجھے کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے رات کافی میں نے، صبح ہوتے ہی بھاگی ادھر چلی آئی، یہاں آ کر جو دیکھا تو صاحب جی تو واقعی ادھر کھڑے ٹھیکے دار سے باتیں کر رہے تھے۔ باجی ٹھیکے دار بشیر رشتے میں مراد کے مامے کا بیٹا لگتا ہے۔ بشیر اور چھوٹے صاحب جی کو اکٹھے کھڑے دیکھ



کر میری تو مانو عید ہوگی۔“ ریشماں نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ فاریہ کا نون میں لگے ایڑوں نکل کر گود میں رکھ رہی تھی۔

”لو یہ تو سن بھی نہیں رہی تھیں۔“ اس نے سوچا۔ ”خیر مجھے کیا۔“ اگلے لمحے اس نے اس بے نیازی کو بھی نظر انداز کر دیا۔

”میں نمائی بھی آپ سارے مطلب بڑے صاحب، بڑی بیگم، ان کے بچے، چھوٹے صاحب اور آپ سارے کے سارے ادھر آ کر بسنے والے ہو، پر پھر میں نے جب بشیر ٹھکے دار سے پوچھا کہ صاحب نے کتنی جگہ خریدی ہے کچھ بنانے کے واسطے تو باجی میں حیران رہ گئی آپ سارے بھلا سات مرلے کے گھر میں کیسے رہو گے۔ مراد کہنے لگا آج کل بڑے لوگ گھر ایسے ہی بناتے ہیں، نیچے تہ خانہ، پھر ایک منزل، اس کے اوپر ایک اور منزل اس کے اوپر چاہیں تو ایک منزل اور، سارے جی آرام سے رہ سکتے ہیں۔“

ریشماں کی نظریں لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر چلتی فاریہ کی اکھیوں پر جا کر گئیں۔

”میں نے تو باجی اسی وقت مراد سے کہہ دیا تھا۔ بے شک آپ پوچھ لینا مراد سے، میں نے کہا اور لوگ رہ لیتے ہوں گے سات مرلے کے گھر میں بڑے نمبر لے کر یہ محمود صاحب اور مسعود صاحب کے گھر والے ہیں۔“

یاد نہیں کتنے بڑے گھر میں رہتے تھے دونوں بھائی، ہائے باجی یہ بڑے بڑے کمرے اور بے شمار صفائی کرنے لگو تو ج سے شام ہو جائے، پچھواڑے میں اتنا بڑا صحن، گھر کے اگلے حصے میں بڑا سارا باغ باغچہ کھلی چھت، ہوا دار، روشن گھر..... میں مان ہی نہیں سکتی کہ دونوں بھائی اپنے بال بچے سمیت اس سات مرلے کے گھر میں رہ لیں، کرائے پر چڑھانے کے لیے بنوا رہے ہوں گے۔“

فاریہ کے کان میں ریشماں کی کوئی کوئی بات پہنچ رہی تھی۔ ویسے بھی ریشماں کی یہ باتیں وہ اتنی بار

سن چکی تھی کہ گفتگو کے دوران کہیں سے بھی دو لفظ سن کر وہ آگے کی پوری بات خود سن سکتی تھی۔

”پر باجی! جب مجھے پتا چلا کہ چھوٹے صاحب یہ گھر اپنی رہائش کے لیے ہی بنوا رہے ہیں اور یہ کہ آپ کے دو گھرانوں میں آپس میں اللہ معاف کرے لڑائی و لڑائی ہو چکی ہے اور پچھلا گھر، اماں جی والا جو تھا وہ بک گیا ہے اور آپ سب نے الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یقیناً ناو باجی! میرا تو دونوں تک بخار ہی نہیں اتر..... کیوں رجسٹر پڑ گئی دونوں بھائیوں میں، کیوں الگ الگ ہو گئے سب، میں رورو کر مراد سے ہی سوال پوچھتی رہی۔ اب بھلا اسے کیا معلوم، پیچھے کیا ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا۔ ہم تو کب کے اس دوران، بے آباد کالونی میں جو آٹھ بیٹھے تھے۔ ویسے باجی! میرے لیے تو بہت اچھا ہو گیا پر چھوٹے صاحب نے شہر سے اتنی دور اسی کالونی میں کیوں آ کر پلاٹ خرید لیا رہنے کو گھر بنانے کے لیے۔“

ریشماں نے بائیں کان جس کا رخ فاریہ کی طرف تھا کا دوپٹہ پیچھے کھسکا کر گویا سماعت فاریہ کی طرف مبذول کی۔

”کیونکہ پورے شہر میں سب سے سستی زمین ادھر ہی مل رہی تھی۔“ فاریہ نے مایوسی بھری سرد آہ کے ساتھ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے ریشماں کو حقیقت بتائی۔ ”سات مرلے کا پلاٹ خریدنے کے بعد اماں کے پاس یہ مشکل اتنی ہی رقم پئی تھی کہ یہ مختصر سا گھر تعمیر کروا لیتے۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا۔“ اس نے ریشماں کی طرف دیکھا۔

”کوئی نہیں جی۔“ ریشماں نے اس کا جواب سن کر مایوسی سے سر ہلایا۔ ”جو جی چاہے کتنی یہ آپ کے رہنے والی کالونی نہیں تھی۔ ابھی بھی دیکھو اس کی تو سڑکیں بھی پوری نہیں بنیں۔ اس پلاٹ میں تو شکر کریں کہ پانی، بجلی سب مل رہا ہے، گیس ہی کا تھوڑا مسئلہ ہو جاتا ہے نا، باقی بلاکوں میں تو اکثر جگہ یہ سب بھی نہیں مل رہا۔“

”کیا کریں ریشماں! رہنا تو ہے نا، اب چھوڑ کر تو نہیں جا سکتے۔“ اس نے لیپ ٹاپ گود سے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے کہا اور خود صوفے پر پاؤں چڑھا کر بیٹھ گئی۔

”ج کبہ رہی ہیں باجی!“ ریشماں نے منہ بناتے ہوئے سر ہلایا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اب اس کے چہرے پر تجسس تھا۔ ”مراد بتا رہا تھا کہ وہ تو میرا مطلب ہے بڑے صاحب اور ان کا بال بچہ تو شہر کے سب سے اونچے علاقے میں یہ بڑی کوئی بلکہ مراد تو کہہ رہا تھا کچھ کیا ہے محل ہے محل، اس میں رہ رہے ہیں، چار بنی چشتی گاڑیاں تو خود مراد دیکھ کر آیا تھا ان کے گھر میں.....“

”ہوں!“ فاریہ کے لہجے میں بے توجہی اور بے نیازی دوبارہ سے اتری۔

”اماں جی کے گھر پر تو دونوں کا آدھا آدھا حق تھا نا برابر برابر..... پھر بڑے صاحب نے سب سے مہنگی کالونی میں گھر کیسے بنا لیا باجی؟“ ریشماں ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”تمہاری سب اچھی عادتوں کے ساتھ ایک یہ ہی عادت بری ہے ریشماں کام چھوڑ کر کہیں لگانے بیٹھ جاتی ہو۔“ فاریہ کا لہجہ بدل گیا۔ ”جب ہی روزانہ سب کام لیٹ ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں تو باجی!“ ریشماں نے ہاتھ دوبارہ فرش پر لگانے کے کپڑے پر جمالیے۔

”میں تو بچی ذرا سانس لینے کو رکھتی تھی۔“ وہ کپڑے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور فاریہ ریشماں کے ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ فرش کے گیناٹٹ ٹاٹکڑ کو ہم ہوتے دیکھ رہی تھی۔

”مسئلہ تو کوئی ایسا بڑا نہیں ریشماں! کہ جیسے بیان کرنے کے لیے دنیا غورث کی مدد لیتی پڑے۔ بتا تو میں بھی تمہیں بہت سادہ اور آسان لفظوں میں سکتی ہوں کہ تمہارے بڑے اور چھوٹے صاحب کے درمیان اجا تک سے اتنا بڑا طبقاتی فرق کیسے آگیا اور کیوں وہ ایک دوسرے سے اتنے دور ہو گئے کہ سچ

میں آئی خلیج کو پائنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو کر رہ گیا۔ لیکن میں نے سارا قصہ بیان کرنا ہی نہیں چاہتی، کیونکہ اسے بیان کرنے کے لیے دوبارہ سے اتنی ہی اذیت سے گزرنا پڑے گا جتنی اس سارے واقعے کے ہونے کے دوران اٹھانی پڑی تھی۔ اسی لیے تو تمہارا یہ سوال ہمیشہ سوال ہی رہتا ہے۔ اسے کوئی جواب نہیں مل پاتا۔“ اس نے سوچا تھا۔

”سچ ہی کہتا ہے مراد، ان بڑے لوگوں کے دل بہت گہرے ہوتے ہیں، اندر کی باتیں اندر ہی رکھتے ہیں کسی کے سامنے اپنا دل کبھی نہیں کھولتے۔“ دوسری طرف ریشماں فرش پر پونچھا لگتی لاؤنج سے ڈانٹنگ روم تک۔ سفر کرتی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ آتی سردیوں کا ایک خوشگوار نیم خشک دن تھا، ایسا دن جب سورج کی تمازت جسم کو اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ دن گزشتہ کئی دنوں سے زیادہ خوش گوار تھا شاید اسی لیے اس نے اس روز اس مشکل مہم کو سر کر لینے کی ٹھان لی جس میں حرم خرم خان اسے ڈال گئی تھی۔

”ہوں!“ اس نے اپنے مختصر وارڈروب پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ”ایک ہالی پرو فائل انسان کے سامنے جانے کے لیے انسان کا حلیہ کیسا ہونا چاہیے؟ یقیناً بہترین جواب فوراً آیا تھا۔“

”لیکن اگر یہ ملاقات دل پر پھر رکھ کر کی جا رہی ہو تو حلیے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس ملاقات کے دوران کیا ہونے والا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکا لہذا حلیے پر توجہ دینا بے فوٹی ہوگی۔“ اس نے عام سی جینز اور کرنی کا انتخاب کرتے ہوئے سوچا۔

”سنا ہے موصوف اور ان کے والد صاحب کا ملٹی اسٹوری دفتر اتنا بڑا ہے کہ چلتے چلتے اوپر مندریں اترتے چڑھتے سانس پھول جاتا ہے، لہذا جوتا بھی ایسا ہونا چاہیے جو اس مہم میں مجھے آبلہ پا ہونے سے بچا سکے۔“



آرام دہ خاصے پرانے مگر نرم جوگز میں پیر ڈالتے ہوئے اسے خیال کیا تھا۔

لب اسٹک کی ایک ہلکی تار اور آنکھوں میں آئی لائز کی ہلکی لکیر اگرچہ میرے چہرے پر کوئی خاص فرق نہیں ڈالتے والی لیکن اعتماد قائم رکھنے میں شاید مددگار ہو۔

وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ حرم خرم خان کی مدد کو پہلے وہ تیار کیوں ہوئی اور اب اس مدد کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ یوں خود کلائی میں مصروف تھی۔ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھی یا پھر اعتماد کی کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس سے پہلے گھر سے کسی کام کے لیے نکلتے ہوئے اس نے خود کو بھی بہادر بنو، بہادر بنو کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بال بتالینے کے بعد گلے میں اسکارف ڈالتے ہوئی دیوار سے جڑے آئینے میں اس نے خود پر نظر ڈالی اور کئی دن سے تیار کی دوران یاد کیے مکالمے ایک بار پھر دہرانے لگی۔

”دیکھو جبران محمود! اس وقت یہاں یوں تمہارے سامنے کھڑے ہونے کے پیچھے صرف ایک ہی وجہ کار فرما ہے اور وہ ہے میری مردوت۔“ اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے دہرایا۔ ”اگرچہ مجھے تم سے کبھی کسی بھلائی کی توقع نہیں رہی لیکن پھر بھی تم سے کہہ رہی ہوں کہ کہیں تو اپنے انسان ہونے کا ثبوت دے دیا کرو۔ دوسروں کے معاملے میں نہ سہی خود اپنے معاملات سیدھے اور صاف رکھنے کی خاطر ہی سہی۔“ وہ سانس لینے کو رکھی اور آنکھیں میچ کر چمت کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آگے کیا تھا بھلا؟“ اس سے پہلے کہ اسے آگے کے جملے یاد آتے دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد ابا کی آواز نے اس کا ارتکاز توڑ دیا۔

”جی ابا!“ اس نے دروازے کی طرف گردن موڑتے ہوئے کہا اور ان کے کمرے کے اندر آ جانے پر خود بھی ان کی طرف گھوم گئی۔

”کہیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس کا حلیہ

دیکھ کر چوکنے لگے تھے۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”کہاں؟“

”حرم خرم خان کے دل کا ٹوٹا ہوا نکلتن جوڑنے کا، جو وعدہ کیا تھا اسے نبھانے جاری ہوں۔“ اس نے بیڈ پر رکھا شولڈر بیک اٹھاتے ہوئے ابا کے چہرے پر نظر ڈالی جو اس کی بات پر ذرا سا گھبرا گئے تھے۔

”وہاں، کہاں؟“ انہوں نے گڑبڑا کر سوال کیا۔ ”کس کے پاس؟ اور کیسے؟“ اسے ابا کی پریشانی پر پیار سا آ گیا۔

”میرا مطلب ہے اس وقت۔“ انہوں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت وہ گھر پر تو نہیں ملے گا۔“

”آپ کا خیال تھا میں اپنے پیروں پر چل کر اس سے ملنے اس کے گھر جاؤں گی۔“ اس بار وہ حیران ہوئی۔

”تو پھر کہاں جاؤ گی؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سنا ہے شہر کے سب سے بڑے کمرشل ایریا میں ان کا یہ بڑا دفتر ہے جس میں بیٹھ کر وہ ڈالروں میں کما کر روپوں میں تبدیل کرنے کا کام کرتے ہیں۔“

”وہ جو بھی کرتے ہیں تمہارا لہجہ کیوں تلخ ہو رہا ہے، جیسے کہیں ان کے کسی کام پر غصہ آ رہا ہو۔“ ابا کا دھیان اس کے لہجے پر گھبرا گیا۔

”مجھے کیوں غصہ ہوگا۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”میں تو آپ کو صرف یہ بتا رہی تھی کہ میں ان کے گھر نہیں دفتر جاری ہوں۔“

”جہاں تم نے اور بہت کچھ سنا ہے وہاں شاید یہ بھی سنا ہوگا کہ ان سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا پڑتا ہے۔ یوں بن بتائے چلی جاؤ گی کیا؟“ ابا نے اسے یاد دلایا۔

”میں نے حرم سے اتنا ہی وعدہ کیا تھا کہ میں

اس کام کی خاطر وہاں جاؤں گی۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اگر وہ نہ ملا تو میں زبردستی اس سے ملاقات کر کے ہی آؤں گی۔“

”گویا تمہارا وعدہ صرف اس تک جانے کا تھا۔“ ابا مسکرائے۔

”جی ہاں۔“ اس نے بازو سامنے باندھتے ہوئی سر کو ذرا سا بلند کیا، وہ ابا سے نظریں چرایا تا چاہتی تھی۔

”سوچ لو۔“ ابا مزید مسکرائے۔

”سوچ لیا اور اب مجھے جانے دیں۔ باتوں میں الجھ کر میں پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوں۔ واپس آ کر مجھے کھانا بھی بنانا ہے۔“

”کیا بناؤ گی آج؟ دیکھی یا دیکھی۔“

”شلیم کی بجلیا۔ کافی فرمائشیں آ رہی ہیں اس کی۔“

”ہوں۔“ انہوں نے سر جھکا لیا اور پھر نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ جو تم جاری ہونا کسی ہم پر اپنے تئیں۔“

”جی۔“ فارہ نے ان کے انداز سے ذرا بھی متاثر نظر نہ آنے کی کوشش کی۔

”اسے ہماری مادری زبان میں شلیم پر سے مٹی جھاڑنا کہتے ہیں۔“

”آپ کی مادری زبان میں شلیم کو شلیم نہیں کہتے، میں جانتی ہوں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”جو بھی کہتے ہیں، اسے چھوڑو۔“ وہ اٹھ کر اس کا راستہ روکنے کے لیے اس کے سامنے آ گئے۔

”مت جاؤ۔ جانتی بھی ہو کہ وہ دونوں باپ بیٹے کیسے خود سر اور بد مزاج ہو چکے ہیں۔ کتنے سال گزر گئے آپس میں ملے نہیں، بات نہیں کی۔“ ابا کا لہجہ نرم تھا یا آنکھیں، فارہ سچ سے اندازہ نہیں لگا پائی۔

”وہ چار سال تمہارے ساتھ اسی یونیورسٹی، اسی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتا رہا۔ اس نے مجھیں بھی سلام تک نہیں کیا۔ تم اس کے پاس جاؤ گی کسی تیسرے

یوں ہی خواہ مخواہ سامنے آ جانے والے ٹھہس کے لیے۔“ وہ اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ ”مت جاؤ۔۔۔۔۔۔ جن ملاقاتوں کے بارے میں پہلے سے معلوم ہو کہ نا کام ہوں گی، ان کا اہتمام کرنا ہی نہیں چاہیے۔“

”آپ کا خیال ہے میں اپنی خوشی اور دل سے جاری ہوں۔“ وہ ابا کی طرح آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کر سکتی تھی اسی لیے ان کے بجائے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ایسا نہیں ہے ابا، میں صرف وہ وعدہ نبھانے جاری ہوں، جس کے بارے میں آپ مجھے بتا رہے تھے کہ چاہوں تو اسے توڑ بھی سکتی ہوں۔“ وہ ان کے سامنے سے ہٹ کر وارڈ روب میں سے کوئی ایسی چیز نکالنے کے لیے برومی جواسے چاہیے ہی نہیں تھی۔

”میں نے بہت سوچا۔ مجھے لگا میں چاہ کر بھی وعدہ توڑ نہیں سکتی۔ آپ کو مولسری کا وہ درخت یاد ہے جو ہمارے پچھلے گھر کے صحن میں لگا تھا۔“ اس نے گردن موڑ کر ابا کی طرف دیکھا۔

”آپ کو یاد ہوگا میں نے اس گھر سے یہاں شفٹ ہونے تک ایک بھی دن اس کی دیکھ بھال کی طرف سے کوتاہی نہیں کی کیونکہ اس کی دیکھ بھال کا بھی میں وعدہ کر چکی تھی۔ اپنا دکھ، غصہ، اپنی اور آپ کی بے عزتی کا غم۔۔۔۔۔۔ کوئی ایک چیز بھی میں مولسری کے اس درخت پر نہیں نکال سکی۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خود کو وعدوں کی زنجیر میں جکڑنا ہی نہیں چاہیے۔ وعدے بعض اوقات بہت مسئلہ کرتے ہیں۔“ ابا کی آواز زور پڑی۔

”اب تو کر چکی وعدہ، لہذا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ دوبارہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وہی دلچہ بھر کر کی۔

”خدا حافظ۔“ اب کے اس نے براہ راست ابا کی طرف دیکھا تھا، جواب میں انہوں نے صرف اپنا سر ہلایا تھا۔



شہر کے نواح میں بی بی اس نئی بستی سے شہر کی طرف جانے کے دوران ایک بار اسے حرم نے فون پر یاد کیا تھا۔

”تمہیں میرا کام یاد ہے نا تم نے اس سلسلے میں کچھ کیا یا نہیں۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”دیکھو، ابھی تو میں اپنے بچن کے لیے گروسی کرنے جا رہی ہوں۔ اس موضوع پر تم سے بعد میں بات کروں گی۔ میرا مطلب ہے گھر واپس آ کر۔“

فاریہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے حرم سے غلط بیانی کیوں کی تھی، شاید اپنی مہم میں کامیابی کی ایک فیصد امکان کے نتیجے میں وہ اسے حیران کر دینے والی خبر سنا کر خوش کر دینا چاہتی تھی یا پھر نانوے فی صد ناکامی کے امکان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی کو کوئی بھی بہانا بنا کر ٹال دینے کا آپشن زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

”بچن کے لیے گروسی..... اوہ!“ حرم کے لہجے کا تسخیر جو بہت حد تک نامحسوس تھا، اس کی انا کو ہلکی سی ضرب دے گیا۔ ”وہی بچن نا جو اتفاق سے تمہارا اسٹوڈیو بھی ہے، تم نے بتایا تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں وہی بچن۔“ فاریہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

”میں نے کوشش کی تھی تمہاری ایک دو ویڈیوز دیکھنے کی، لیکن ایمان داری سے بتاؤں تو سچ میں وہ بہت خوف ناک تھیں۔“

”ہوں۔“ فاریہ کو یہ لفظ بولنے کے لیے خون کا ایک بڑا گھونٹ پینا پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے، مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے کہ ایسے قابل رحم کیرے اور لائٹ انٹیکسٹس اور ایسی مسکین ریکارڈنگ کے ساتھ تم شاید کبھی وہ نتیجہ حاصل نہ کر پاؤ جو تم نے اپنے لیے سوچ رکھا ہے۔“ حرم میں خرم خان کی بیٹی ہونے کا رنگ جھلکے لگا تھا۔

قدموں کو واپس مڑنے نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اگر حرم اسی طرح گفتگو کرتی رہے تو کون جانے وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کیا فیصلہ کر لیتی۔

”چلو ایک ڈیل ڈن کر لیتے ہیں۔“ لیکن حرم بات ختم کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

”بولو۔“ اس کی لولہ وکین میز و اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ وہ فون کان سے لگائے وکین سے اتر کر اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”اگر تم نے میرا کام کر دیا تو میں تمہیں تمہارے گھر میں ایک اسٹٹ آف دی آرٹ بچن سیٹ کر کے دوں گی۔ بہترین کیرے اور ویڈیو ریکارڈنگ سسٹم بھی گفٹ کروں گی۔ ہر طرح سے تمہاری مدد کے لیے موجود رہوں گی، تم دیکھنا میں تمہارے لیے کیا کیا کروں گی۔ بولو منظور ہے؟“

فاریہ کے تیزی سے چلتے قدم سست پڑنے لگے۔

”بولو نا، چپ کیوں کر گئیں۔ کچھ کی رہ گئی ہو اس ڈیل آفر میں تو وہ تم خود سے شامل کر لو۔ شاید میں کچھ بھول گئی ہوں۔“ حرم کہہ رہی تھی۔

فاریہ کی نظریں ذلیل چیز پر پیٹھے ایک بزرگ اور ان کی ذلیل چیز کو آگے بڑھانی ایک ادھیڑ عمر خاتون پر جا رہی تھیں۔

”بولو فاریہ! خاموش کیوں ہو گئیں۔ منظور ہے یا نہیں۔“ حرم کی آواز کان میں گونجی۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔

”رکیں۔ میں لے جاتی ہوں انکل کو۔“ فون بیک میں رکھنے کے بعد وہ بے اختیار ادھیڑ عمر خاتون کی طرف بڑھی تھی۔

”اس برقی زینے پر چلی تو جائے گی نا ذلیل چیز۔“ خاتون پوچھ رہی تھیں۔

”جی ہاں۔“ بزرگ اور خاتون کو نکٹ کاؤنٹر پہنچا کر نکٹ لے کر دیتے وہ بھول گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے اسے حرم کی باتیں بہت بری لگ رہی تھیں اور اسی

ناگواری کے نتیجے میں وہ حرم کی خاطر جبران محمود سے ملے جانے کا ارادہ ترک کر چکی تھی۔

”شکریہ، اللہ تمہیں جزا دے۔“ ادھیڑ عمر خاتون اپنی نشست پر بیٹھ کر اس کو دعا دے رہی تھیں اور وہ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے بس میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ منزل پر پہنچ کر حرم کا کام کرنا تھا یا یوں ہی واپس آ جانا تھا۔

☆☆☆

”محمود صاحب تو مجھ کو دنیا سے بالکل بیزاری ہو چکے ہیں۔“

پچھلے گھر میں ریشماں نے فاریہ کی عدم موجودگی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچن کا پچھلا دروازہ کھول کر مراد کو بچن میں گھسایا تھا اور اب دھلے برتن جاذب کپڑے سے خشک کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

مراد کو اس روز فاریہ نے گھر کی بالائی منزل کے کمروں کی کھڑکیوں کے تختے باہر سے صاف کرنے کے لیے بلا رکھا تھا۔ فاریہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے تک وہ ادھیڑ میز پر بیٹھا تختے صاف کر رہا تھا اور اب بچن چیز پر بیٹھا چائے کا کپ تھامہ میں پکڑے ریشماں کی وہ باتیں سن رہا تھا جو پہلے بھی کئی بار سنا چکی تھی۔

”بتایا تو تمہیں، محمود صاحب نے اچھا نہیں کیا محمود صاحب کے ساتھ۔“ مراد نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد ریشماں کی تسلی کے لیے کہہ اس کی بات سن رہا تھا، کئی بار کا دہرایا جواب ایک مرتبہ پھر دہرایا۔

”یہ بھی تو سنی سنائی ہی ہے نا کہ محمود صاحب کے پاس پیسہ نا جائز کمائی سے آیا۔“

ریشماں کو محمود صاحب کی بیگم جو اس کی پرانی بانی تھیں بھلائے نہیں بھولی تھیں، کیسا سونا سادہ تھا ان کا، نرم گفتار، دیا لولہ، سلیقہ مند، ہر کسی سے پیار، محبت کا رشتہ۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اس کی بانی شوہر کو ناجائز کمائی کرنے دے سکتی تھیں، اتنی تو وہ اللہ والی

بانی تھیں۔

”یوں ہی تو مسعود صاحب نے اپنے اس بھائی سے لافعلی اختیار نہیں کر لی جس کو دیکھ دیکھ کر جیا کرتے تھے۔“ مراد نے کندھے پر رکھا کپڑا اتار کر بچن ٹیبل کے تختے پر گرے چائے کے قطرے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر محمود صاحب کی وہ پرانی اور اب والی حیثیت نہیں دیکھتیں تم، زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”ہوگا بھئی اندر چوری جیسے کھاتے کوئی غلط، صبح کا چکر۔“ ریشماں نے خشک چٹیل ریک میں رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”میرا دل تو بس ان چھوٹے صاحب کو دیکھ کر دکھتا ہے، ایک تو بھائی الگ ہو گیا، اوپر سے ریشماں بھی ہو گئے۔“

”ریشماں منٹ خودی ہے، چھوٹے صاحب نے، ابھی ان کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں۔“ مراد نے یاد دلایا۔

”چلو یوں ہی سہی مگر وہ بھی تو بیماری کی وجہ سے لینی پڑی نا، صابرہ خالہ بتا رہی تھیں اتنے بیمار بڑ گئے تھے کہ بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔“ ریشماں مراد کے سامنے رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

”سدا کا ساتھ تھا بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کا۔ دونوں بھائیوں کے سلوک اور محبت کی لوگ مثال دیا کرتے تھے۔ اماں بتایا کرتی تھیں کہ جب فاریہ بانی کی۔ امی کا انتقال ہوا تو بڑے صاحب کی، بی بی جو تمہاری پرانی بانی تھیں نے بچی کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کامران، عثمان اور چچان بھائی کی طرح پالا، فاریہ بانی کو یوں جیسے کوئی سکی اولاد کو پالتا ہے۔“

مراد کی مرحومہ والدہ اس گھرانے کی پرانی ملازمہ تھیں، اسی لیے مراد کو خاندان کی تاریخ ریشماں سے زیادہ یاد تھی۔

”اللہ ہی جانے کس کی نظر لگ گئی دونوں بھائیوں کو۔“

ریشماں نے میز پر بچی بڑی کی ٹوکری سے شلجم



نکال کر چھیلنے شروع کیے۔

”آپ کوئی دونوں بھائیوں کو دیکھے تو کبھی نہ مانے کہ یہ کبھی مسلم ٹاؤن والے گھر میں اکٹھے رہا کرتے تھے یہ چھوٹے صاحب کا گھر.....“ اس نے نظر اٹھا کر ارد گرد نظر ڈالی۔ ”اتنا چھوٹا اور ایسی ویران کالونی میں، مانو جنگل ہی میں آج ہے۔“

”اور ادھر جا کر دیکھو کبھی بڑے صاحب کی ڈیفنس والی کوٹھی، کوٹھی کیا محل ہے محل۔ انگریزی میں ویسے گھروں کو کچھ اور ہی بولتے ہیں نہ بلکہ نہ کوٹھی کچھ اور ہی بلا ہے وہ۔“ مراد کی آنکھوں میں چمک اتری۔ ”اور سنا ہے اب تو ادھر بیدیاں روڈ پر فارم ہاؤس بھی خرید لیا، انہوں نے خدا جانے کتنے کنال کا تو رقبہ ہے اس فارم ہاؤس کا۔“

”چھوڑو۔“ ریشماں کو بڑے صاحب کی موجودہ حیثیت کا تصور کر کے ہی جھرجھری سی آگئی۔ ”اب ہم جیسوں کو تو وہ ملازم بھی نہ رہیں اپنے گھر میں۔ خود ہی تو بتا رہا تھا کہ ان کے ہاں ملازم ٹریننگ کے بعد رکھے جاتے ہیں۔“

”اور کیا۔“ مراد کے چہرے پر رشک ابھرا۔ ”ایک بار میں ملنے کا بہانا کر کے گیا تھا۔ ان کے کچن کا اسٹاف ہاتھوں پر دستاں پہنے بغیر کام نہیں کرتا۔ یہ چھوٹے صاحب کا گھر ہی ہے جہاں تم عام صابن سے ہاتھ دھو کر سبزی چھلنے بیٹھ گئی ہو۔“

”ہمیں وہاں کام کرنا بھی نہیں ہے، اپنے چھوٹے صاحب ہی بھلے۔ سیدھے سادے، نہ کوئی خزا نہ شوشا۔ جیسے ہم خود سیدھے ویسے ہمارے صاحب۔ میں تو شکر کرتی ہوں، یہ بھی اسی کالونی میں آجے ورنہ مجھے ان نئے نئے پیسے والی باجیوں کے گھر کام کرنا پڑتا جو بات بے بات۔ رعب بھانے پر تلی رہتی ہیں۔“ ریشماں نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک ہی مسئلہ ہے ادھر۔“

”وہ کیا؟“ مراد مسکرایا۔

”فاریہ باجی کا چکن اور کیا۔“ ریشماں نے مراد کی طرف دیکھا اور دونوں بے اختیار ہنس دیے۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ بھی۔ فاریہ باجی کا کچن ہی تو ہے جو مجھے بھی کیرا پکڑنا اور ویڈیو بنانی آگئی۔ تھوڑے پیسے بھی مل جاتے ہیں اور جو کھانا وہ پکاتی ہیں، اس میں سے حصہ بھی۔“ مراد نے سنجیدہ نظر آتے ہوئے کہا۔

”کھانا۔“ ریشماں نے منہ بتایا۔ ”کھانے بھی تو وہ اپنی دادی اماں والے انداز میں پکاتی ہیں اور چیزیں بھی جن کے نام بھی لوگ نہ مانتے ہوں۔ شلیم، بالک، میٹھرے، میٹھی کی روٹیاں، لسی اور ساگ، مکھڑی حلوہ، ساگو دانے کی کھیر۔“

”یہی تو اسٹائل ہے پگلی۔“ مراد مسکرایا۔ ”فاریہ باجی کہتی ہیں آج کل کے مارڈن لوگ پرانی چیزوں پر مرنے لگے ہیں۔ انہیں ہی دوبارہ زندہ کر رہی ہیں۔ کیا کر کے بولتی ہیں وہ وہ یاد کرنے لگی۔“ ”وین یاد آ جانے پر اس نے پٹلی بجائی، وینچ اور پرمیو۔“

☆☆☆

اس علاقے کو شہر کی معاشی و اقتصادی سرگرمیوں کا دل کہا جانے لگا تھا اور ایسا گزشتہ دس پندرہ سال کے عرصے میں ہی ہوا تھا۔ شہر کے اس حصے کا حلیہ یکسر بدل کر رہ گیا تھا۔ آسمان کو چھوٹی کثیر المنزلہ عمارتیں سر اٹھائے قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی تھیں۔ کشادہ سڑکیں، دکانیں، ریستورانس، کیفے، یوں جیسے ایک خاص ترتیب دے کر سب کو ان کی باری اور جگہ دی گئی ہو۔

وقت جتنی تیزی سے گزرتا ہے اتنی ہی تیزی سے آنکھ کے سامنے کے منظر بھی بدل جاتے ہیں۔ اس نے تیز رفتار بس سروس کی بس سے اترنے کے بعد ایک دو لمحے اپنے ارد گرد دیکھنے کے بعد اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ بھی ایک کثیر المنزلہ عمارت تھی جس کے اندر اسے جا کر اپنی مطلوبہ کمپنی کا دفتر ڈھونڈنا تھا۔

کثیر المنزلہ عمارت کے اندر داخل ہونے کے بعد اسے ادھر ادھر خوار نہیں ہونا پڑا تھا۔ عمارت کا مکمل نقشہ ایک بڑے بورڈ کی شکل میں سامنے دیوار پر اپنی

جگہ دکھا رہا تھا۔ تیروں کے نشان اور منازل کے نمبر اسے تھے کہ کسی سے ان کے بارے میں پوچھنے کی وقت بھی نہیں پیش آتی تھی۔

”اور لوگ اپنے تئیں کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔“ برقی زبے پر سواتیری منزل کی طرف جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ دل ابھی بھی دو حصوں میں بٹا ہوا تھا اسے یہیں سے واپس چلے جانا چاہے یا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جانے میں صرف ایک قدم کا فرق تھا۔

”کیا ہے بھی فاریہ تم کون سا کسی سے قرض مانگتے جا رہی ہو یا پھر کوئی پچھلا حساب پکڑنے کا معاملہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے تم ایک دھمی دل کے درو کے مددے کی خاطر یہاں پہنچی ہو تو پھر اپنا کام کے بغیر واپس چلے جانا کا کیا مطلب۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا اور پھر گھر اسانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول کر مرکزی دروازے کو اندر کی طرف دھکیل کر اس نئی اور اجنبی دنیا میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

”میں نے پوچھا تھا ٹھیکے دار صاحب ہے۔“ مراد نے چھوٹے صاحب کے قدموں میں بھیجی سوگی گھاس اور بے ضرر خشک جھاڑیوں پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”اس بار انہوں نے اس جھیل میں پونگد نہیں ڈلوایا تھا جی چھلی کا۔“

اس کی نظریں جھیل کے پانی کی گہرائی میں سے نظر آتے کانٹے پر جمی تھیں۔ جس کا ایک سرا چھوٹے صاحب کے ہاتھ نے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے چھوٹے صاحب کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر سکوت تھا اور ٹھہرا ہوا بھی۔

”مچھلی نہیں پھنسنی جی۔“ مراد نے انہیں یقین دلانے کے انداز میں سر ہلایا۔ ”ہوئی تو پھنسنے کی تا جی۔“

”تم جانتے ہو، میں یہاں آنا چھوڑوں گا نہیں۔“ جواب میں وہ ساٹ لہجے میں بولے تھے۔ ”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں ادھر مچھلیاں

پکڑنے آتا ہوں۔“ وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ”مچھلیاں پکڑنے نہیں آتے تو پھر کیوں جی؟“ مراد نے اس سوال کو الفاظ نہیں دیے تھے لیکن سوال اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا۔

”خود کو، مطلب اپنے آپ کو پکڑنے آتا ہوں میں۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ ”اور اس میں مچھلیاں بھی پھنسا لیتا ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کانٹے کی ڈوری ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مچھلیاں؟“ مراد نا جھکی کے ساتھ بھی کانٹے کو اور کبھی چھوٹے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آس کی مچھلیاں، امید کی رنگ برنگ مچھلیاں، آنے والے دنوں کے خواب جتنی مچھلیاں۔ سب چھپتی ہیں، مہرے کانٹے میں۔“ ان کی آواز معمول سے ذرا بلند ہوئی مراد کڑبڑا کر رہ گیا۔

”میں نے بتایا نا۔ میں یہاں یوں ہی نہیں آتا۔“ وہ مراد کو گھبراتے ہوئے دیکھ کر مسکرائے۔ ”اب جا کر اپنے ٹھیکے دار کو بتا دینا، وہ چاہے کچھ بھی کوشش نہ کرے اس جھیل کو آباد رکھنے کی، میں پھر بھی یہاں آتا ہی رہوں گا۔“

”جی۔“ مراد نے امتحان کی طرح سر ہلادیا۔ ریشماں کو سنانے کے لیے اس کے پاس ایک نئی کہانی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

صاف چمک دار فرش جس پر نظریں نہیں قدم بھی جھکتے تھے، بر نظریں جمائے وہ ریسیشن کاؤنٹر کے ساتھ رکھی نرم گداز کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ اسے جبران محمود سے ملنا تھا، وہ ریسیشن پر بیٹھی

جدید انداز میں جی سنوری لڑکی کو وہ اپنی آمد کے ساتھ ہی بتا چکی تھی اور اس کے بعد پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اس لڑکی کو آپرینٹنگ بورڈ پر سچے مختلف رنگوں کے ٹیٹن دیا تے نجانے کہاں کہاں بات کرتا دیکھنے میں مگن تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے جبران



محمود....." میں منٹ کے انتظار کے بعد قاریہ نے گلا کھٹکھا کر کہنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے یاد ہے۔" لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے گلے میں لٹکا ایسپلائی کارڈ واضح نظر آنے لگا۔ وہ صاف تھی، بے حد پراعتماد اور بے نیاز تھی۔

"میں باس کے آفس ہی جا رہی ہوں، انتظار فرمائیے۔ واپس آ کر آپ کو بتائی ہوں۔" اس نے اپنے سامنے میز پر دھری، فائلیں اٹھا کر ان کو میز پر بچھا کر برابر کرتے ہوئے کہا اور اپنے سیاہ بند جوتوں کی اونچی ہیل پر ٹک کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"بہت بے وقوف، کم عقل اور بے ڈھنگی ہوں میں۔" اس کے جانے کے بعد قاریہ نے ایک بار پھر خود کو ملامت کی۔ وہ کیوں اس وقت اس جگہ پر موجود تھی اس کا اس جگہ اور اس کے مالکان سے کیا لینا دینا تھا۔ مروت اور لحاظ کے مارے یوں کسی کے کہنے پر ایسی ناپسندیدہ جگہ پر کوئی سر پھر ای براجمان ہو سکتا تھا۔

"چلیں جی، آجائیں میرے ساتھ۔" باس کے پاس آپ کے لیے پندرہ منٹ خالی ہیں۔" ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ لڑکی کمرے میں واپس آئی تھی۔

"پندرہ منٹ۔" قاریہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں ٹھیک پندرہ منٹ، ایک سیکنڈ کم نہ ایک سیکنڈ زیادہ۔"

ایمانت کے بغیر آنے والوں سے باس کسی صورت نہیں ملتے۔" کمرے سے باہر نکل کر جتنے ٹائیکلز والی ایک طویل راہداری میں چلتے ہوئے وہ تیار ہی تھی۔

"لیکن تمہارا نام سن کر انہوں نے پندرہ منٹ دے دیے، شاید تمہارے ساتھ کوئی پرانی شناسائی ہو۔ کیوں؟" اس نے رک کر پوچھا تھا۔

جواب میں قاریہ نے ہونٹ میچ کر انکار میں سر ہلادیا۔

"حیرت ہے۔" وہ ہنسی۔ "بغیر اپائنٹمنٹ کے

صرف تمہارا نام سن کر پندرہ منٹ ملاقات کے لیے دیے۔ یقین نہیں آ رہا۔" رک کر کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"خیر....." اس نے اپنا رخ دائیں طرف موڑتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دبا کر تھوڑا سا کھول کر پیچھے ہٹ گئی۔ "جاؤ، باس تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

قاریہ اس کے قریب سے گزر کر نیم وادر دوازے کو ذرا سا اور کھولتے ہوئے اندر چلی گئی اور اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے گھومنے گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور مسعود انور اب اس کی واپسی کے انتظار میں مضطرب ہو رہے تھے۔

"عجیب لڑکی ہے۔" انہوں نے لاؤنج کی دیوار پر قاریہ کی تصویر دیکھتے ہوئے سوچا۔ بنا سوچے سمجھے کوئی بھی کام کر لینے کی ہابی بھر لینا اس کی پرانی عادت تھی۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اس طرح کے ایڈ وچر میں وہ دو یا تین بار ہی کامیاب ہوتی تھی۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتے دیوار کے قریب پہنچ گئے اور قاریہ کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ یہ اس کے گریجویٹیشن کانفرنس کی تصویر تھی۔ سیاہ گاؤن میں لمبوس سر پر یونیورسٹی کی مخصوص ٹوپی پہنے وہ ذرا ترچھی کھڑی فوٹو گرافر کی طرف گردن موڑے ہلکا سا مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں رول کیا ہوا کاغذ کا

وہ کھڑا اور آنکھوں میں بے خواب یقینا کسی شان دار مستقبل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسا شان دار مستقبل دو سال گزر جانے کے بعد بھی جس کی شروعات نہ ہو سکی۔ وہ دیوار سے دور ہستے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ انہیں یاد آیا۔

اس کے کانفرنس پر وہ چاہہ کبھی نہیں جاسکے تھے، صرف اسی جبران محمود اور اس کے باپ کی وجہ سے جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ملنے چلی گئی تھی انہوں نے جھلا کر سر جھٹکا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ اس لڑکی حرم کو سہولت سے انکار کر دیتی۔ لیکن اب یہ کہاں رہ گئی آخر۔"

انہوں نے بے چینی سے وال کلاک پر نظر ڈالی تھی۔

☆ ☆ ☆

صالحہ اسے جس طرح کمرے میں گھسا کر خود دروازہ بند کر کے جا چکی تھی وہ اس شخص کا ہرگز نہیں تھا جس سے ملاقات کرنے وہ یہاں آئی تھی۔ کسی ماہر انٹریڈیزائنر کے ہاتھوں سے اس شاندار آفس کے وسیع و عریض آفس ٹیبل کے پیچھے ایک بڑی اور آرام دہ آفس چیئر پر ایک چھوٹی اور تکلیف دہ شخصیت بیٹھی تھی، جو پچھلے پانچ منٹ سے اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک خود سر اور دماغ دار باپ کی بیٹی کو اپنی کسی ضرورت کی خاطر آخر کار ان کے پاس آنا ہی پڑا تھا۔ وہ بھی اپنے قدموں پر چل کر۔ یہ چھوٹی اور تکلیف دہ شخصیت محمود انور تھے جو رشتے میں اس کے کٹے تیا لگتے تھے اور جن کے ساتھ وہ اپنی پیدائش کے بعد کئی سال تک ایک ہی چھت کے نیچے رہتی رہی تھی۔

"دیکھیے میں ان پانچ منٹ میں پانچویں بار آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں آپ سے ملنے ہرگز نہیں آئی تھی، آپ کی ریسپنشنٹ نے کانوں میں ٹیل ڈال رکھا ہے یا پھر وہ قدرتی بہری ہے، اس کو سنائی نہیں دیا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔" اس کے ماتھے پر بل اور آنکھوں میں شرارے تھے۔

"اس کے کان بالکل صاف اور ساعت موافق درست ہے۔" بولنے والے کے چہرے پر طنز بھرا ہنس تھا۔ "ہم اپنے ہاں ہانگ کر رہے ہوئے امیدوار کے جسمانی اور ذہنی طور پر فٹ ہونے کی مکمل جانچ کرتے ہیں۔"

"تو پھر آپ سے جانچ میں غلطی ہوئی ہے۔" قاریہ نے سر جھٹکا اور واپسی کے لیے قدم موڑے۔ "جس سے ملاقات کرنے آئی تھیں، وہ تو تمہیں یہاں نہیں ملے گا۔ بہتر ہے جو کہتا ہے مجھ ہی سے کہہ دو۔" وہ پیچھے بولے۔ "اگرچہ میں تمہارے

کے بغیر ہی تمہارا مدعا سمجھ چکا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ واپس مڑی۔ "تو پھر آپ ہی بتادیں میرا مدعا کیا ہے۔"

"یہاں تمہیں درکار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے کسی چھوٹی موٹی نوکری کے۔" ان کی طنز بھری مسکراہٹ میں مسخرا تھا یا حقارت، قاریہ صحیح اندازہ نہیں لگا پائی۔ "کسی پرانے، کھوئے ہوئے تعلق کا، کسی رشتے کا واسطہ دے کر تمہارے قائل کرنے آئی ہو ناں کہ وہ کسی پروجیکٹ میں تمہیں ایڈجسٹ کر لے گا۔" قاریہ ان کے سامنے کھڑی غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا میں تیر چلانے کی ان کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔

"معلوم نہیں تم نے سائل بن کر یہ سوال جبران ہی سے کرنے کا کیوں سوچا، یہ سوال تو میں بھی سن سکتا تھا اگرچہ میں جبران کی طرح ایک صابر سماع نہیں ہوں۔ خیر میں ہوں یا جبران۔ ہمارے پاس تمہارے سوال کا ایک ہی جواب ہوتا، سوری۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "نی الوقت ہمارے پاس کوئی دیکھنی موجود نہیں ہے، تم جانتے ہوئے اپنی سی وی ریسپنشن پر ترجیح کروا جاؤ۔ اگر کبھی کوئی ایسی پوسٹ خالی ہوئی جس کے معیار پر تم پوری اتر سکتی ہو تو تم سے ضرور رابطہ کریں گے۔ ویسے وہ کہاں رہی ہو آج کل، اسی اجازت پر ان کالونی میں جہاں رات بھر گیدڑوں اور گتوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔"

"نہیں۔" قاریہ نے سر ہلایا۔ "میں ایک ایسی کالونی میں رہ رہی ہوں جو گیدڑوں اور گتوں کی بستی سے خاصی دور اور بہت پرسکون جگہ ہے۔"

انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔

"رہی بات سائل اور سوال کی تو یہاں آتے ہوئے مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ آپ خود اپنے ہاتھوں بسائی ہوئی جس بستی میں آج کل رہ رہے ہیں، وہاں کتے اور گیدڑ گلیوں اور عام انسان چھوٹے چھوٹے بونے رہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا مہاراج۔" اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "خدا نہ کرے ہم جیسے



عام ہوں کو آپ جیسے گلیورز سے کوئی کام پڑ جائے، وہ بھی آپ کے کسی پروجیکٹ میں ایڈجسٹمنٹ کا۔“ اس کی آنکھوں سے نفلتے شرارے اب براہ راست ان کو اپنی لپٹ میں لے رہے تھے۔

”ارد گرد کی چکا چوند آپ کی نظر اس قدر کوتاہ کر چکی ہے کہ آپ یہ بھی دیکھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی اور اس کا کیڑوں بہت بڑا ہے۔ انسانوں کے آپس کے معاملات کئی رنگ اور شکلیں اختیار کر چکے ہیں۔ میں بھی آپ کے بیٹے کے کسی ایسے ہی عجیب رنگ و شکل والے معاملے کے سلسلے میں ہی اس سے ملنے آئی تھی مگر نہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کے دماغ میں لگتا ہے ہمہ وقت آپ کے پروجیکٹس اور ان کی ایڈجسٹمنٹ ہی گول گول گھومتی رہتی ہیں جب ہی ملاقاتی کو سائل اور اس کے مدعا کو سوال قرار دینے میں آپ کا دل خوب تسلی پاتا ہے۔ آپ کو آپ کی یہ خیالی دنیا مبارک ہو۔ آپ اس میں رہتے رہیں میں چلتی ہوں، کیونکہ میرے پاس اس ملاقات کے لیے چندہ منٹ تھے۔ وہ ختم ہو چکے بلکہ چندہ منٹ اوپر بھی ہو چکے۔ میرے قیمتی وقت کے دس بارہ منٹ ضائع کرنے پر آپ کو کیا کہوں۔ کہہ تو بہت کچھ کہہ سکتی ہوں لیکن آپ عمر میں سب سے بڑے ہیں اور لحاظ اور مروت میری نگاہ میں شروع سے ہی ڈال دیا گیا ہے کیا کروں۔ خیر چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ ایڑیوں پر گھوم کر دروازے کی طرف چل دی۔

”سنو!“ وہ ایک مرتبہ پھر عقب سے بولے۔

”کیا کہا تم نے؟“ معاملہ، کیا معاملہ؟“

فاریہ نے لمحہ بھر رک ان کی بات سنی اور پھر جواب دیے بغیر دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور کن پٹیاں چننے لگی تھیں۔ ”گیڈر اور کتے“ ان کے نتھنے پھڑ کے سب سمجھتا ہوں میں سب کا سب گلاب جسم میں دوڑتا خون بھی کھولنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ آندھی کی طرح ان کے آفس سے باہر نکلی تھی اور اسی کی رفتار سے چلتی اس دروازے کی طرف بڑھی تھی جس پر انگریزی کے چار حروف ”EXIT“ درج تھے۔ اور اس دروازے تک پہنچتے ہوئے اس نے ایک بار بھی ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتی تو فائل ہاتھ میں کھولے کسی کلائنٹ کو اس پر درج کوئی نکتہ سمجھاتے، اسی آفس کی طرف آتے ”جبران محمود“ کو ضرور دیکھ لیتی جو خود اتفاقی نظر اٹھ جانے پر اسے وہاں موجود دیکھ کر بری طرح چونک گیا تھا۔ وہ منتظر رہا کہ جاتے جاتے کسی لمحے فاریہ کی نظر بھی اس پر پڑ جائے مگر وہ ناک کی سیدھ چلتی باہر جانے کا دروازہ کھول کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

وہ کچھ دیر یونی ساکت کھڑا اسے نظروں سے دور جاتا دیکھتا رہا اور اس کے غائب ہو جانے پر چونک کر اپنے قریب کھڑے شخص کو فائل تھماتے ہوئے اس کا شانہ چھتیا کر اسے پاس کے آفس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود تیز قدموں سے چلتی اس سمت چلا گیا تھا جہاں سے گزر کر وہ آندھی باہر نکلی تھی۔ چند قدم آگے جا کر وہ کچھ سوچ کر رکھا تھا۔ فاریہ کے پیچھے جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ ریسپشن روم کی طرف بڑھا تھا۔ اس آفس میں باہر سے آنے والے ہر شخص کی انٹری ریسپشن کے ریکارڈ میں ڈالی جاتی تھی۔

☆☆☆

مروت میں آکر اور انسانیت کی خاطر مدد کے جھنڈے ہاتھ میں بلند کیے سر کی جانے والی وہ پانچویں مہم تھی جس میں اس روز وہ بری طرح ناکام ہو کر واپس لوٹی تھی مگر واپسی کے سفر میں میٹرو بس کی وہ آرام دہ سیٹ اسے مل گئی تھی جو کھڑکی کے ساتھ تھی اور جس پر بیٹھ کر وہ اس جدید شہر کی سڑکوں،

راستوں اور بلند و بالا عمارتوں کا نظارہ کر سکتی تھی یہ اور بات کہ اس کی نظریں منظروں پر جمی تھیں لیکن دھیان نہیں اور تھا۔ وہ شان دار دفتر، اور اس کی آفس میز پر بیٹھا وہ شخص سے وہ مگر بھی ملاقات کی طلب گار نہ ہوتی اور اس کا وہ محمضہ اور غرور اس کے دماغ میں جیسے گڑے گئے تھے۔

مسائل اور سوال، گیڈر اور کتے اس کا حلق کڑوا ہونے لگا تھا۔ دوسروں کو لیٹ ڈاؤن کرنے کا شوق تو انہیں اس وقت بھی تھا جب وہ ریلوے کے کھلے میں بطور سپردا زور کام کرتے تھے۔

محلے گلی کے کئی ایسے گھرانے تھے جو ان کے خیال میں ذات کے کی کمین تھے اور دولت کے بل پر اپنے نام کے ساتھ فلاں، ڈھماک کی تختیاں لگائے بیٹھے تھے۔ اپنے حسب نسب پر غرور بھی سدا سے ہی تھا۔

یہ اور بات کہ آج ہمارے طبقاتی اور بلندی کے لحاظ سے ”مڈل کلاس“ کے زمرے میں ڈھکیل دیئے گئے لیکن ہمارے بزرگ ہمارے آباؤ اجداد نہیں الرضا، جانے جاتے تھے۔

فاریہ نے ان کو اکثر بتاتے سنا تھا۔ شاید انسان کے دل میں بیٹھی خواہش بھی اتنی طاقت پکڑ سکتی ہے کہ قسمت بھی اسے پوری کرنے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ اس روز وہ ان کے دل میں بیٹھی خواہش کے پورا ہونے کے بعد کا نظارہ کر کے آئی تھی۔

دادا کے مکان کی فروخت اور ان سے جدا ہو جانے کے بعد اس کا ان سے یہ پہلا آشنا سامنا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کیا گمان کر سکتی تھی۔ اس نے سڑک کے اس پار ایک اونچی عمارت کی جھلملائی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ کچھ بھی وہ اسے دیکھ لیں تو ”وہ میری جان سے پیاری بیٹی“ کہتے ہوئے اسے سینے سے لگائیں گے۔ ”ہونہہ!“ اس کے چہرے پر غم بھری مسکراہٹ ابھری۔

لیکن اسے ان سے ملاقات کی خواہش ہی کب تھی وہ تو اونہہ! بیٹے نے کون سا باپ سے مختلف

سواگت کرنا تھا۔ وہ تو شاید ملاقاتی کا نام سن کر چندہ منٹ تو کیا ایک لمحہ بھی دینے سے انکار کر دیتا۔ اسے ایک بار پھر نئے سرے سے غصہ آیا۔

بھاڑیں جانے حرم خرم خان کا عشق، محبوب کے فراق میں روتے روتے چاہے وہ اتنے اشک بہائے کہ پورا شہر ان کی زد میں آکر ڈوب جاتا اس کی بلا سے۔

اس نے غصے کے مارے اگلی سیٹ کو جوتے سے ٹھوکر ماری! مگر ایک وہ بھی تھیں جو اسے اور بہت سے بچے کی باتوں کے ساتھ ایک بچے کی بات یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ کبھی کسی مصیبت کے وقت میں اگر شاہ، گداہن کر دروازے پر کھٹکول لیے آن کھڑا ہوتا یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ تو خود بادشاہ ہے اسے ہماری مدد کی کیا ضرورت یا یہ سوچ کر کہ جب یہ بادشاہ تھا تب ہماری کون سی سنا تھا اسے جھک نہیں دینا چاہیے۔

اس نے نظر کے سامنے آئی بھی اس شبیہ سے ناراض ہوتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا سب کی سب نصیحتیں مجھے ہی کر گئیں۔ کاش چار اچھی باتیں اپنے شوہر اور بیٹوں کو بھی سکھا جاتیں۔

”بات تو اسی سے کروں گی نا جس کے کان سننے ہوں۔ جو ہوں ہی کانوں کے بہرے انہیں کیا سناؤں۔ اشاروں کی زبان مجھے آتی نہیں۔“

ایک دو بار ہنستے ہنستے انہوں نے نجات کس کو جتایا تھا اسے شوہر کو یا بچہ کسی بیٹے کو یا دایا اور اس کا دل مزید بو جمل ہو گیا۔

☆☆☆

”سر میں نے آپ کو بتایا کہ وہ باس سے نہیں آپ سے ملنے آئی تھی۔ اس لڑکی کا نام۔“ ریسپشن صالہ نے اس دن کے ملاقاتیوں کی فہرست پر نظر دوڑائی۔ فاریہ، جی فاریہ سہو، یہی ہی نام تھا اس کا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے جبران کو بتایا جو اس کے جواب کا منتظر تھا۔

”مجھ سے ملنے آئی تھی تو وہ باس کے آفس سے کیوں باہر آئی نظر آئی۔“ جبران کے چہرے پر درشتی



اتری۔

”باس نے مجھے آپ سے رابطہ کر کے آپ کو میٹنگ روم میں جانے کی یاد دہانی کا بلا تھا۔ میں نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ آپ کے لیے ایک ملاقاتی میرے پاس بیٹھی ہے جس سے ملاقات اگر آپ کرتے تو میٹنگ میں چند منٹ لیٹ ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جھلا کر بغیر اپائنٹمنٹ کی ملاقاتی کا تعارف مانگا۔ میرے بتانے پر انہوں نے کہا اسے میرے پاس بھیج دیں۔“

صالحہ نے میکا کی انداز میں کارروائی دہرائی۔ ”بیک میٹنگ“ خیراتی، کچھ ایسے الفاظ بھی پاس نے بولے تھے غالباً اسی لڑکی کے لیے۔ ”کارروائی کا اگلا ٹانکا اس نے اپنے پاس سے لگایا تھا۔ اس قسم کے جیلے اس کے نزدیک دلچسپ گوسپ بن سکتے تھے۔ ”ہوں!“ جبران نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا۔ ”آئندہ خیال رکھنا، مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والوں کے نام، بے ادھر ادھر ڈس کلوز کرنے کے بجائے صرف مجھے ہی تک پہنچنے چاہئیں یا پھر تمہاری اس اینٹری بک تک محدود رہیں تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

”میں بہت خیال رکھتی ہوں! صالحہ نے خود کو کلیئر کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن وہ لڑکی حرم خرم خان نہیں تھی۔ اس کا نام فارہ سعود تھا اور یہ نام آپ کی بتائی بلک لسٹ میں شامل نہیں تھا۔“

”یہ نام اس لسٹ میں شامل تو جب ہوتا جب مجھے گمان بھی ہوتا کہ فارہ مجھے ملنے یہاں آنے کا قصد کر سکتی ہے۔“ جبران نے یہ جواب خود کو دیا اور صالحہ پر صرف ایک تیز نگاہ ڈال کر ریمپشن روم سے باہر آ گیا۔

”وہ مر سکتی تھی لیکن اس آفس میں مجھ سے کیا کسی چر اسی سے ملنے بھی نہیں آ سکتی تھی آج کیوں، کیسے۔“ اس کی آمد اور مقصد یہ سوال جبران کے ذہن سے چپک چپکے تھے۔

☆☆☆

”پھر یوں ہوا کہ یہ جو ہمیں پہلے سے معلوم تھا۔ اب اس نے اسے گلے میں پڑا اس کا رفا اتار کر جھاڑتے اور تہ کر کے وارڈ روب میں واپس رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔

”آپ مزہ لینے کے موڈ میں ہیں۔“ فارہ کے لہجے میں ناراضی اتری ”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے سادگی سے سر ہلایا۔

”میں تو بلکہ تم سے کوئی تفصیل سننے کے موڈ میں بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ بغیر سے سب جانتا ہوں۔“ ”اچھی بات ہے۔ مجھے کچھ سنانا بھی نہیں۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”سچ ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھے ”چینج کر لو تو کچن میں چلی جانا۔ مراد بک سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے بیڈ کی چادر اٹھا کر اسے جھاڑتے ہوئے، بیڈ سائیز ٹیبل پر سے چیزیں اٹھا کر بیچ کر واپس رکھتے ہوئے اپنا غصہ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک فضول سی مروت کے پیچھے اس کا وقت برباد ہوا تھا۔ جبکہ اس روز اسے فارہ یاز آل ان ون کے لیے آلو موگرے بنانے کے علاوہ پھٹے ہوئے دودھ سے خمیر بنانے کا مظاہرہ بھی کرنا تھا۔

☆☆☆

لاٹری لکھنا، جیک پاٹ ہاتھ آ جانا، سونے کی چڑیا پر ہاتھ پڑ جانا، سونے کی کان کا نکل آنا جیسی باتیں عموماً ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کی جاتی ہیں جو اتفاقیہ طور پر امیر ہو جاتے نظر آتے ہیں۔

محمود صاحب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ اپنی وفا شعار اور سکھڑی بوی کی بچت کے نام پر سینٹ سینٹ کر رکھے پیسوں کو ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں لگاتے ہی چند ہی مہینوں کے بعد ان کی برسوں سے ایک جیسی چلتی قسمت نے چپکنے کا کردیا۔ یہ انکشاف پہلے پہل خود ان ہی پر ہوا تھا اور

کئی روز تک انہیں اس پر یقین نہیں آیا تھا نہ ہی انہوں نے اس کا تذکرہ کسی دوسرے سے کیا تھا۔

پھر چند اور مہینوں کے بعد جب انہوں نے اپنے بینک اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ دیکھی تو انہیں احساس ہوا کہ ہمیشہ کے پڑھے ہوئے جیلے ہواؤں میں اڑنا۔ والی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ ان کا ہاتھ آسان اور کشادہ ہو رہا تھا۔ پیسہ بارش کی طرح ان پر برساتا تھا۔

ان کی خوشی اور ان پر چھائی سرمستی کی کیفیت دیکھتے ہوئے ان کے دوست نے فوراً انہیں بتایا کہ ان کی پہلے والی رقم تو محدود تھی اسی لیے منافع بھی محدود تھا اگر وہ ایک بڑی رقم اس کے کاروبار میں لگا دیں تو ایک سال کے اندر اندر لکھ چھوڑ کر دوپٹی بھی بن سکتے تھے کیونکہ یہ کاروبار سکتا علی اور کام سے زیادہ قسمت پر چلتا تھا۔ چند مہینوں میں پہلے سے کہیں زیادہ حاصل کردہ معاشی استحکام مسعود صاحب کو مزید کے حصول والے راستے پر چڑھ چکا تھا۔

”بڑی رقم!“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”بڑی رقم کہاں سے آ سکتی تھی۔“ انہوں نے اپنے گھر کے اندر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ جس میں وہ اپنی، تین بیٹوں، ایک چھوٹے بھائی اور ایک بیٹی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کے بیٹے کالج، پونیورسٹی جانے کی عمر میں تھے اور بھائی یونیورسٹی پروفیسر تھا۔ وہ خود ایک بڑے بینک میں اسٹنٹ منیجر کی نوکری کر رہے تھے۔

گھر انہ معاشی طور پر بہت مستحکم نہ سکی۔ لیکن اچھے حال کی زندگی گزارتا تھا۔ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے سے دینی اور جذباتی وابستگی رکھتا تھا۔ محبت، پیار اور خلوص آسودگی کا احساس قائم رکھے ہوئے تھے۔ جس گھر میں وہ رہ رہے تھے وہ ان دونوں بھائیوں کو وراثت میں ملاتا تھا۔ پہلے وقتوں کا پناہ گھر وسیع اور کشادہ تھا۔ جس علاقے میں وہ گھر واقع تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہاں جائیداد کی قیمتیں دوسرے علاقوں سے کئی گنا بڑھ چکی تھیں۔ ”بڑی رقم“ کے نام پر مسعود کی صاحب کی نظر اسی گھر پر پڑی۔ اور

جب انہوں نے اپنی خواہش کو گھر میں الفاظ کی شکل میں ظاہر کیا تو۔ برسوں سے سکون سے چلتا زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔

وراثت میں ملے اس گھر کی فروخت کے خواہش مند اور ان کے بھائی اور ان کے درمیان ایک بڑی خلیج بن کر حائل ہو چکی تھی۔ ان کا بھائی کسی صورت وہ گھر بیچنے کو تیار نہیں تھا اور انہیں ہر صورت وہ گھر بیچنا تھا۔ پہلے پہل ان کی بیوی اور بیٹوں نے بھی ان کی خواہش کی بھرپور مخالفت کی تھی لیکن بیٹوں کی آنکھوں میں وہ ایک خوش حال مستقبل کے خواب سجانے میں آسانی سے کامیاب ہو گئے تھے۔ البتہ ان کی بیوی، جو دیور کی اس گھر سے جذباتی وابستگی کو خوب سمجھتی تھی ان کی خواہش کی مخالفت کرتی رہی تھی۔

”ہم اس گھر کو فروخت کر کے پہلے کسی اچھے علاقے میں ایک عمدہ گھر کرائے پر لے لیں گے اور پھر ان شاء اللہ جلد ہی ہم اس حیثیت میں ہوں گے کہ اپنے لیے نیا گھر خرید سکیں۔“ انہوں نے بھائی کو قائل کرنے کے لیے کہا تھا۔

”کوئی بھی دوسرا گھر اس گھر کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ جس کی ہیرا منٹ کی خرید میں میرے باپ کی خون پسینے کی کمائی لگی ہو۔ میرے باپ نے عمر بھر کی محنت سے کمائی اور بھائی رقم اس گھر کو بنوانے میں لگا دی۔ مجھے یاد ہے اس کی تعمیر انہوں نے کس شوق سے کروائی۔ اور اماں نے کس شوق سے اس کا کوٹا کوٹا سنوارا۔“ انہوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں اس کو کسی بھی مول نہیں بیچوں گا اور میں اسے کیوں بیچوں جبکہ مجھے یہاں کوئی تکلیف بھی نہیں ہے میں یہاں خوش ہوں اور محفوظ بھی۔“

”اچھا تو پھر ایسا کرو۔ اس کی قیمت پتا کروالو اور اس قیمت کا نصف مجھے دے دو۔“ محمود صاحب مسعود کے سختی سے کئے انکار پر بھڑک اٹھے۔ ان کی نظروں میں انتہائی خوش حال مستقبل کے خواب سجے تھے جن کی ان کے بھائی کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی جبکہ وہ بغیر ہاتھ جوڑے ہلائے خوش حال مستقبل میں



اسے حصہ دار بنانے پر بھی پوری طرح راضی تھے۔  
”وہ میں نہیں دے سکتا کیونکہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“ وہ نرمٹھے پن سے بولا تھا۔

”تو پھر میرے پاس اس کو فروخت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔“ مسعود کے لہجے کی بیزاری اور بے نیازی نے انہیں بری طرح تباہ کیا تھا۔ کیا شخص تھا جسے اسودہ اور خوشحال مستقبل میں کسی قسم کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”اور میرے پاس آپ کی خواہش کے راستے کی رکاوٹ بننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ مسعود کی بے نیازی عروج پر پہنچ گئی۔

”یہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیسے رکاوٹ بننے ہیں کسی کی خواہش کے راستے میں۔“ وہ پوری طرح بھڑک چکے تھے۔ جب ہی دانت پیس کر جواب دے رہے تھے۔

انہیں کاروبار کرنے اور دو میں مزید دو جمع کر کے چار بنانے کی لت لگ چکی تھی۔ خالی بینک اکاؤنٹ کی تفصیل میں امداد کے ساتھ بڑھتے سفر، مزید مزید کی پیاس بھڑک چکے تھے۔ انہیں ہر حال میں سرمایہ درکار تھا اور سرمائے کا حصول صرف وہ گھر بیچ کر ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ انہوں نے گھر کے خریدار تلاش کرنے شروع کیے۔ مسعود ہر خریدار کے سامنے اپنے حصے کا علم اٹھائے ڈٹ جاتا۔

محمد صاحب نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ جو بھی سیدھی انگلیوں سے نہیں ہوتا اسے انگلیاں ٹیڑھی کر کے نکالنا پڑے تو کر لینی چاہئیں۔ اپنے شراکت دار دوست کے مشورے سے والد کے وصیت نامے میں ناقابل تردید اور قانونی تبدیلی کرانے کے لیے انہیں تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ ترمیم شدہ وصیت نامے کے مطابق باپ کی چھوڑی جائیداد میں مسعود صاحب بڑے بھائی کے فیصلے کے پابند قرار پائے تھے۔ محمد صاحب، ضرب، جمع، تقسیم کے ماہر بن چکے تھے اور مسعود صاحب کو اپنے طالب علموں کو فلسفہ پڑھانے کے سوا کوئی کام نہ آتا منطق

کے وہ ماہر تھے مگر حساب کتاب کے کھیلے اور قانون سے سراسر ناواقف۔ ہزار بار کا پڑھا وصیت نامہ ان کی نظروں کوئی کہانی بنا رہا تھا لیکن قانون کا شہسباز کی ہر منطق اور دلیل کی نفی کرنے کو کافی تھا۔

”یہ، یہ، یہ“ وہ اس قدر ششدر تھے کہ الفاظ ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور ہاتھ کا پھینک گئے تھے۔ انہوں نے بے یقینی سے صرف ایک بار اپنے بڑے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ فتح و شادمانی کے احساس سے ہنسا رہا تھا۔

مسعود صاحب کے بھائی نے ان کے علم اور اصول کو ایسے محاذ پر ٹکست دی تھی جہاں سکندر کو بھی فارغ ہوتے ہوئے اخلاقی طور پر اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑتے۔

وہ جس کی اینٹ اینٹ میں ان کے باپ کی خون پسینے کی کمائی لگی تھی جس کے کونے کونے سے انہیں صرف محبت نہیں شدید عقیدت تھی۔ ان کی نظروں کے سامنے رکا، ایک معقول رقم ان کے حصے کے طور پر ان کو تھما دی گئی تو کہ اس رقم کے عوض اس گھر سے ہمیشہ کی بے دخلی اور خون کے رشتوں سے ہمیشہ کی حروری ٹھہری۔

گھر سے بے دخلی محمد صاحب نے ان کی قسمت میں لکھوا دی تھی اور رشتوں سے حروری ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ ان کے یقین پر دن دھاڑے ڈاکا ڈالا گیا تھا۔ انہوں نے ذکرت پر پرچا کھانے اور اسے سزا دلوانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے اس سے کنارہ کر لینے کو ترجیح دی تھی۔

☆☆☆

آج کی دنیا میں یہ کہانی بہت عام ہو چکی۔ اتنی عام کہ کوئی کچھ دیر تک کر اسے سننے میں بھی دلچسپی نہ رکھے۔ لیکن محمد مسعود کے جاننے والے، دوست، احباب اور اہل محلے کے لیے اس وقت یہ اونچی داستان تھی۔ سب کے سب کانوں کو ہاتھ لگاتے رہ گئے۔

وہ دو بھائی جن کا آپس کا تعلق، پیار اور خلوص

بھائی تھی جب اس گھر سے نکلے تو یوں کہ گھر کا سامان مکمل بنوارے کے بعد الگ الگ بندھا دو الگ الگ ٹرکوں پر لدا تھا۔ دونوں بھائی رخصت ہوئے تھے لیکن ایک دوسرے سے ایک بار بھی نظر نہیں ملائی تھی۔

اس بنوارے اور بھائیوں میں دوری کی اصل وجہ کیا ہوئی تھی یہ بہت سے البتہ پھر بھی جان نہ پائے تھے کیونکہ محمد صاحب کسی کو اپنی کارستانی سنائیں سکتے تھے اور مسعود صاحب کو اپنی انا اور خودداری بہت عزیز تھی۔ انہیں کسی کے سامنے شکوہ کنانی اور واویلا بھی اپنی بے عزتی لگتا تھا۔

اس علیحدگی کو آٹھ برس بیت چکے تھے۔ محمد صاحب اپنا سامان اور بال بچے اٹھائے ایک بڑی کالونی میں بنے بڑے گھر میں بطور کرایہ وار رہائش پذیر ہوئے اور مسعود صاحب ایک عام سے علاقے کے مختصر سے مکان میں کرایہ پر رہنے لگے۔ محمد صاحب کے خوابوں کو حقیقت میں ڈھلنے میں ڈیڑھ دو سال کا عرصہ مزید لگا۔ محنت، منصوبہ بندی، بہترین حکمت عملی وقت سکھاتا چلا گیا اور ترقی ان کے قدم چومتی چلی گئی۔

مسعود صاحب کی ضد اور انا پسندی کے حصے میں شہر سے ہٹ کر ایک ایسی کالونی جو توسیع پاتے شہر کے اندر ہی آچکی تھی میں گھر بنالینا آیا۔ وہ پہلے بھی خاموش طبع انسان تھے بھائی کے نظریں پھیر لینے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ کم کو ہوتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ انہیں گھر کی ذمہ داریوں اور ان کے سلسلے میں کسی بھاگ دوڑ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سب کام ان کا بھائی اور بیٹے نبھالیتے تھے اور خود وہ مزے سے صرف نوکری کرتے تھے۔

بیوی کے انتقال کے بعد اکلوتی بیٹی کی پرورش کا ذمہ ان کی بھابھی نے لے لیا تھا اور وہ ایسی برخلوص، ہنسائی ماری خاتون تھیں کہ مسعود کو کسی تو ایسا لگتا کہ وہ خود بے اولاد ہی رہ گئے تھے۔ البتہ بھائی کو تین بیٹوں کے بعد اللہ نے ایک بیٹی بھی دے دی تھی۔ قاریہ سے ان کا تعلق باپ بیٹی کے تعلق سے زیادہ دوست کا سا

تھا۔ ایک ایسا دوست جس سے کوئی بھی بات بلا جھجک کی جاسکتی تھی۔ ایسے لاڈلے اور بے فکر مسعود صاحب کو جب نئے گھر کی تعمیر بھاگ دوڑ اور شہر کے ایک کونے سے دوسرے انتہائی کونے تک کا سفر کرنا پڑا تو آدمی صحت تو وہیں خراب ہو گئی۔

اگرچہ گھر کی تعمیر کی ذمہ داری ایک دیرینہ دوست نے اپنے سر لے لی تھی جو اتفاق سے ٹھیکے دار تھا لیکن نگرانی تو بہر حال کرنا پڑنی تھی۔ پھر جوان ہوئی بیٹی کی ذمہ داری الگ تھی۔ قاریہ کا جج جانی تھی اسے وہاں چھوڑنا اس کی واپسی کا بندوبست، خود اپنی نوکری، بھائی کا پلٹ کر خبر نہ لینا۔ بچیوں کی بے اعتنائی۔

مسعود صاحب کی عمر اتنی نہیں تھی دو سال کے اندر جتنے بوڑھے وہ دکھائی دینے لگے تھے۔ نئے گھر میں قفل ہونے کے ٹھیک ڈھائی ماہ کے بعد وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے۔ علاج، دوا دارو کا نیا چکر شروع ہوا۔ پیار دل زندگی سے اچاٹ ہونے لگا۔ قاریہ اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد تاحال نوکری ہی نہیں ہر مشغلے سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔

دوسری طرف محمد صاحب ہر نئے دن کے ساتھ پہلے سے زیادہ جوان دکھنے لگے تھے۔ بہترین طرز زندگی، صحت مند خوراک، ہاتھ میں آئی دولت میں دن بدن اضافہ وہ رئیس کہلانے لگے تھے۔ شہر کی بزنس کلاس سے تعلق بڑ گیا تھا۔ سب سے مہنگی کالونی میں محل نما گھر اور شہر سے باہر ایک بڑے فارم ہاؤس کے مالک بن چکے تھے۔

دو بڑے بیٹے تعلیم سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ کاروبار میں بھی مصروف ہو چکے تھے۔ تیسرے بیٹے کا داخلہ شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ہو چکا تھا۔ بڑے دو بیٹوں کی نسبت ان کی امیدیں تیسرے بیٹے سے زیادہ وابستہ تھیں۔ وہ لائق فائق اور ذہین تھا۔ گھٹنوں میں سمجھ آنے والی بات منٹوں میں سمجھتا تھا۔



برنس کے سلسلے میں ان کے ساتھ شامل ہونے سے کہیں پہلے سے انہیں مشورے دینے لگا تھا اور اس کے مشورے ہمیشہ ہی بہت سودمند ثابت ہوتے تھے۔ ایسے کانیاں اور ذہین بیٹے پر وہ جتنا بھی فخر کرتے تھے۔ اگرچہ یہی ان کا وہ بیٹا تھا جو پہلے ان کی نسبت اپنے چچا سے زیادہ قریب تھا۔ اسکول کے زمانے میں بھی کسی نیشنل سینٹر جانے کے بجائے گھر پر چچا سے پڑھا کرتا اور اسکول کے بعد تو اس نے داخلہ بھی اسی کالج میں لیا تھا جہاں چچا پڑھاتے تھے۔ ان کی بیوی اکثر کہا کرتی۔

”جبران چچا کا عاشق ہے یا چچا جبران کے میں کبھی فیصلہ نہیں کر پاتی۔“ اسی بیٹے سے انہیں خدشہ تھا کہ چچا سے دوری پر احتجاج کرے گا۔ ان کی توقع کے برعکس ایسا نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ زندگی کو بھول جانے والوں میں جبران سب سے آگے تھا۔ وہ اپنی طرز زندگی اور آسائشات سے بہت خوش تھا۔ اب اس کا باپ اس کا رول ماڈل بن چکا تھا۔

”آپ جو حاصل کرنا چاہتے ہو اسے حاصل کرنے کا بہترین کلیہ ”لیڈنگ فرام دی فرسٹ“ ہے۔ باقی لوگ خود بخود آپ کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ آپ بھی سب سے آگے چلنے کے عادی ہیں۔ اسی لیے کامیابی آپ کے پیچھے چلتی رہی۔ اور آپ کی اس ہی عادت نے مجھے آپ کا فیمن بنادیا۔“ وہ کئی بار انہیں بتا چکا تھا۔ اس کی ایسی باتیں سن کر محمود صاحب کو اپنے افعال پر مزید فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ پچھتاوا کبھی ان کے قریب بھی پہنچ نہ پایا تھا۔

☆☆☆

وہ اسی دن کی شام تھی جب محمود اتفاقاً فرصت کے باعث اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب جبران ان کے پاس آیا تھا۔ ”صبح فاریہ آفس میں آئی تھی؟“ اس نے کوئی تنہید باندھے بغیر ان سے سوال کیا تھا۔

”ہاں! جبران کو یہ خبر کس نے دی تھی وہ حیران ضرور ہوئے تھے لیکن انہوں نے اس حیرت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ سا جواب دیا تھا۔ ”کیوں؟ وہ کیوں آئی تھی؟“ وہ ان کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”اور ایک بات! وہ آپ سے ملنے تو نہیں آئی تھی غالباً وہ مجھ سے ملنے آئی تھی؟“ اس نے یہ سوال اس طرح کیا تھا جیسے اسے خود کو ملنے والی خبر کا یقین تھا لہذا وہ اسے ٹال نہیں سکتے تھے۔

”ہاں پھر؟“ انہوں نے جانتا چاہا تھا وہ ان سے دراصل کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

”پھر یہ کہ میرے بجائے آپ اس سے کیوں ملے؟“ انہیں جبران کے لہجے نے ایک مرتبہ پھر چونکا دیا تھا اور اس بار بھی انہوں نے اپنی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس سے میں ملایا تم، ایک ہی بات ہے۔“

”ایک بات تو نہیں ہے۔ اگر فرق نہ پڑتا ہوتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ اسے کسی سے بھی ملوایا جائے۔ آپ، کامران، عثمان یا میں، کسی سے بھی۔“ وہ ناراض تھا یا الجھا ہوا محمود صاحب اندازہ نہیں کر پائے۔

اس نے سر جھٹکا۔ ”کیا آپ بتائیں گے کہ وہ کیوں آئی تھی؟ کس سلسلے میں؟“

”اس سوال کا جواب تو تمہیں بغیر پوچھے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔“ وہ مسخراڑانے کے انداز میں بولے۔

”میں اتنا ذہین ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔“ وہ الجھا نہیں اکھڑا ہوا تھا اب کے انہیں ٹھیک سے اندازہ ہو گیا۔

”کمال ہے اتنی سادہ سی بات نہیں سمجھ پائے تم۔“ وہ جبران کے لہجے سے دل میں پیدا ہونے والی گھبراہٹ کو چھپانے کی خاطر ہنسنے۔ ”وسائل کی کمی اور مسائل کے انبار نے ایک نہ ایک روز اسے ہماری طرف آنے پر مجبور کرنا ہی تھا۔ مجھو، آج وہی ایک

روز تھا۔

”نہیں!“ اس نے سختی سے کہا۔ ”اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فاریہ اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے یا پھر ہم سے مدد مانگنے کی خاطر۔ نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ بھی نہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔“ اس کے لہجے کا یقین محمود صاحب کو آگ لگا گیا۔ ”جانتے بھی ہو کس حال میں زندگی گزار رہا ہے پھر میں۔“ ان کا اپنا بیٹا ان کی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ وہ جتنا بھی جتنے کم تھا۔

”تمہاری نسل اور تمہارے مقابلے میں اس نے بیٹی کو منہ کی یونیورسٹی سے منہ کی ترین ڈگری تو دلوائی لیکن پھر اس کے آگے کیا۔ بتاؤ کیا آپشن تھا اس کے پاس۔

کہیں کوئی چاب لی اسے؟ نہیں نا!“

”چار پیسے جو مسعود کے پاس بچے تھے الٹا وہ بھی ضائع ہو گئے اس ڈگری کے حصول میں۔“ وہ اتنے غصے میں تھے کہ مسخراڑاتے ہوئے مسکراتا بھی بھول گئے۔

”یہ سب میری بات کا جواب نہیں ہے۔“ جبران نے متاثر ہونے سے انکار کیا۔ میں آپ سے صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ فاریہ آج صبح ہمارے آفس کیوں آئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے۔“

”نہی بتا رہا ہوں۔ اسے نوکری درکار تھی جس کی کوئی ویسٹنی ہمارے ہاں آج کل دستیاب نہیں۔ میں نے اسے سی وی ڈراپ کرنے کا بول دیا اور بتا دیا کہ جب بھی اس کی صلاحیت سے ملتی جلتی جگہ خالی ہوئی اسے بلا لیں گے۔“ وہ رکھائی سے بولے اور قریب رکھا ریوٹ اٹھا کر دی آن کیا۔

وہ کچھ دیر بے یقینی سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔

خدا جانے اسے سرور کار فاریہ کے آنے سے تمہایا اس سے ملنے آنے پر تھا۔ جو بھی تھا ان کے نزدیک یہ ایک بے کار موضوع تھا جس پر بات کرتے ہوئے اتنے منٹ ضائع نہیں ہونے چاہیے تھے جتنے کیے گئے تھے۔

☆☆☆

”فاریہ بھوکی مرکتی ہے۔ نوکری مانگتے ہمارے آفس نہیں آ سکتی وہ بھی میرے پاس۔“

یہ بات جبران نے محمود صاحب سے بات کرنے کے بعد عذرا یعنی اپنی ماں سے کہی تھی جو اس روز پہلی منزل کی طرف چڑھتی میڑھیوں کے نیچے جائے نماز بچانے نماز پڑھنے کی تیاری میں تھیں۔ ہر روز گھر کے کسی نئے کونے میں نماز پڑھ کر اسے پاک کرنا ان کا معمول تھا۔ نمانے کیوں اتنے برس گزر جانے کے باوجود انہیں گھر میں آئی دولت کے حلال ہونے کا یقین کیوں نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ ان کا شوہر اور تینوں بیٹے قسم کھا کر انہیں یقین دلانے میں مصروف رہتے تھے کہ وہ چاروں تن من دھن کے ساتھ محنت کر کے وہ روپیہ کماتے تھے ساطہ کے دل سے یہ شک شاید اس لیے نہیں جاتا تھا کہ وہ جانتی تھیں کہ اس حلال رزق کی بنیاد بددیانتی زیادتی اور دھوکے پر ڈالی گئی تھی۔ اب وہ چاروں جتنی بھی محنت کا دعویٰ کرتے بنیادی غلط ہوتو تجارت کیسے ٹھیک ہو سکتی تھی سو وہ اپنے شک کو عبادت کے جھولے میں جھلا کر سلانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔

”ارے تم معلوم تو کرو۔ کیا بتا خدا خواستہ وہ لوگ کسی ایسی مشکل میں ہوں کہ پتی کو نہ چاہتے ہوئے بھی آنا پڑ گیا۔“ جبران کی بات سن کر وہ بھی ٹھک گئی تھیں۔

”تو آپ فاریہ کو نہیں جانتیں۔ یا چچا کو؟“ جواب میں اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ آپ کو لگتا ہے کہ سخت سے سخت مشکل میں بھی وہ ہم سے مدد مانگنے ہماری طرف آئیں گے۔ نہیں ای ای ناممکن ہے۔“

”تمہارا خیال ہے تمہارے ابو کچھ چھپا رہے ہیں یا غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے سر ہلادیا۔ ”میں صرف اتنا جانتا چاہتا تھا کہ فاریہ مجھ سے ملنے آفس کیوں آئی اور یہ وہ مجھے بتائیں رہے۔“

یہ بات جبران نے اس سے کہی تھی جو اس کے لہجے میں ایک بے کار موضوع تھا جس پر بات کرتے ہوئے اتنے منٹ ضائع نہیں ہونے چاہیے تھے جتنے کیے گئے تھے۔



”دوبارہ مت پوچھنا ان سے۔“ وہ جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ اگر وہ خاص تم سے ملنے آئی تھی اور اسے تم ہی سے کوئی کام تھا تو دوبارہ کوشش کرے گی۔ انتظار کرو لیکن اپنے ابو سے دوبارہ ذکر مت کرنا۔ انہیں برا لگے گا۔“

اسے سمجھا کہ انہوں نے نماز کی نیت باعدہ لی تھی لیکن جبران کا ذہن ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ ”ہو! کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد اس نے سوچا تھا شاید انہی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ضرورت ہوگی تو دوبارہ آجائے گی۔ مجھے ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کمال ہے۔ میں کس نقیشت میں پڑ گیا اور وہ بھی کس کے لیے۔ فاریہ مسعود! اب کے اس کے ہونٹوں پر بھی تمغہ مزہب مسکراہٹ ابھری دنیا کا ہر دوسرا کام جس سے زیادہ اہم ہے۔“

فاریہ نے تیار آلو مونگرے سفید رنگ کی ڈش میں نکالے۔ سفید برتن میں ڈالا گیا کھانا صاف اور واضح دکھائی دیتا تھا۔

”آلو مونگرے کی سبزی کو ڈش آؤٹ کرنے کے بعد ہم اس کو باریک کٹے ہر ادھیا اور ہری مرچ سے گارنش کریں گے اور لیچے جناب ہماری مزے دار اور خوش رنگ آلو مونگرے کی سبزی تیار ہے۔“ وہ قمیض کے کالر پر لگے مائیک میں بول رہی تھی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر چہرے پر مسکراہٹ بکھیری، اسے اپنے چینل کو بسکراہٹ کرنے اور تیل آنگیوں کا بٹن دبانے کا پیغام دہرا تھا لیکن اس کی قسمت اسے یہ پیغام دہرانے کے بجائے مائیک بند کر کے مراد پر چلا نا پڑ گیا تھا۔

”کیمبرہ سیدھا رکھو مراد، تمہاری اسی لاپرواہی کی وجہ سے شیڈز اور کلر بگڑ جاتے ہیں۔“ دانت پیستے ہوئے بولی تھی۔

”میرا کوئی قصور نہیں باجی۔ کیمبرے کی اپنی کوالٹی ہلکی ہے۔“ مراد نے کئی بار کہا جلد ہر اما تھا۔ ”کیمبرے کی تو نہیں تمہارے دماغ کی کوالٹی ضرور ہلکی ہے۔“ وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر مراد کی

طرف آئی تھی۔ دوبارہ کیمبرہ سیٹ کر کے مراد کے ہاتھ میں دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنی پوزیشن پر واپس جا کر الو ادھی جیلے دہرانے لگی۔

”دودھ اچھی طرح ابال دیا ہے باجی! ویڈیو مکمل کر کے ایک بار پھر مائیک اتار دینے کے بعد وہ کچن میں رکھے اسٹول پر بیٹھی ہی تھی کہ ریشماں دودھ سے ہمراہین اٹھائے کچن میں داخل ہوئی۔ ”لیں اب اس میں فائنٹ لیموں کا رس ڈال لیتے ہیں۔“

”اوہ میرے خدا!“ فاریہ کا سر پیٹ لینے کوئی چاہئے لگا۔ ریشماں کا ویڈیو پر رکھے لیموں کا کاٹ کر دودھ میں ڈالنے ہی والی تھی اگر وہ تیزی سے اٹھ کر ریشماں کا ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو ایک کلو دودھ بھی پھٹ کر ضائع ہو جاتا اور وہ اس روز وہ بچنے دودھ سے خبر بنانے کی ویڈیو بھی نہ بن پاتی۔

”آلو مونگرے جن کی آپ اتنی تعریف کر رہے ہیں اور بھی اچھے بن سکتے تھے اگر میرا عملہ مستعد اور ہوشیار ہوتا۔“

اس رات کھانے کی میز پر اس کا موڈ سخت بگڑا ہوا تھا۔ اس روز وہ اپنی مہم میں نہ صرف ناکام رہی تھی بلکہ واپسی پر سبکی کا ایک دل جلاتا احساس بھی اس کے ہمراہ گھر آیا تھا اور اسی روز آلو مونگرے اور پیڑ والی ویڈیو بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں بن پائی تھیں۔

”عملہ!“ اب اس کی بات سن کر بے اختیار ہنس دیئے تھے۔ تمہارا اشارہ ریشماں اور مراد کی طرف ہی ہے نا؟“

”جی ہاں! اس نے ہاتھ میں پکڑا انٹیکن مینز پختے ہوئے جواب دیا۔ ”ریشماں نے پیاز چوب کر کے نہیں رکھے اور لیمن اور کوبھی چوب کر کے بجائے باریک پیس دیا۔“

”اور مراد..... اس نے کیا کوتاہی کی؟“ وہ..... اسے آج تک کیمبرے کا ایگل ٹھکانے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ اتنی بار کھا چکی ہوں

ہر بھی ہر بار غلطی کرتا ہے۔“ وہ سخت جھٹائی ہوئی تھی۔ ”جانتے ہیں اب صرف ان دو ویڈیوز کی ایڈیٹنگ پر کتنا وقت صرف ہوگا میرا! اس نے ابا کو یوں بتایا تھا جیسے اس سارے میں اصل قصور انہی کا ہو۔ وہ خاموش رہے تھے۔“

”نہیں..... نہیں چلے گا یہ کام۔“ ”میں بتا رہی ہوں زیادہ دیر نہیں چلے گا۔“

تاہم بھلا آٹھ مہینوں میں صرف آٹھ سو تین بسکراہٹ، روز دیکھتی ہوں کبھی پچھلے دن سے تین کم ہو جاتے ہیں اور کئی دنوں بعد شو کی قیمت بڑھے تو ایک آدھ سے زیادہ نہیں بڑھتا مزید کتنی دیر صبر سے کام لے پاؤں گی میں۔ اتنے کم لائکس، اس سے بھی کم سیزر، میرا چینل بہت جلد بند ہو جائے گا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں۔“ کچھ دیر ابا کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بڑے یقین سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جو بھی کام نیا شروع کیا جائے وہ اتنی جلدی کامیاب نہیں ہوتا۔“ انہیں فاریہ کے لیے بھاری بات آتی تھی اور ترس بھی۔ اسی لیے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”جلدی!“ اس نے تیزی سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آٹھ مہینے ہو رہے ہیں یہ ابھی جلدی ہے؟“ ”کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لیے کبھی کبھار برسوں انتظار کرنا پڑ جاتا ہے، حوصلہ مت مارو ایک دن تم اس ایورسٹ کو ضرور سر کر لو گی جو کامیابی کا استعارہ بنا کر تمہارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔“

”نہیں۔“ فاریہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”آپ بھی وزٹ کر کے دیکھیں ان گت فوڈ چینل چل رہے ہیں۔ بے شمار ایک سے بڑھ کر ایک، اس کمسن کے دن میں۔ میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو پاؤں گی۔“ اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔

”ایسا کرتے ہیں، اسے بند کر دیتے ہیں۔“ آنسوؤں کا گولہ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ جو کم کوالٹی کا کیمبرہ اور اس کی اسسٹنٹ ہیں یہ بکتے بکتے کچھ قیمت تو نکال

ہی جائیں گی۔“ ”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے سختی سے منع کیا۔ ”ہم نے یہ سب پیسہ کمانے کو یا کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لیے نہیں تمہارا شو پورا کرنے کے لیے خریدا تھا۔ مصروف رہنے کے ایک بہانے کے طور پر لائے تھے ہم انہیں یہ سب دیے ہی چلائیں گے جیسے اب تک چلا رہے ہیں چاہے ایک بھی بسکراہٹ نہ بڑھے چاہے ان ویڈیوز کے ویوز چند سیکڑوں تک ہی محدود کیوں نہ رہیں۔“

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کہتے ہوئے وہ فاریہ کا حوصلہ بڑھا رہے تھے یا اپنا لیکن اتنا ضرور جانتے تھے کہ ان کی بات سن کر فاریہ پہلے کی نسبت پر سکون ضرور نظر آنے لگی تھی جیسے انہوں نے اس کے سر پر رکھا کوئی بو جھاتا دیا ہو۔

☆☆☆ ”تم نے کسی سے پتا کیا فاریہ اس روز تمہارے آفس تم سے ملنے کیوں آئی تھی؟“ امی جو معاشی استحکام ملنے کے بعد اس کے دوسرے دو بھائیوں اور ان کی بیویوں کے لیے مام بن چکی تھیں۔ جبکہ وہ ابھی بھی ان کو امی ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ کئی دن بعد اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”تمہیں پتا کرنا چاہیے تھا اس کا انکار میں پتا سر دیکھ کر وہ پریشان ہوئیں۔ ”کیا معلوم اس کو دانتی مدد کی ضرورت ہو؟“

”ہو سکتا ہے اسے جاب کی ضرورت ہو اور وہ تمہارے ابو کے بجائے تم سے یہ بات کرنا چاہتی ہو۔ تمہارے ابو کو تو تم جانتے ہو۔ اصل غصہ تو مسعود اور فاریہ کو ان ہی پر ہوگا تم سے تمہارے بھائیوں اور مجھ سے ان کی کیا ناراضی ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں جانتے ہیں کہ ہم بے بس تھے۔“

”اف امی اور ان کی خوش فہمیاں۔“ جبران نے دل میں سوچا اور پھر نرمی سے انہیں سمجھانے لگا۔ ”فاریہ کی ڈگری اتنی ہلکی نہیں کہ اسے کہیں جاب نہ مل سکے اور وہ اس کے پیچھے خوار ہوتی ہم ہی



تک آہنچے۔  
”تھیں وہ کہیں جاب کرتی تو نہیں ہے۔“  
انہوں نے بے ساختہ کہا۔  
”پھر یہ اس کی اپنی مرضی ہوگی کہ وہ کہیں جاب نہ کرے۔“

”ان کے مالی حالات بہت اچھے تو نہیں ہیں مسعود کی پنشن ہے بس اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اس نے جو کسی کام میں تھوڑا بہت پیسہ انویسٹ کر رکھا ہے اس کے معمولی سے منافع پر معاملات چلا رہے ہیں وہ دونوں ہی۔“ جبران نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”اور فاریہ وہ چلاتی ہے کیا اس کو کہتے ہیں جیل۔ وہ جو انٹرنیٹ پر چلتے ہیں نا چیل کھانا دانا بنانا سکھاتی ہے جیل پر۔“ وہ فاریہ کی آمد کا سن کر پریشان تھیں۔ اسی لیے اپنے روانی میں بولتی چلی جا رہی تھیں۔

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا؟“ جبران کو ان کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔

”وہ۔“ ان کی روانی گڑ بڑا گئی۔ انہوں نے جبران سے نظریں چرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ شاید وہ کوئی مناسب جواب سوچ رہی تھیں۔

”ای اے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اتنی مکمل معلومات کون دے رہا ہے؟“ جبران نے ان سے اپنا سوال دہرایا۔

”مراد، مراد کبھی کبھار ملنے آجاتا ہے۔“ وہ جھوٹ گھڑنے کی عادی نہیں تھیں۔

”ضرورت پڑنے پر گھڑی لیتیں لیکن اس کے لیے انہیں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔“

”اچھا، اور مراد ان کی طرف بھی جاتا رہتا ہوگا۔ ہے نا۔“

”ریشمال اور مراد، مسعود کے گھر کا کام دام کر دیتے ہیں۔ پرانی مروت والے لوگ ہیں۔ مراد بتا رہا تھا وہ دونوں مسعود سے بہت معمولی معاوضہ لیتے ہیں۔ اپنا خرچا دوسرے گھروں میں کام کر کے پورا

کر لیتے ہیں۔“ انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے جبران کی طرف دیکھا۔ جو سوچ میں گم تھا۔  
”دیکھو اپنے ابو کو مت بتانا کہیں وہ مراد کا آنا جانا نہ بند کر دیں۔“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔  
”نہیں بتاؤں گا اگر ایک بات آپ مجھے سچ سچ بتائیں تو۔“

”ہاں پوچھو۔“  
”آپ مراد کو کتنے پیسے دے کر اس معمولی معاوضے کے نقصان کی تلافی کرتی ہیں۔“

جبران ان کا بیٹھا اور ان کے دوسرے بیٹوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھا اسی لیے ان کے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔

”میں اسے کچھ نہ دوں تب بھی وہ مسعود کے ہاں کام کرنا نہیں چھوڑے گا۔ اسے اس خاندان سے موروثی انس ہے اور اس میں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تمہارے ابو کے ڈر سے ان کی موجودگی میں کبھی یہاں نہیں آیا۔ مجھ سے کبھی کبھار ملنے آجاتا ہے اسی موروثی انس کو نبھانے کی خاطر۔“

”ہوں۔“ جبران نے سر ہلایا اور اپنے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دے۔ ”میں مراد کے بارے میں ابو کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اگلی بار جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ اسے مجھ سے ضرور ملوائیں گی۔“

”ارے وہ کسی ایسے وقت میں تو آتا ہی نہیں جب تم چاروں میں سے کوئی گھر پر ہو وہ تو۔۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا گئیں۔

”اب وہ آئے تو آپ مجھے کال کر دیجیے گا۔ میں گھر آ جاؤں گا۔“

لیکن وہ انہیں خود پر غصہ آنے لگا وہ کیوں مراد کے آنے جانے کا قصہ کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

”سوچ لیں ابو کو پتہ چل گیا تو مراد یہاں آسندا آ نہیں پائے گا۔“ اس نے سنجیدہ چہرہ بنایا۔

”تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔“ وہ ناراض ہو گئیں اور جبران کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”گلتا ہے آپ اپنی بہوؤں کے ساتھ بیٹھ کرٹی دی ڈرا سے زیادہ دیکھنے لگی ہیں۔“  
”بلیک میلنگ کیا ہوتی ہے یہ بھی معلوم ہو گیا آپ کو۔“ وہ مسکرایا۔  
”نہیں بھیا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”کچھ نیا معلوم کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ جتنا اب تک دیکھ لیا۔ سن لیا۔ سمجھ لیا کافی ہے۔“

جبران نے اپنی سادہ اور معصوم ماں کی طرف پیار سے دیکھا۔ ان سب کی زندگیوں میں چند سال پہلے جو انقلاب آیا تھا اس نے ان سب کی شخصیتوں کو بدل کر رکھ دیا تھا سوائے اس کی ماں کے۔ وہ سدا سے مروت اور وضع داری نبانے کی ناکل تھیں۔ کبھی کبھی جبران کو ایسا لگتا جیسے اس نئی زندگی سے سمجھوتا بھی انہوں نے وضع داری اور مروت نبانے کے چکر میں کر رکھا تھا۔ اسے شوہر اور بیٹوں کا دل رکھنے کی خاطر اس نے طرز زندگی کو بظاہر اپنا بھی چکی تھیں لیکن اندر سے وہ بھی وہی تھیں اور ان کا دل بھی وہی تھا۔ خود سے بڑے ہر رشتے پر تعلق کا بھرم رکھنے والی۔ ہر کسی کی مدد کے لیے بے چین، اپنے کام کو اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادی، گھڑ، سلیقہ شعار عذر آتا۔

”دیئے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ اسے اچانک ایک خیال آیا۔  
”وہ کیا؟“

وہ سر پر کادو بیٹھ ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔  
”فاریہ پروفیشنل کیریئر بنانے کے بجائے کھانے پنانے اور سکھانے پر کیوں لگ گئی۔ بہت عجیب سی بات ہے نا۔“

”کہیں ڈھنگ کی نوکری جو نہیں ملی اسے مراد بتا رہا تھا۔“ جواب میں وہ کچھ۔ بتاتے ہوئے رک گئیں۔ ”میری عقل دیکھو۔ وہ باتیں جو مراد مجھے اس گھر کے راز کے طور پر سناتا ہے میں کیوں کسی دوسرے کان کو سنانے لگی ہوں۔“

”ہاں ہاں کیا بتا رہا تھا مراد، رک کیوں گئیں آپ؟“ جبران کے لہجے میں بے قراری تھی۔

”میں نے ہمیشہ اس جھگڑے میں آپ کو ان دونوں باپ بیٹی کی طرف داری ہی کرتے دیکھا

”تمہیں کیا کہ وہ کیا بتا رہا تھا۔“ اب کے ان کا لہجہ سخت ہوا۔ ”اب ان دونوں باپ بیٹی پر جو بیٹے سو بیٹے تم سے مطلب۔“

”آپ بھول رہی ہیں۔ فاریہ مجھ سے ملنے آئی تھی آفس اور یہ بات آفس کے ڈائریکٹر ریکارڈ میں درج ہے۔ آپ چاہیں تو کنفرم کرالیں۔“  
”چلو فرض کرو کہ فاریہ تم سے مدد مانگنے آئی تھی کسی سلسلے میں تو کیا تم اس کی مدد کرو گے؟“ انہوں نے اس سے سوال کیا۔

”یہ بات۔“ جبران نے چٹکی بجائی۔ ”مطلب اسے مدد چاہیے۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ میں نے تو تم سے پوچھا ہے کہ اس کی مدد کرو گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے صاف جواب دیا۔ ”یاد رہے آپ کو کیسے اس نے زبان چلائی تھی ابو کے سامنے بہت زعم تھا اسے ہم سے الگ ہو کر وہ لوگ مر نہیں جائیں گے۔ زندگی میں کسی اپنے کے بغیر کیسے سروسو کیا جاتا ہے وہ ہمیں کر کے دکھائے گی۔ یاد ہے یا بھول گئیں۔“

جواب میں انہوں نے منہ بنا کر یوں سر جھٹکا جیسے اس کی بات سے بالکل بھی متفق نہیں تھیں۔

”اور آپ کو پتا ہے یونیورسٹی کے پورے چار سال میں اگر میں نے اسے مخاطب نہیں کیا تو اس نے بھی مجھے بلایا تک نہیں۔ دماغ داری اور انکڑ یہاں رکھی تھی اس کی یہاں۔“ اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

”کون سی دماغ داری اور کہاں کی انکڑ۔“ وہ بے زاری سے بولیں۔ ”تم سب باپ بیٹوں نے جیسے ان دونوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکال لی تھی۔ اس کے بعد کون سی انکڑ دکھانے کے قابل رہ گئے وہ دونوں۔“

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ ہماری ماں ہیں یا فاریہ کی۔ میں نے ہمیشہ اس جھگڑے میں آپ کو ان دونوں باپ بیٹی کی طرف داری ہی کرتے دیکھا

”میں نے ہمیشہ اس جھگڑے میں آپ کو ان دونوں باپ بیٹی کی طرف داری ہی کرتے دیکھا

”میں نے ہمیشہ اس جھگڑے میں آپ کو ان دونوں باپ بیٹی کی طرف داری ہی کرتے دیکھا



# دین

اپریل 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مذہب دار و پیغمبر اور  
دلچسپ مضامین  
کے ساتھ



- مصنفہ ”نفیسہ سعید“ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار ”نبیل بٹ“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“
- آواز کی دنیا سے ”آرے عزیز احمد“ اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ ”مارینہ نذیر“ کے ”مقابلہ ہے آئینہ“
- ”ہوا کی رن بدل گئیں“ نگہت عبداللہ
- کاسلے دار ناول،
- ”شب نم کی سر“ رخ چوہدری کا سلسلہ دار ناول،
- ”چوچ مارے کوئے“ شامکد وعباد کا مکمل ناول،
- ”ساگر کنارے“ ام طہیور کا مکمل ناول،
- ”شام رنگ سیاہ“ انیل رضا کا ناول،
- ”ایک کہانی محبت کی“ نگہت سیما کا ناول،
- ”عزم وفا“ شبانہ شوکت کا ناول،
- امت العزیز شہزاد بشری احمد اور
- نازیہ کنول نازی کے فنانے اور مستقل طے،

لانے کی ڈیوٹی کیسے شوق سے دیتے رہے تھے۔  
کیسے سنہری دن تھے۔ انہوں نے گہرا سانس  
لیتے ہوئے بھی آنکھیں دوپٹے کے کونے سے صاف  
کیں۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ غلوں اور محبت کی ڈور میں  
بندھا وہ گہرا نہ یوں ٹوٹے گا کہ اس کے فرد قسیم ہونے  
کے بعد ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھنے کی قسم  
کھانے پر اتر آئیں گے۔

جب سے بچپن سے تھے دوبارہ کب کسی نے  
دوسرے کو دیکھا تھا سوائے جبران اور فاریہ کے جو  
اتفاق سے یونیورسٹی میں ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے  
تھے۔ لیکن وہ بھی کیا اکٹھا ہوتا تھا جو چار سالوں میں  
ایک مرتبہ بھی دعا سلام تک نہ ہوتی تھی۔ وہ اتنے  
پرسوں میں یہ کہانی اسی طرح نبھانے لگی بار بار کر چکی  
تھیں اور اس کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتی تھیں۔ یادوں  
کی یہ وہ پٹاری تھی جو وہ اپنے ساتھ اس گھر میں لے کر  
آئی تھیں اور تنہائی میسر آنے پر اسے کھول کر بیٹھ جانا  
ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”لیکن یہ فاریہ، آخر وہ جبران کے پاس کیوں آئی  
تھی؟“ اگلی نماز کے لیے اٹھنے سے پہلے اس سلسلے کا  
آخری خیال انہیں ایک بار پھر سوچ میں ڈال گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ ہو نہیں سکتا۔“ حرم خرم خان، بہت دن بعد  
ایک بار پھر اس کے گھر میں موجود تھی۔ نہیں فاریہ ایہ  
ناممکن ہے کہ وہ ہمیں نہ ملے۔“

”نہیں ملا۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ مجھے نہیں ملا۔“  
فاریہ جو اس کی دوسری آمد پر پہلی آمد کی طرح تو  
مرعوب نہیں ہوئی تھی لیکن کچھ ایسا تھا جو حرم کے سامنے  
اسے بے آرام کر رہا تھا۔

”میں اس کے آفس صرف تم سے کیا وعدہ  
نبھانے لگی تھی اور وہ مجھے وہاں نہیں ملا میں معذرت  
خواہ ہوں اس سے زیادہ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد  
نہیں کر سکتی۔“

”کسے نہیں کر سکتیں۔“ حرم کی آنکھیں پل بھر  
میں بیگ لگیں جن میں اس روز اس نے ہلکے پھوڑے

دوا، یہ ٹیسٹ وہ ٹیسٹ کے چکروں میں پھنسی رہی  
تھی۔ یوں فاریہ تو جیسے پیدا ہوتے ہی ان کی گود میں  
آگئی تھی۔ خود ان کی اپنی کوئی جتنی بھی نہیں سوچا یہ بیٹا  
کو بھی مامتا سے محروم کا احساس نہیں ہوا۔

بیٹیوں کے حوالے سے ان کے لیے ”عذرا آپ“  
کے روایتی سے خیالات تھے۔ کم گو، بولے تو آہستہ  
بولے۔ پر اعتماد ہو لیکن شرم حیا کے دامن سے ہی بندھی  
رہے۔ پہننے اوڑھنے چلنے، پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے،  
کھانے، پینے ہر انداز میں نسوانیت جھلکتی نظر آئے۔  
سلیقہ شعار اور گھر گھر ہستی سنبھالنے کے تمام گھر ور سکھے۔  
سوانہوں نے فاریہ کی تربیت کی عمارت کو بھی ان  
ہی بنیاد پر اٹھانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی تھی۔  
فاریہ عمر ہی وہ چھوٹے دیور مسعود کی بیٹی جو عورت مرد کی  
برابری والی تحریک کے نمبر ایک مداح تھے اور ہر سے گھر  
میں اگلی لڑکی ہونے کے سبب اسے ان کے اپنے  
چاروں بیٹوں ہی کی مصاحبت میسر تھی سو فاریہ بننا ان کی  
تربیت اور دستیاب عمومی حالات میں پل بڑھ کر جب  
بڑی ہوئی تو سلیقے، سچاؤ کے ساتھ ساتھ مددگار بننے کے  
گرمی بھی خوب جان چکی تھی۔

وہ پر اعتماد تھی، حاضر جواب اور ذہین تھی اور یہ  
اس حاضر جوابی اور اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ جب محمود اور  
مسعود صاحب کے درمیان مکان کی فروخت کا جھگڑا اٹھا  
تو فاریہ نہ صرف مسعود صاحب کے ساتھ ڈٹ کر کھڑی  
ہوئی بلکہ اس نے اپنے اس تابا جن کے سامنے پہلے بھی  
اونچی آواز میں بولی نہیں تھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال  
کر ان کی بدینتی جو اس کے اور زیادتی پر بھی تقریر بھی کر ڈالی  
تھی۔ اور اسی تقریر کی وجہ سے تو ان کے شوہر اور بیٹوں  
بیٹے فاریہ کے نام سے بھی متفر ہو چکے تھے۔

ورنہ یہ جبران دم دم کا ساتھ تھا اس کا فاریہ  
کے ساتھ، اسکول میں ایک ساتھ پڑھے تھے دونوں  
اور اکیڈمی بھی اکٹھے جاتے تھے۔ دونوں کی دوستی اور  
ذہنی ہم آہنگی کی مثالیں دی جاتی تھیں اور کامران اور  
عثمان، وہ تو بھی فاریہ کو کنکھوں پر اٹھائے پھرنے  
سے لے کر اسے کالج اور پھر سہیلیوں کے گھر چھوڑنے

ہے۔“ وہ بگڑنے لگا۔

”کیوں نہ کروں ان کی طرف داری، مسعود  
اپنے موقف میں بالکل بھی غلط نہیں تھا۔ اسے اب مرحوم  
کا بیٹا گھر عزیز تھا تو اسے وہاں سے بے دخل کرنے کا  
حق کسی کو نہیں تھا اور بے دخلی بھی ایسی۔“ جیسے بھی یاد تو  
ہوگا کہ اس بے دخلی کی بنیاد میں کیسی بدینتی اور دھوکا  
شامل تھا۔“

”عیش کر رہی ہیں آپ آج اور آپ کی پوری  
فیلی۔“ جبران چڑھائی کے موڈ میں آ گیا۔  
”کہاں دس، دس لوگوں کے لیے پکائی، کھلائی  
تھیں اپنے ہاتھ سے۔ سب کی ایک ایک ضرورت کا  
خیال رکھنا پڑتا تھا آپ کو اور کہاں اب ایک ایک کام  
کے لیے دس، دس ملازم آپ کے سامنے موجود رہتے  
ہیں۔ شکر مت ادا کیجیے گا بھی۔“ وہ منہ بنا کر اٹھ گیا۔  
”جب تمہیں جو چاہے ہو جائے اس کی مدد کرنی  
ہی نہیں تو پھر اتنا تجسس کیوں ہے کہ وہ کیوں آئی  
تھی؟“ وہ ناراض ہو گئیں۔

”تم لوگ بس اپنی اس دنیا میں جیتے رہو جو تم  
لوگوں نے نئی بسالی ہے۔ تمہاری بلا سے اس دنیا سے  
باہر کوئی جیسے یا مرے۔“  
”مراد کا میں نے کہا ہے کہ آپ سے، ملوایے گا  
اس سے مجھے۔“ جبران نے ان کے پاس سے ہٹتے  
ہوئے کہا۔

”یہ تو تم بھول ہی جاؤ۔“ انہوں نے اس کی  
طرف دیکھا اور دل میں کہا۔ جبران کے رویے پر ان  
کا ملول دل اور بھی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ ”مراد سے  
پوچھتا ہے فاریہ نوکری کرنے کے بجائے کھانے  
پنانے اور سکھانے کیوں لگ گئی۔ ارے یہ ہی تو ایک  
کام ڈھنگ سے سکھاپانی میں اسے۔“

انہیں گزرے دن یاد آنے لگی۔ فاریہ کو انہوں  
نے اپنی سگی اولاد کی طرح بالالا تھا۔ ساڑھے تین سال  
کی عمر ہی فاریہ کی جب اس کی ماں یعنی ان کی دیورانی  
فرحت کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی بے چاری  
مرحومہ کینسر کی تشخیص کے بعد دو سال اسپتال، علاج،



رنگ کے لیزر لگا رکھے تھے۔ ”ایسے تو نہ کہو فاریہ!“  
 حرم کی ہنسی بھوری آنکھیں ایک بار پھر فاریہ کے  
 دل پر اثر کرنے لگیں۔ لیکن اس روز وہ ہر چیز سے  
 حرم کی آمد سے پہلے ہی بیزار تھی۔ اس کی تازہ ویڈیو کو  
 پچھلے پانچ دن میں لگتی کے ایک سو بیس ویوز اور دس  
 لائکس مل پائے تھے۔ اس ویڈیو کو کہیں بھی شیئر نہیں  
 کیا گیا تھا اور اس کے سبسکرائبرز میں بھی ہرگز رے  
 دن کے ساتھ کی آتی جا رہی تھی۔ سو اس نے دل پھر  
 کر کے حرم کی آنکھوں سے دھیان ہٹالیا۔  
 ”مجھے لگتا ہے تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو حرم!  
 جبران اور اس کی فیکٹی کے ساتھ ہمارا تعلق بس نام ہی کا  
 ہے۔ ایک دوسرے سے تو درکنار سر راہ دیکھ کر پھرتے  
 تنک نہیں۔ تعلق تو کیا ہمارے درمیان حق قسم کے  
 ایسے فاصلے موجود ہیں جو کبھی کم یا ختم ہو نہیں سکتے۔“  
 ”غلط کہہ رہی ہو تم! انرم نے ٹیوپیہ کو جکے ہاتھ سے  
 آنکھوں پر پھیرا۔ جبران نے خود مجھے تمہارے بارے  
 میں بتایا تھا کہ تم اس کی کلوز کرن نہیں اور یہ کہ اس کی  
 قریبی دوست بھی رہ چکی ہو۔ وہ تمہارے ساتھ ہر بات  
 شیئر کرتا رہا ہے اور تم اس کے سب راز جانتی تھیں۔“  
 ”میں اس کی کلوز اور قریبی دوست رہ چکی ہوں۔  
 وہ میرے ساتھ ہر بات شیئر کرتا رہا ہے اور میں اس  
 کے سب راز جانتی تھی تمہارے ہر جملے کے ساتھ ماضی  
 بعید کا صیغہ لگا ہوا ہے حرم! یہ سب باتیں بہت پرانے  
 زمانے کی ہیں۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ایک بار  
 پھر معذرت خواہ ہوں۔“ فاریہ نے حرم کی طرف  
 دیکھے بغیر جواب دیا۔  
 ”مجھے پتا ہے۔“ حرم گھوم کر اس کی نظروں کے  
 عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ”لیکن تم ابھی اس  
 تنک رسائی حاصل کر سکتی ہو۔ آفس میں، گھر میں، نوں  
 پر، اسپورٹس کلب میں، کہیں بھی، مجھے یقین ہے فاریہ  
 تم اس تنک پہنچو گی تو وہ کبھی تم سے ملنے سے انکار نہیں  
 کرے گا۔“  
 ”حرم پلیز!“ فاریہ نے پوری کوشش کرتے ہوئے  
 اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ ”تمہارا یہ کام تم

دونوں کے مشترکہ دوست بہتر کر سکتے ہیں۔ تم کسی کو بھی  
 اس معاملے میں ڈال کر دیکھو، تمہارا کام ہو جائے گا۔  
 میرے سلسلے میں تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔“  
 ”تمہارا کیا خیال ہے میں نے یہ سب کر کے  
 نہیں دیکھا ہوگا۔“ کمرے کی خاموشی میں حرم کی سسکی  
 ابھری۔ ”سب میوچل فرینڈز اپنی سی کوشش کر چکے  
 ہیں اور اس نے سب ہی کو یہ دیکھ لی ہے کہ اگر  
 انہوں نے میرے اور اس کے سلسلے میں کوئی بات کی تو  
 وہ ان سے دوستی ختم کر دے گا۔ ایسے میں تم بتاؤ میں کیا  
 کروں۔“ اب وہ بلند آواز میں رو رہی تھی۔  
 ”میرے خدا!“ فاریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ  
 وہ اس لڑکی سے جان کیسے چھڑائے جو زبردستی اس  
 کے سر پر آ بیٹھی تھی۔  
 ”میں نے سنا تھا تم بہت بڑے دلی کی مالک ہو،  
 کسی کی بھی مدد کے لیے فوراً تیار ہو جاتی ہو۔ انسان  
 دوست ہو، ہمدرد ہو، کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتیں۔“ وہ  
 کہے چلی جا رہی تھی۔  
 ”تم نے میرے بارے میں یہ سنا، وہ سنا اور کن  
 کر بھی اتنے فاصلے پر رہیں کہ میں تمہیں دور دور سے  
 دیکھ کر ہی متاثر ہوتی رہی۔“  
 فاریہ کا دل چاہا وہ حرم کو دل کھول کر سنا دے لیکن  
 وہ بڑے دل والی تھی۔ انسان دوست اور ہمدرد تھی۔  
 سامنے والے کو تکلیف میں دیکھ کر پرانے رویوں کے  
 طعنے چاہ کر بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اسی لیے۔ اب یہ ہر  
 طرف سے مایوسی ہو کر تمہیں جو میرے گھر کا راستہ  
 سوچا ہے تو سمجھو میرے گھر کی کال تیل کرنٹ دیتی  
 ہے۔“ اس جیسی کئی باتیں بھی اسے نہیں سنا سکی تھی۔  
 ”میری خاطر پلیز میری خاطر ایک بار جبران سے  
 ملنے کی کوشش کرو۔“ اس نے اپنی نظروں کے سامنے حرم  
 کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھے۔ ”اسے بتاؤ کہ اس کے  
 بغیر میں کس حال میں جی رہی ہوں، جی بھی کیا میں تو لمحہ  
 لمحہ مر رہی ہوں۔“ حرم کے جگر کا حال سننے ہوئے فاریہ  
 کی آنکھوں کی پتلیاں لمحہ بھر کے لیے پھیلیں۔ حرم کا حالیہ  
 اس کا لباس، اس کی نو میک اپ، تنک نہیں سے بھی لمحہ

مرنے والی کیفیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔  
 ”دیکھو جبران اگر یونہی مجھ سے گریزاں رہا تو کیا  
 پتا اس کے بغیر میری جانوں۔“ وہ کہہ رہی تھی اور فاریہ  
 نے اس کی طرف دیکھتے سوچا تھا۔  
 ”کیا مرنا اتنا آسان ہوتا ہے وہ بھی کسی کھٹور،  
 پتھر دل انسان کے لیے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ اسے  
 زندگی کی اہمیت کا احساس نہیں یا پھر مرجانے کی  
 کیفیت کا ادراک نہیں۔ ”اتنی بڑی اور مشکل بات  
 کیسے کر لیتے ہیں لوگ۔“  
 ”تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی تاہم ابھی  
 تک کسی کی محبت نہیں بنی ہو تاہم تم نے کسی کو محبوب بنایا  
 ہے۔ جب ہی تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا فاریہ،  
 جب ہی تم اندازہ نہیں کر پا رہیں کہ بن چلی جو تڑپتی  
 ہے اصل میں وہ کس اذیت سے نزر رہی ہوئی ہے۔ عام  
 انسان کی آنکھ صرف تڑپنا ہی دیکھ سکتی ہے تا اس کے  
 اندر کی اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔“ حرم فاریہ کی سوچ  
 اور فہم سے کہیں بڑی باتیں کر رہی تھی۔ عمومی گفتگو میں  
 کبھی کوئی جملہ اردو میں بولنے والی نے ایسے بھاری لفظ  
 کب سیکھے تھے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”تم نے صرف محبوب بنایا تھا یا تم بھی محبوب  
 تھیں؟“ وہ اٹکتے ہوئے بولی۔  
 ”پتا نہیں۔“ حرم نے اس کے سوال پر ایک سیکنڈ  
 کے لیے ٹھکنے کے بعد جواب دیا تھا۔  
 ”جس چیز کا تمہیں یقین ہی نہیں، اس کی خاطر  
 مرجانا چاہتی ہو۔“ وہ بڑبڑاتی تھی حرم کو اس کے سوال  
 پر الجھن ہوئی تھی جب ہی اس نے اپنی جیکٹ کی  
 جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنا رخ دوسری طرف  
 پھیر لیا تھا۔  
 ”پچھلی اور جل کا ازل کا ساتھ ہے۔ بن جل  
 پچھلی کی تڑپ تو سب ہی نے دیکھی ہو گی لیکن بن پچھلی  
 جل پر کیا گزرتی ہے۔ بھی سنا نہ دیکھا۔“  
 فاریہ کے ذہن میں شاید غیر ضروری سوال جنم  
 لے رہے تھے۔  
 ”جل شاید پچھلیوں سے بھرا رہتا ہے اسی لیے

ایک پچھلی سے دوری سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ  
 تڑپتا ہے نہ ہی مرتا ہے۔ خود میں مکن سا کن کھڑا  
 رہتا ہے یا پھر اپنے بہادر پر بننے میں مکن رہتا ہے۔ ہے  
 نا؟“ اپنے تئیں اسے ایک پتے کی بات سوچتی تھی اس  
 نے تائید کے لیے حرم کی طرف دیکھا تھا۔  
 ”اب تم بہانے گھڑ رہی ہو فاریہ! افرار حاصل کرنا  
 چاہتی ہو۔ یہ بہانے اور گریز ہم جیسوں پر بھتا ہے۔  
 میرا مطلب ہے ہم جیسے مفرد، خود غرض اور روڈ لوگوں  
 پر۔“ اس نے جتانے والے انداز میں فاریہ کو دیکھا۔  
 ”تمہیں یہ سب سوٹ نہیں کرتا تم تو عاجزی پسند  
 رحم دل اور بے غرض لڑکی ہو۔ تم پر ایسے رویے چلتے  
 نہیں۔ طغر، طعنے اور غصہ یہ تمہاری گواہی نہیں ہیں تم  
 کیوں خود پر یہ رویہ اوڑھنا چاہتی ہو۔“  
 ”یہ مجھے میری اوقات یاد دلانا چاہا۔ رہی ہے یا  
 اپنی حیثیت؟“ فاریہ نے چونک کر دیکھا۔  
 ”تم بلسڈ ہو فاریہ، جو کبھی شخص انسانیت پسند ہے  
 وہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمتی کے اس ستارے کو سر پر  
 سچائے تم میری خاطر جبران کے پاس دوبارہ ضرور جاؤ  
 گی۔ مجھے یقین ہے۔“  
 حرم نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ فاریہ نے  
 حرم کے ہاتھ کی نرمی کو محسوس کیا اور اس کے چہرے پر  
 ایک نظر ڈالی۔ حرم کے چہرے کا کرب اس کے دل کو  
 چھو گیا۔  
 ایک انسان سے دوری نے اسے کیا سے کیا  
 بتا دیا۔ مجھ جیسی لڑکی کے در کی سائل بن کر رہ گئی یہ۔ کیا  
 محبت واقعی ایسا آکٹوپس ہے جس کی گرفت سے جان  
 چھڑائے نہیں چھوٹی۔ وہ حرم اور جبران کے فصے پر  
 لعنت بھیج کر اس پر مٹی ڈالنا بھول گئی۔  
 ”اس باری تو کچھ بھی ہوا اسی سے مل کر آؤں گی۔  
 وہ اس کہنی کا سی ای او ہے جس کے آفس میں اس روز  
 گئی تھی اور چیئر مین کے آفس کے کمرے کی لوکیشن  
 مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ اب کوئی مجھے دھوکے سے بھی  
 اس کمرے کی طرف نہیں۔  
 (دوسری اود آخری قسط آئندہ ماہ)





دلہن کے پہنچنے سے پہلے خالہ، چھوٹی ممانی اور  
ثریا نے گھر پہنچ کر بہو کے استقبال کی تیاری کر لی  
تھی۔ آج تو کراچی سے لڈن ماموں بھی آگئے تھے  
جو خالہ سے چھوٹے تھے اور لفظ لٹنے میں خالہ کے  
بڑوں کو بھی مات۔ دیتے تھے۔ دلہن کے استقبال  
کے لیے وہ بھی بہن کے ساتھ کھڑے تھے۔ رشتہ دار  
پچیاں گلاب کی پتیوں کی پتلیں لیے قطار بنا کر کھڑی  
تھیں۔ سب سے آگے خالہ اور چھوٹی ممانی تھیں۔  
دلہن کو عاقب نے ہاتھ کا سہارا دے کر کار سے اتارا۔  
اس کے دائیں بائیں رابعہ اور چھوٹی ممانی کی بہوویں  
آگئیں اور دلہن دولہا کو لے کر دروازے کی طرف  
چلیں۔

”خوش آمدید..... خوش آمدید.....“

خالہ نے خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے زبان کا  
دھیان رکھتے ہوئے دلہن کا استقبال کیا اور  
دونوں کا ہاتھ چوم کر اندر آنے کا راستہ دیا۔ چھوٹی  
پچیاں دف بجارتی تھیں جب کہ ان کے ساتھ کھڑی  
بڑی پچیاں پھول برسا رہی تھیں۔  
”آؤ ثریا! رابعہ تخت کو دلہن پر لے آؤ۔ دیکھ کر  
دلہن کا ہاتھ پکڑ لو تم عاقب۔ ہاں ایسے ہی آگے لے  
آؤ۔“

”اب یہ تخت کون اٹھائے گا۔ دلہن کو ہی اٹھا  
لیتے ہیں۔“ ثریا نے معصوم بختے ہوئے کہا۔  
”ہٹو پرے..... ذرا سا زبان کا لڑکھڑاتا بھی  
جھیلانہیں جاتا۔“ خالہ نے پھر ناپ تول کر کہا۔  
”ذرا آہستہ چلو عاقب! میں ویڈیو بنا رہی  
ہوں۔“ چھوٹی ممانی کی بہوہٹے ہوئے بولی۔

”خالہ آپ بھی عاقب کے دائیں طرف  
آجائیں۔ آپ کی بھی ویڈیو بنانی ہے۔ آخر آپ  
کے بیٹے کی بچی ہے۔“ رابعہ نے ہنسی ضبط کرتے  
ہوئے خالہ کو بھی آگے بلایا۔  
”ہاں! ہاں۔ میں بھی آتی ہوں۔ ذرا یہ مٹھائی  
رکھو ادوں۔“

”مٹھائی میں رکھو ادیتی ہوں، پھوپھو آپ  
یہاں آجائیں۔“ ثریا تیزی سے باورچی خانے کی  
طرف چلی۔  
”ہاں یہ ٹکڑا مٹھائے..... مٹھائی ٹکڑے.....“  
صحیح لفظ نہ نکلتا تھا خالہ کے منہ سے، نہ نکلا۔  
”اچھا پھوپھو اچھا۔ میں مٹھائی کے ٹکڑے  
سنہال کر رکھ دیتی ہوں۔“ ہنسی کی پھلجڑیوں میں  
ثریا سمجھ کر بولی۔  
”لڈن کو بھی آگے بلاؤ۔“ خالہ نے مڑ کر لڈن  
ماموں کو بلایا۔

”ارے آپ! آپ جاییے آگے۔ ہم یہیں  
ٹھیک ہیں۔“ لڈن ماموں نے افساری دکھائی۔  
”چلیے چلیے لڈن ماموں آگے آئیے۔“ ننے  
اور نومی نے پکڑ کر ماموں کو عاقب کے دوسری طرف  
کھڑا کیا۔

”چلیے بن گئی ویڈیو! اب دلہن اور عاقب کو  
تخت پر بٹھا دیں۔“ چھوٹی ممانی کی بہو بولی۔ منا اور  
نومی بھی کھٹکھٹ تصویریں بنا رہے تھے۔  
”لڈن آؤ! پہلے تم دلہن کو پیار دو، عروسہ یہ  
تمہارے لڈن نانا ہیں۔ آج شام ہی کراچی سے  
پہنچے ہیں۔ سلام کرو ان کو۔“ خالہ نے عروسہ کو بتایا۔  
عروسہ نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ لڈن  
ماموں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
”سدا خوش رہو بیٹیا! اور کھڑے ہو کر عاقب  
کو گلے لگا کر ملے۔“  
”کیسے ہیں ماموں آپ؟“ عاقب نے  
پوچھا۔

”ارے ہم بالکل ٹھیک ہیں..... بالکل.....“  
لڈن ماموں سے ملتھلتے سنبھلتے بھی غلطی ہو گئی۔ سب  
ہی بے اختیار ہنس پڑے۔

”حال پوچھا ہے ماموں! آپ کی تجوری کا  
پاس در نہیں۔“ کوئی شرارتی بچہ بلند آواز سے بولا۔  
”چپ کر جاؤ بد گیز۔ بڑوں کی غلطی نہیں  
نکالتے۔“ خالہ خود بھی ہنس رہی تھیں۔

لڈن ماموں نے دلہن کو منہ دکھائی دی۔ پھر  
سب ہی باری باری آکر منہ دکھائی دینے لگے۔ آپا  
نے سونے کی انگوٹھی پہنائی۔ چھوٹی ممانی نے چین  
پہنائی۔ بڑی ممانی نے سکن دیا۔ باقی سب نے  
لفافے دیے۔ خالہ کی خوشی دیدنی تھی۔  
”چلو بچو! اب ڈھولا..... ڈھولی.....  
ڈھولن.....“ خالہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈھولک  
رابعہ کے ہاتھ میں پکڑا دی، جو ہنس ہنس کر پگھلا رہی  
تھی۔

”آؤ اب سب ڈھولا..... ڈھولی..... ڈھولن  
بجاتے ہیں۔“ ممانی کہاں باز آنے والی تھیں۔  
”سکھیوں سے لکھ دو ری! ہاتھوں سے  
مہندی.....“

ڈھولی..... اوہ یعنی ڈھولکی ابھی رکھی ہی گئی تھی،  
رابعہ نے اس پر اپنا گھٹنہ ٹیک کر چچ کر گڑا ہی تھا کہ  
خالہ نے گانا بتایا۔ مہمان تو مہمان عروسہ بھی کھلکھلا کر  
ہنس پڑی۔ بلکہ اسے تو کچھ ایسی ہنسی آئی کہ اسے اپنا  
گوگھٹ کھینچ کر..... نیچے کرنا پڑا اور شرمانے کی  
ادا کاری کرتے ہوئے سر کو جھکانا پڑا۔ نئی نومی بہو،  
ساس پر ہنسنے کی تو پھر ساس اس کی اچھی خبر لے گی۔  
خالہ نے چونک کر تخت کی طرف دیکھا۔ وہ  
عروسہ کی ہنسی سن چکی تھیں۔ ان کی اپنی ہنسی ایک دم  
سے اڑن چھو ہو گئی۔ انہیں چپ سی لگ گئی۔ اسی دم  
ثریا نے ڈھولک پر تھاپ دی اور.....  
”مہندی سے لکھ دو ری! ہاتھوں پہ سکھیوں  
میرے سنوریا کا نام“

کی تان اٹھائی۔ لڑکیاں بالیاں سب ہی گیت  
میں شامل ہو گئیں۔ محفل کی رونق دوبالا ہو گئی۔ خالہ  
بھی جھوم جھوم کر گانے لگیں۔

☆☆☆

صبح صبح رابعہ اور ثریا سب کو چائے دے رہی  
تھیں کہ نفیسہ اپنی جیٹھائی کے ساتھ پُر تکلف ناشتہ  
لے کر پہنچ گئیں۔

”سلام خالہ،“ نفیسہ نے خالہ کو گلے لگایا۔  
”بعلیے..... کم.....“ خالہ کی زبان ولیم پر تل





کھا گئی تھی، انہوں نے سلام کو درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

”سلام لڈن ماموں۔“ نفیسہ نے ماموں کے آگے سر جھکا دیا۔

”جیتی رہو۔ جیتی رہو۔ بچی کی شادی مبارک ہو۔“ ماموں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”شکر یہ ماموں! بڑی خوش ہوئی آپ کے شادی میں شمولیت کی۔“ نفیسہ نے ماموں کے پاس ہی بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ ثریا اور رابعہ ناشتہ سنبھالنے چل دیں۔

”ارے ہم کو تو جیسے ہی نیوٹا ملا چل پڑے کہ بچوں کی شادی کے موقع پر سب ہی رشتہ داروں سے ملنا ملنا ہو جائے گا۔ وہ تو کھو میری لیٹ ہو گئی ورنہ ہم سویرے ہی پہنچ جاتے۔“ لڈن ماموں نے جواب دیا۔

”ہاں بھیا لڈن تمہارا آنا تو سہاگے پر سونا ہو گیا۔“ خالہ کیوں چپ رہیں۔

”ہاں ماموں! واقعی سہاگے پر سونا ہی ہو گیا آپ کا آنا۔“ چھوٹی ممانی کی لمبی زبان والی بہو نے ٹھٹھا لگا کر دہرایا۔

”ناشتہ تم نے نفیسہ کا تکلف کیوں کیا۔“ خالہ نے نفیسہ کو محبت سے کہا۔ سب کب تک ضبط کرتے، چھوٹ گئے قہقہے۔

”ان کا مطلب تم نے ناشتہ کا تکلف کیوں کیا نفیسہ۔“ لمبی زبان والی بہو نے فقرہ درست کیا۔

”ارے خالہ تکلف کیسا؟ یہ رواج تو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔“ نفیسہ لمبی داب کر بولیں۔ بہو کا درست کیا فقرہ نظر انداز کیا۔

”اب کون ان رسموں رواجوں کو مانتا ہے۔“ مومے سب نئے فیشنوں میں پڑ گئے ہیں۔ پرانے رواج تو سب چھٹ چھٹا گئے۔“ چھوٹی ممانی نے بھی لمبی کی بوچھاڑ میں گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہم تو بھی ابھی بھی پرانے ہیں۔ پرانے رواجوں کو مانتے ہیں۔“ اپنے پاندان کو ٹٹولتے

ہوئے آپا بولیں۔

”اے میرے دل کی بات کہہ دی آپا نے۔“ خالہ مسکرا کر بولیں۔

”ارے کوئی دلہن دو لے کر خبر بھی لاؤ۔“ بڑی ممانی کو بروقت یاد آیا۔

”کہاں سے۔۔۔۔۔ جیو نیوز چینل سے یا پھر سٹری فورٹی ٹو سے؟“ لمبی زبان والی بہو باز آنے والی نہیں تھی۔

”بھابھی! رابعہ تیار کر رہی ہے عروسہ کو۔“ ثریا نے بتایا۔

”صبح سے تیار ہی ہو رہی ہے، کب تک تیار ہوگی۔“ خالہ کو شاید بہو یاد آ رہی تھی۔

”آگئی آپ کی بہو تیار ہو کر اماں!“ عاقب نے اندر داخل ہوتے ہوئے چپک کر کہا۔ عروسہ بھی ساتھ ہی شرمائی لچائی سی تھی۔

”السلام علیکم۔“ دونوں نے بیک وقت جھک کر سلام کیا۔ خالہ نے فوراً اٹھ کر بہو کو پیار کیا اور کرسی پر لا بٹھایا۔

”ممنے نے فوراً عاقب کے لیے کرسی لا کر بھابھی کے ساتھ رکھ دی۔ بچیوں نے جھٹ پٹ ناشتہ لگا دیا۔ لمبی مذاق کرتے ہوئے سب ناشتہ کرنے لگے۔

☆☆☆

دوپہر میں رابعہ عروسہ کو پار لے گئی۔ جامنی جوڑے میں غضب کا نکھار آیا تھا عروسہ پر۔ عاقب بھی سیاہ سوٹ میں بیٹھ رہا تھا۔ ویسے کی روٹن اپنے عروج پر تھی۔ خالہ بھی آسانی بناری ساڑھی پہنے ادھر ادھر مہمانوں سے مل کر آداب مہمانی ادا کر رہی تھیں۔

سب ہی ان سے عروسہ کی خوبصورتی کا ذکر کر رہے تھے۔ سب کی زبانوں پر چاند سورج کی جوڑی کا تذکرہ تھا۔ خالہ کہیں نہ پھوٹے ساتیں۔ تصویریں بن رہی تھیں۔ بار بار آج سے خالہ کے نام کی پکار پڑی اور وہ چل دیتیں۔

”اے میرے بھولے بھولے لگ رہے ہیں دونوں۔ ماشاء اللہ۔“ خالہ نے سوا کئی بار وار کر رکھا

ہوا نوٹ نکال کر وار تو نوی جیج بڑا۔

”امی! خدا کے لیے اب یہ کسی کو دے دیں اور وار نے کو نیا نوٹ نکالیں۔“

”ارے بچے تم کیا جانو ہمارے بڑوں کے طریقے۔ ہمارے بڑے ایک ہی وار سے نوٹے تھے۔“

چھوٹی خالہ کی بہو کا قبضہ اپنے قد سے کئی فٹ اونچا تھا۔ بڑی ممانی نوٹ وار نے آگے بڑھیں تو وہ اونچی آواز میں بولی۔

”آپ بھی ایک ہی وار سے نوٹ دیں بلکہ ایک ہی وار سے ”لوٹ“ لیں۔ سب لوٹ لیں بھئی۔“

خالہ کو اس کی بدتمیزی بہت کھلی۔ اس کی دیکھا دیکھی رابعہ اور بڑی ممانی کی دونوں بہوویں بھی شامل ہو گئیں اور لگیں خالہ کی زبان پکڑنے۔ ادھر مردانے میں سننے اور نوی نے لڈن ماموں کے الٹ پھیر پر کمر باندھی ہوئی تھی۔ مجال تھا کہ کوئی لفظ ان کی گرفت سے چوک جائے۔ وہ ایک دعوت کا حال بیان کرتے ہوئے جوش میں یوں بولے،

”کیا لذت پائے کے بکرے پکائے تمہاری ممانی نے کہ لفظ (لطف) آگیا۔“

”کیا ممانی کے پائے؟“ نوی نے ہانک لگائی جو سی نہیں گئی۔

”اور سیلا کی ڈال کر کسر بنا دیا۔ ارے سب نے انگلیاں چاٹ لی تھیں۔“

ماموں کے اس بیان نے سب کو ہنسا کر بیٹھ میں مل ڈال دیے تھے۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی بچہ آہستہ سے ”سیلا کیب“ کھانے کی فرمائش کر دیتا اور حاضرین پیٹ پکڑ پکڑ کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

غیر لوگ جا چکے تھے اب اپنے ہی رشتہ دار تھے تو سب ہی خواتین کے حصے میں چلے آئے۔ فیملی پیکرز اتاری جانے لگیں۔ ماموں اور خالہ سے بار بار کچھ نہ کچھ پوچھا جاتا، ذرا سے لفظوں کا ہیر پھیر ہو جاتا تو مغل زعفران ہو جاتی۔ بچے تو وہ قبضہ لگاتے کہ

بڑے کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔

☆☆☆

چوتھی کی رسم کے بعد عروسہ گھر آ چکی تھی۔ آج سب مہمان سوائے ثریا اور لڈن ماموں کے واپس جا رہے تھے۔ رابعہ دانی اور آپا نے بھی رخصت ہونے کی تیاری کر لی تھی لیکن ان کو سننے اور نوی نے بااصرار روک لیا کہ انہوں نے اسی شہر میں تو جانا تھا۔ رابعہ کا دل تو پہلے ہی ادھر کی رونقوں میں اٹکا ہوا تھا۔ فوراً رکنے کے لیے مان گئی۔ بھلا آپا اور دانی کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ مٹھائی کے ٹوکے رابعہ اور عاقب نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے اس لیے مہمانوں کو بھرپور حصہ مل رہا تھا۔ خالہ لاکھ بڑ بڑھوس مگر عاقب نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ دونوں ممانیوں، ان کی بہوویں، بڑی خالہ اور دوسرے سب رشتہ داروں کو بڑے بڑے پیکیٹوں میں مٹھائی ڈال کر دی تھی۔ جوتا چھپائی اور دودھ پلائی کی رسموں سے وصول ہونے والی رقم رابعہ نے ایمان داری سے سب بہنوں اور بھابیوں اور سالیوں میں برابر بانٹ دی تھی۔ دونوں موقعوں پر عاقب نے سات سات ہزار دے کر خالہ کے بجٹ کو ہمینوں کے لیے الٹ دیا تھا۔ رات سب مہمانوں کے جانے کے بعد مٹھا اور نوی سامان سیٹ کروا رہے تھے۔ خالہ شام کی چائے بنا رہی تھی، جبکہ رابعہ ہنڈیا بھون رہی تھی۔ چنانچہ باورچی خانے سے ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔

”ارے منے اسب بستر کی چادریں نیکیہ غلاف چھوٹی بیٹی میں رکھو ادو۔“

”بیٹی میں؟“

”کیوں اونچا سننے لگے ہو۔“

”نہیں وہ سوچا، یہ نہ ہو آپ کہنا کچھ اور چاہتی ہوں اور منہ سے نکل کچھ اور گیا ہو۔“

”اور سب رخصت گدائیاں بڑی بیٹی میں رکھو۔“

رخصت گدائیاں سننا تھا کہ ڈھیر سے بستر سر پر



لاوے ہوئے اوپر پٹی کی طرف جاتے نوی کی ایسی ہنسی چھوٹی کہ سب بستر سر پر سے نیچے گر گئے اور وہ خود ہنستا ہوا ان پر اوندھ گیا۔ تخت پر بیٹھی عروسہ بھی منے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تہقہہ لگا اٹھی۔ خالہ نے چائے تخت کی قریب رکھ کر زاناک پر انگلی دھر کے حیرت سے بھونپک کی طرف دیکھا۔ جواب ہنسی دبا کر جلدی سے چائے بنانے کو آگے بڑھ آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے چائے بنا کر خالہ کو دی۔

”لیجئے خالہ آپ کی تیز میٹھے والی چائے اور یہ آپ کے پسندیدہ گلاب جاسن۔“

عروسہ نے سمجھ دار بھوکے طرح نفیس سی پلیٹ میں گلاب جاسن اور چچ رکھ کر خالہ کے ہاتھ میں پکڑائی۔ خالہ تو داری صدمے ہو گئیں۔ عروسہ کے ہنسنے سے جودل میں میل آیا تھا ہوا ہو گیا۔ جلدی سے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

”پوتوں نہاؤ دو دھو ہوں پھلو۔“

بھلا جذبات کی شدت ہوتی اور محاورہ نہ لگتا۔۔۔۔۔ یہ ناممکن تھا۔ سب ہی دیر تک ہنستے رہے۔ عروسہ نے سب کو چائے بنا کر دی اور سب چائے کا کپ پکڑ پکڑ کر کہتے رہے۔ ”پوتوں نہاؤ۔۔۔۔۔ دو دھو پھلو۔“

نوی نے تو یہ تک کہہ دیا ”پوتو نہاؤ، دو دھو پھلو اور ہماری جان بخش۔“

”بدتمیز۔ ماں کا مذاق اڑاتے ہو۔“ ماں نے بدتمیز اولاد کی خبر لی۔

نوی بھی سب سنوا کر آ گیا تھا۔ رابعہ نے بھی شام کے لیے ہنڈیا بنائی تھی۔ سواب راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ اب سب نے لڈن ماموں کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اصرار کرنے لگے کہ ان دنوں کے واقعات سنائیے جب آپ شیرے کے شکار کو جاتے تھے۔ ماموں کی تو دلی مراد برائی تھی۔ لیکن بظاہر انکار کرنے لگے۔

”سنائیے ناں لڈن ماموں۔۔۔۔۔“ عاقب نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

”ارے بیسیوں شکار کیے ہیں ہم نے لیکن ہماری عادت کہاں ہے شو بازی وغیرہ کی۔“ ماموں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اوپری دل سے انکار کیا اور نہ من تو ایسا تھا کہ ایسا نقشہ کچھو کہ جنگل سے شیر بھاگا پھرتا، جان بچاتا کھائی دے۔

”ساندواں لڈن! اپنے کتنی محبت سے اصرار کر رہے ہیں۔“ خالہ کے کہتے ہی لڈن ماموں نے تین چار مرتبہ گلا کھٹکھا کر یوں صاف کیا جیسے مائیک کو ٹھوک بجا کر سیٹ کیا جاتا ہے۔

”ہاں تو یہ واقعہ جب کا ہے جب ہم نواب آف ڈھولپور کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔ ہم ان کی شکار کی ٹیم کے گمران اعلیٰ تھے۔ ڈھولک پور کے ساتھ ساتھ گھنا جنگل تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ شکار کے شیر کا پروگرام بن گیا۔“

منہ بند کر کے ہنسنے پر بھی کھی کھی کی آوازیں سب طرف سے آئیں۔ اس سے پہلے کہ ماموں کا منہ بننا، عاقب اور نوی نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

”ماموں آپ بولتے رہیں۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا۔“

”ہاں تو سب سامان چپوں پر لا کر ہم جنگل کو چلے۔ توشہ دان لذیذ کھانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ شکار کے چارے کے لیے بکریاں تھیں۔ چچان باندھنے کا سامان، خیمے لگانے کا سامان۔ سب سامان چار پانچ چپوں میں لدا تھا۔ ہم نواب صاحب کے علاوہ بیس چچیں لوگ تھے۔ ایک جبب میں ہم اور نواب صاحب تھے۔ پر لفظ گفتگو جاری تھی۔ (خالہ کے گھورنے پر سب نے اپنی اپنی ہنسی داب لی۔۔۔۔۔ پر لفظ پر) ہم باتوں میں اس قدر مشغول (مشغول) تھے کہ جنگل کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ جب رکی تو ہم نے دیکھا کہ ہم بیچ جنگل میں پہنچ چکے تھے۔ نوکروں نے دیکھ داکھ کے پہلے ہی مناسب جگہ طے کر رکھی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی کر سیاں نکال کر ہمیں بیٹھنے کے لیے دیں اور خود خیمے نصب کرنے لگے۔ خیمے نصب کرنے تک شام کا

جھٹ پٹا پھیل گیا تھا۔ نوکروں نے لذیذ حلوے کے ساتھ چائے پیش کر دی۔ چائے پینے کے بعد دو چائیں باندھ دی گئیں۔ اب جو ہے اندھرا گہرا ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ ہم اور نواب صاحب ایک چچان پر اور دوسری چچان پر تین اور بندوق بردار چڑھ کر بیٹھ گئے۔ مناسب فاصلے پر موجود بکری کے ساتھ درخت کو باندھ دیا گیا۔“

”یعنی شیر کا چارہ۔۔۔۔۔ بکری۔۔۔۔۔ تو آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

(اب کہ کسی کا تہقہہ رک نہ سکا۔ یہاں تک کہ خالہ بھی ہنس پڑیں)

”جب کر کے سنو گے یا نہیں۔“ وہ برامان رہے تھے لیکن کہانی پوری سنانا چاہتے تھے۔

”ارے لڈن! اب بچوں کے ہنسنے کی چھوڑو۔۔۔۔۔ تم قصہ کہو۔“ غنیمت ماموں نے قصہ بڑھایا۔

”نوکروں نے دخت پر بالٹیاں، ٹین اور کنستری بجانے شروع کر دیئے تاکہ شکار کو گھیرا جاسکے۔ قسمت ہماری ایسی اچھی تھی کہ ہمارا شکار اسی روز ہماری طرف آ نکلا۔ کیا ہی عمدہ اور تند رست باگھ تھا۔ بکری خوف سے منمنرائی تھی۔ ہمارے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ ہمارا پہلا شکار نہیں تھا۔ مگر سچ بات ہے ایسا نہ جانور دیکھ کر جو ہے وہ الگ ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ چاندنی میں باگھ کا قد بت نمایاں تھا۔ سنہری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نواب صاحب نے لمبی پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ادھر بکری نے باگھ کی طرف قدم بڑھائے۔ (ماموں کی آواز کے زیرِ دم میں محو کی کا دھیان غلطی کی طرف نہ گیا۔) ادھر نواب صاحب نے گھوڑا ادھایا۔ چشم زدن میں شعلہ نکلا اور باگھ کی پیشانی کے درمیان پیوست ہو گیا۔ نواب صاحب کے نشانے پر ہمارے منہ سے بے ساختہ واہ نکلا۔ ادھر نواب صاحب نے گولی چلائی ادھر دوسری چچان سے بندوق برداروں نے گولیاں چلا دیں جو جانور کا سینہ چیرتی ہوئیں باہر نکل گئیں۔ باگھ کی

دھانڑوں سے ہمارے دل کانپ اٹھے۔

”اترو۔۔۔۔۔“ نواب صاحب بولے۔ جانور ابھی تڑپ رہا تھا۔ نواب صاحب کے کہنے پر ہم اتر کر درخت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ نہ جانور تھا ابھی تک غرار ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی آواز میں وہ دم خم نہیں تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن بھیا ہماری تو اس کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ اس سے پہلے ہم نے دسیوں شیر مارے تھے۔ نواب صاحب نے آگے بڑھ کر بندوق سے ہلایا جلا یا غمروہ مرچکا تھا۔ نواب صاحب نے نارنج روشن کر دی تو نوکروں نے اتنی مشعلیں روشن کر دیں کہ مانو دن نکل آیا ہو۔ ہم سب نے باگھ کی گردن پر پیر رکھ کر تالیاں بجائیں۔ توشہ دان کھل گئے۔ لذیذ خوشبودار کھانے گرم کر کے دسترخوان لگایا گیا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور خیموں میں بڑ کر سو گئے۔ تین چار نوکر باگھ کا پہرہ دیتے رہے۔ صبح باگھ کو لا کر ڈھولک پور جا پہنچے۔ وہاں ایسا شان دار جشن منایا گیا کہ لوگوں نے انگلیوں تلے دانت داب لیے۔

سب نے ہاتھوں میں منہ داب کر اپنے تہقہے دبانے چاہے لیکن تہقہے بے اختیار پنجپوں کی طرح جہڑوں کے پتھرے سے آزاد ہوتے گئے اور درو دیوار سے لرزنے، جھومنے لگے۔ بچے تو تالیاں تک بجا رہے تھے۔

”کیا باگھ گھڑا ہے ماموں۔ کیا باغ باغ کیا ہے۔۔۔۔۔“

نوی کا ہنس ہنس کر پیٹ میں درد ہو چکا تھا۔ یہی حال باقی سب کا تھا۔ شادی کے گھر کی روٹی دو بالا ہو چکی تھی۔





”امی! میرے خیال میں چار منزلہ بالکل ٹھیک لاٹری وغیرہ کھلی ہے آپ لوگوں کی؟“  
اسد الدین کی آواز میں گھٹ سے اندر آتے سمجھ کے کانوں میں بڑی تواسے لگا کر اس نے کچھ غلط سنا ہے۔  
”نہیں خالہ امی! ہماری بات مان لیجیے۔ دو منزلہ ہی بہتر ہے۔ نیچے، اوپر دونوں حصے برابر ہو جائیں۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“  
یہ مہ پارہ کی آواز تھی۔  
اب تو مغالطے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔  
”یالہ! یہ کہاں کنسرشن شروع ہونے والی ہے۔“  
سبح سوچتا، غور و فکر کرتا، دو چار قدم مزید آگے بڑھا۔  
اسد الدین، مہ پارہ اور نین تارا تینوں نے دادی کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
جیران ہو کر اس کی غیر متعلقہ سی بات سنی۔  
”تجھ سے کس نے کہا؟“ رضیہ سلطانہ نے سوال کے جواب میں انہیں اس سے سوال کر دیا۔  
”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“  
وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر حاضرین کے تاہد تو زحمتوں نے اسے کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔  
”اچھا، کس سے سنا۔۔۔۔۔؟ کتنا انعام نکلا۔۔۔۔۔؟“  
کون سی والی لاٹری کھلی ہے؟“ مہ پارہ، اسد الدین

(فتین نعیم)

## اکھیر کے عینے

”جب میں نے کہہ دیا، چھ منزل تو بس چھ منزل۔  
ہاں۔۔۔۔۔ اب اس بات پر کوئی بحث نہ کرے مجھ سے۔“  
نین تارا کی اس بات پر جہاں اس کے قدم زنجیر ہوئے، وہیں منہ بھی پورا کھل گیا۔  
”چھ منزل۔۔۔۔۔“ زیر لب دہرایا۔ اللہ اللہ پلازہ بننے لگا ہے کیا۔۔۔۔۔؟“  
نفل اس کے کردہ مزید کچھ دیر غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہتا۔ رضیہ سلطانہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔  
”لو، میرا کچھ بھی آ گیا۔“  
”آ جا سچ! میرے نیچے، ادھر آ۔ ان لوگوں نے تو مت ہی ماردی ہے میری۔ آ جا میرا بچہ۔ ذرا مشورہ تو دے مجھے۔“  
”بڑی امی! کیا میرے گھر سے جاتے ہی کوئی

اور نین تارا نے ایک ساتھ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔  
بے چارہ سمجھ تو ہو کھلا ہی گیا۔  
”بھئی، مجھے کیا پتا؟ میں تو خود آپ لوگوں سے پوچھ رہا ہوں۔“  
”لیکن، ابھی تو تم کہہ رہے تھے، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“ نین تارا بولیں تو باقی سب نے تائید میں سر ہلایا۔  
”بالکل۔ یہی تو کہا تھا اس نے۔“ مہ پارہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔  
”اوہو، بھئی۔۔۔۔۔ آپ لوگ مجھے بھی تو بولنے کا موقع دیں نا۔“ سمجھ جھنجھایا۔  
”ہاں، تو بول نا۔۔۔۔۔“ اب کے رضیہ سلطانہ بولیں۔  
”بڑی امی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اندر





داخل ہوتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ آپ لوگ کوئی پلازہ وغیرہ بنوانے کی بات کر رہے تھے۔ تو پلازہ بغیر پیسوں کے تو بننا نہیں ہے، تو مجھے یہی لگا کہ شاید آپ لوگوں کی کوئی لائری وغیرہ چلی ہے۔ تب ہی تو آپ یہ کنسرکشن وغیرہ کی باتیں کر رہے ہیں۔“

سمیع نے اطمینان سے انہی بات کی وضاحت کی مگر دوسری جانب سے انتہائی حیران کن رد عمل سامنے آیا۔ اسد الدین، مہ پارہ، نین تارا اور رضیہ سلطانہ، اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”بھابھی!“ نین تارا نے مہ پارہ کو مخاطب کیا۔

”یہ..... سمیع کے کان خراب ہو گئے ہیں یا دماغ؟“

”میرا خیال ہے دونوں۔“ جواب اسد الدین کی طرف سے آیا۔

”پھوپھو.....“ وہ نین تارا کو دیکھ کر احتجاجاً چلایا۔ ”کیوں کر رہی ہیں آپ ایسی باتیں؟“

”تو..... اور کیسی باتیں کریں؟ ہم نے تو کوئی بلازہ ولازہ بنانے کی کوئی بات قطعاً نہیں کی۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی بات اپنے کانوں سے سنی ہے تو شک تو جائے گا تا تمہارے کانوں پر یا پھر تمہارے دماغ پر۔“ نین تارا نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”ایسا کرو بیٹا! ذرا اپنی یادداشت کو دوبارہ  
کھنگالو۔ شاید کوئی سرال جائے۔“  
اسد الدین نے مفت مشورے سے نوازا اور  
باپ کے مشورے کے عین مطابق، اس نے اپنی  
یادداشت کو کھنگالنا شروع کیا۔

اس نے سر جھکایا، پھر اٹھایا۔  
حاضرین محفل کو مختصر نظروں سے اپنی جانب  
نکتا پا کر، اعتماد تھوڑا حیرتزل ہوتا محسوس ہوا۔ وہ  
الٹھیلوں سے سر کھمایا۔  
”اچھا جلیں، ٹھیک ہے۔ بان لیا آپ لوگوں  
نے پلازہ وغیرہ بنوانے کی بات نہیں کی۔ مگر آپ  
لوگ دو، چار اور چھ منزل کی بات تو کر رہے تھے نا۔“

بتاتے تو میں نے سوچا، بچی کی سالگرہ منایا لیتے ہیں۔“  
 رضیہ سلطانہ دھیمے دھیمے پوتے کو سمجھا رہی تھیں۔  
 ”بڑی امی! آپ کی یہ بچی سینتیس برس کی  
 ہو چکی ہے۔ غالباً یہ بات آپ بھول رہی ہیں مگر  
 خاندان والوں کو بہت اچھی طرح سے یاد ہوگی۔“  
 ”اوپھوں، سینتیس نہیں، چھتیس سال گیارہ ماہ  
 نہیں دن۔“ نین تارنے صحیح ضروری تھی۔  
 ”ایک ہی بات ہے پھوپھو۔“ سمجھنے سے منہ بنایا۔  
 ”وہی ہے تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟“ مہ پارہ  
 کو بیٹے کا ناک بھول چڑھانا ایک آنکھ نہیں بھابھاتا۔  
 ”مطلب..... کہ..... آپ لوگوں کو اس سب  
 میں اعتراض والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی۔“ سمجھ  
 بھانڈا کھانے والے لہانڈا ملے ہوا۔

کرنا چاہ رہی تھیں۔  
 ”بات کیا کرنی ہے مل بیٹھ کر۔ سب کچھ تو آپ  
 لوگ بالا ہی بالا طے کر لیتے ہیں۔ مجھے تو بس اطلاع  
 فراہم کر دی جانی ہے، جیسے ابھی کی جا رہی ہے۔“  
 ”ہم نے کون سی اطلاع تمہیں فراہم کی ہے۔  
 وہ تو ہم دروازے کی کنڈی لگانا بھول گئے۔“ مہ پارہ  
 بوسے لے لیں۔ ”اور تم نے اتفاقاً سب کچھ یاد رکھا۔“

جاتی اور اس پر پھوپھو چڑھ کر اپنے چھ منزلہ ایک کی عمارت زمین بوس کرتیں۔“

سمیع نے تصور کی آنکھ سے جو منظر کشی شروع کی تھی، وہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ مین تارا جوش سے کھڑی ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں اور پھر لوگ تالیاں بجاتے۔ گفٹ میرے حوالے کرتے۔ کپڑے، میک اپ کا سامان.....“

وہ دلی پر ہاتھ رکھے روشن دان کو تنکے اس منظر میں کھینچی ہیں کہ رضیہ سلطانہ کی آواز انہیں واپس لے کر آئی۔

”بھئی، یہ جو سیڑھی والی بات ہے نا۔ یہ مجھے کچھ پسند نہیں آئی۔“

”البتہ ان کا کھانا رخصت کر کے ایک منٹ

”کری بھی ٹھیک رہے گی۔“ مہ پارہ نے خیال  
تارابو لیں۔



پیش کیا۔

”اسی لیے تو میں کہہ رہا تھا، چار منزلہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ اسد الدین نے منظر میں انٹری ماری۔  
”ہاں ہاں، اسی وجہ سے تو میں بھی کہہ رہی تھی دو منزلہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ مہ پارہ نے رائے فوراً سے پیشتر تبدیل کی۔

(اف ابھی بیوی..... موقع مس نہ ہو جائے کوئی.....)

”ایک میرے علاوہ، اس گھر کا ہر بندہ بالکل ٹھیک بات کرتا ہے۔“

سمجھ کے انداز خطرناک ہوئے اور یہ انداز بگڑتے بگڑتے کیا بن جائیں گے، اس سے سب ہی خائف رہتے تھے دادی، مہی، پھوپھو بھی۔ ماں، باپ بھی۔

ایک تو اکٹو، اوپر سے بیٹا، پھر حد درجہ لاڈلا اور اس پر سب سے بڑی مصیبت..... بلا کا معاملہ فہم، ذہین اور سمجھ دار۔ سواس کے موڈ سے سب ڈرتے تھے مطلب موڈ کے بگڑنے سے۔

اور موڈ وہ تو اللہ اللہ..... بگڑا ہی رہتا تھا۔  
جلس، اس منظر کو کچھ دیر کے لیے یہیں چھوڑتے ہیں اور چلتے ہیں رضیہ سلطانہ کی دیورانی کی طرف.....

☆☆☆

کسی زمانے میں جب کہ انگریز نیا نیا برصغیر سے گیا تھا لیکن اپنا رعب داب یہیں پر چھوڑ گیا تھا۔ پرانے بازار کے نام سے مشہور ایک جگہ تھی، جہاں دبیر سنگھ کی پشیمک لگا کرتی تھی۔

یہ اونچی سی حویلی، بڑے بڑے چوہاروں والی۔ یہاں سے وہاں تک اور وہاں سے یہاں تک سارا شہر یہ اس کو دبیر سنگھ کی حویلی کے نام سے جانتا تھا۔

لاری والے کو شہر کے پرلے کنارے سے بتا دو، دبیر سنگھ کی حویلی جانا ہے۔ بغیر کسی اشارے یا مدد کے سیدھا حویلی کے سامنے لاری رکتی۔ جب بلوہ ہوا تو کچھ نہ کچھ آگ تو یہاں بھی بھڑکی۔ سودیر سنگھ تو اپنے بچے، خاندان، مال اسباب سمیت کہ ہندوستان

سی پر شکوہ حویلی آئی نوراموچی کے نصیب میں۔

ہندوستان میں جو تیاں گانٹھنے والے نوراموچی کو جب ایسی شان و شوکت والی حویلی نصیب ہوئی تو بس..... چند ماہ بعد ہی وہ بن گئے نورالدین سکندر۔

ہندوستان تار بجا کر ماں باپ اور چھوٹے بھائی کو بھی بلوا لیا۔ اب کیا تھا کہ جو تیاں گانٹھنا تو یوں بھی کچھ معیوب سا محسوس ہونے لگا کہ نورالدین سکندر اب جو تیاں سلائی کریں گے۔ تو یہ کسی اور کام کا تجربہ نہ تھا۔

سو بھاگ دوڑ کر کے حویلی کے کاغذ بنوا لیے۔ اس بھاگ دوڑ میں چھوٹے بھائی نے خوب جانفشانی سے حصہ لیا تو جب کاغذ بن کر آئے تو معلوم ہوا کہ یہ حویلی دونوں بھائیوں کے نام ہے۔ یعنی آدھا حصہ ہانونی طور پر نورالدین سکندر کا تھا اور باقی کا آدھا حصہ معین الدین حیدر کا۔ نورالدین تھلائے تو بہت پر کر کچھ نہ پائے۔

سو جب اور کچھ نہ کر پائے تو اپنے سے کئی برس چھوٹی رضیہ سلطانہ سے نکاح کر لیا۔ رضیہ سلطانہ اپنی ذات میں بے ضرری خاتون تھیں۔

دیور کے رشتے کی بات ہوئی تو اپنی خالہ زاد بہن کا رشتہ پیش کر دیا۔ شادی ہوگئی۔ مصیبت..... معین الدین کی دلہن بن کر آئیں۔

یہاں سے ہوا ایک نئے دور کا آغاز۔ مصیبت ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئیں۔ آتے ہی حویلی کے درمیان دیوار آٹھوا دی۔ پچھلے حصے کو الگ کر کے کرائے پر لگا دیا۔ کوئی دس مرلہ رہنے کے لیے چھوڑ باقی دکانوں کی صورت کرائے پر چڑھا دیا۔ بہن برسنے لگا معین الدین کے گھر پر۔

گور رضیہ، مصیبت کے جیسی سمجھ دار تو نہ تھیں پھر بھی دیکھا دیکھی ایک منزل انہوں نے بھی کرائے پر چڑھا دی۔ گھر کے پچھوڑے مارکیٹ بنا کر ایک دکان خود رکھی۔ کپڑے کا کام شروع کیا۔ باقی کرائے پر لگا دیں۔ مالی آسودگی نے بے فکری میں اضافہ کیا۔ رضیہ سلطانہ اور نورالدین کے دو بچے ہوئے۔

اسد الدین اور معین تارا۔

مصیبت اور معین، الدین، ان اولاد کی نعمت سے محروم

رہے۔ ایک بچی گود لے کر پال لی۔ شاہدہ..... شاہدہ معین الدین۔ نور الدین نے دکان پر ایک قابل اعتبار ملازم رکھا امین بلال۔ اچھا، سلجھا ہوا انسان تھا۔ کئی برس ان کے ساتھ گزارے۔

نورالدین نے رضیہ سلطانہ کے کان میں بات ڈال دی کہ میں تارا کے لیے امین بلال مناسب رہے گا۔ پیغام کسی ذریعے سے امین بلال کو بھی پہنچا دیا گیا۔ اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

یہاں پر کہانی نے اچانک ہی مختلف ٹرن لیا۔ نورالدین دکان پر بیٹھے بیٹھے گرے اور پھر بھی نہ اٹھ سکے۔ اچانک موت۔ رضیہ سلطانہ غم زدہ حیران پریشان۔ اسد الدین نے معاملات سنبھال لیے اور سنبھالے بھی خاصی سمجھ داری سے۔ گو چالاکی اور تیز طراری اس کی فطرت نہ تھی۔ پھر بھی نظام بہتر سے بہتر بنی کی طرف چلا۔ تب ہی ایک دن معین الدین اور مصیبت چلے آئے۔ اسد الدین کو اپنی فرزندگی میں لینے۔ رضیہ، سیدی سادی ضرور تھیں، بے وقوف نہیں تھیں۔ اعتراض تو ان کو دیور، دیورانی کی چالاک اور مکار فطرت پر تھا۔ پر انکار کی وجہ انہوں نے شاہدہ کے لیے پالک ہونے کو بتایا۔ اس کے بعد جو اور مصیبت نے کیا، اس پر رضیہ ساری زندگی بلبلاتی ہی رہیں۔

ہوا کچھ یوں کہ امین بلال اور معین تارا کے نکاح کے دن تاریخ طے ہونے جا رہے تھے۔ جس دن بات چیت طے ہونا تھی، بالکل اچانک ہی ایک بم سب کے حواسوں پر گرا تھا۔

☆☆☆

”دیکھ قاتب! میں اس سے زیادہ تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ویری سوری۔“ مڈرنے صاف صاف بات کی۔

”سنا تھا، مصیبت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ آج دیکھ بھی لیا۔“ قاتب نے لہجہ کو آزر دہ بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔

”میں تیرا سایہ نہیں ہوں۔“ مڈر بالکل متاثر نہیں ہوا۔

”دیکھ چند دن اور..... اس کے بعد میں خود

دنیا بھر سے منتخب سیاری کتب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

اپریل 2019 کے شمارے کی ایک جھلک

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار ”سلطان محمد فاتح“ کے کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان

محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی کی ایک اور کڑی،

فسانہ عجائب

ایک شقی القلم شوہر کی کہانی جس نے اپنی اپنی بیوی پر رحم نہیں کیا، ایم الیاس کی سوچے پر مجبور کردینے والی تحریر،

قاتل چھترے

نرا وقت کہہ کر نہیں آتا، ایک نوجوان کی شکایت جو کل کی واردات کا شہنشاہ تھا،

صائمہ عروج کا نثر و اعجاز،

مراد عالی

انسان جو یہاں ہے اسے وہی لعل کا پتی ہے، جاوید راہی کے قلم سے تخلیق پانے والی یادگار کہانی،

یقین کیوں نہ ہوتا

ایک نیم چمچے ایک نمبے کی سین آٹھوں کی چھوٹی ہوئی محبت کی شاعریوں سے سحر کر دیا تھا،

صدف بنت راحت کے قلم کی روانی،

کاش کہ

ڈرلر کے دوران اپنے والدین سے بچنے کے لیے کے حساسات، سلیمان حبیب کے قلم کا چادر،

اس کے علاوہ دیس دیس کی رومینس، سسپنس اور ٹھیس سے بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اپریل 2019 کا نیا شمارہ آج ہی خیر ہو



یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ ثاقب نے لہجے میں حد درجہ لجاجت سمولی۔

”ایک دن بھی اور نہیں۔ کل امی، بابا واپس پہنچ رہے ہیں۔ تجھے آج ہی جانا ہوگا۔“

”مڈر! ایسا نہ کریا۔“

”دیکھ ثاقب! امی بابا کے علم میں بالکل بھی نہیں ہے کہ ان کے عمرے پر جاتے ہی میں نے تجھے یہاں رکھ لیا تھا۔ اب یہ نہ ہو کہ تجھے یہاں دیکھ کر وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں۔“

آہا پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ دونوں دوست مل کر کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لیں گے۔“ ثاقب نے مزہ لیا۔

”تو خود جا رہا ہے یا میں سامان اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کروں۔“ مڈر آرام سے گویا ہوا۔

”میں کہاں جاؤں گا؟“ ثاقب نے بے بسی سے پوچھا۔

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“ مڈر نے کندھے اچکائے۔

”میرے اتو ہے نا۔“ ثاقب کی پریشانی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

”تو نمٹ اپنے مسئلوں سے۔“

”کیسے نمٹوں؟“

”معافی مانگ لے، اپنے ماما، بابا سے۔“

”وہ تو میں مانگ ہی لوں جو وہ میرا فون اٹھالیں۔ کتنے دن سے، کتنے ہی نمبرز سے ٹرائی کر چکا ہوں۔ پر نہ ماما کال ریسیو کر رہی ہیں نہ بابا۔“ ثاقب نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

”ویسے تیرے جیسی نافرمان اور نالائق اولاد کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے ماں باپ کو۔“

”نالائق..... کیوں؟ پورے کالج میں ٹاپ کیا ہے میں نے۔“ اس نے فخر سے گردن اگڑائی۔

”ماں باپ کو دھوکا دیا ہے تو نے۔ وہ بے چارے مقلد سے ہوشل کے بل، خرچا، ہر طرح کی آسائش تیرے لیے مہیا کرتے رہے کہ بیٹا انجینئر بن رہا ہے اور بیٹے صاحب آخر میں فیشن ڈیزائننگ اینڈ بیجمنٹ کی ڈگری اٹھائے، ہاتھ لہراتے آئیں گے۔ لو

اماں ابا، تمہارا میک اپ بہت اچھا کر لوں گا میں۔ میں ہوتا نا ان کی جگہ تو اتنے جوتے لگا تا کہ تو ساری زندگی یاد رکھتا۔“

”ابھی بھی تو مجھے اتنے جوتے تو لگا ہی چکا ہے کہ میں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔“

”میں ان کی جگہ ہوتا تو کبھی تیری شکل نہ دیکھتا زندگی میں.....“

”وہ بھی یہی کہہ کر گئے ہیں۔“

”تو یہ ایسی نافرمان اور دھوکے باز اولاد۔ والدین آئے کہ ساری زندگی کی کمائی ہمارا اکوٹا لاؤ لاسپوٹ انجینئر بن گیا ہے اور بیٹے صاحب..... تو یہ تو یہ.....“

”تو انہوں نے بھی تو بدل لے لیا ہے پورا پورا۔ خرچا پانی بند کر دیا ہے۔ تمام رشتے داروں کو سب کر دیا ہے کہ کوئی اسے اپنے گھر کے اندر نہ گھسنے دے۔ میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا انجینئرنگ۔ اپنی مرضی کے مضامین پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ کیا اتنا ہی بڑا قصور تھا جس کی اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔“

”بیٹا! یہ جذباتی تقاریر کرنا اپنے اماں، ابا کے سامنے۔ ان کا دل موم ہوگا یہ باتیں سن کر۔ مجھ پر تیری ڈائلاگ بازی کوئی اثر نہیں کر رہی۔“

”وہ تو آئیں گے اب چھ ماہ بعد اور پتا نہیں آئیں گے بھی یا نہیں۔ ساری زندگی سے تو ہم باہر بیٹل ہیں۔ پڑھائی کے لیے میں ادھر آ گیا، ہاسٹل سیٹ رہا۔ گھر بار ہے نہیں۔ ماں باپ ناراض۔ خرچے پانی کی کوئی سہیل نہیں ہے، اب بتا کروں تو کیا کروں۔“ بس رونہیں پڑا بے چارہ۔

”ایسا کہ، وہ جو ماں باپ کو دھوکا دے کر ڈگری لی ہے نا.....“

”آگ لگا دوں اس کو۔“ ثاقب نے بات مکمل نہیں کرنے دی اس کو۔

”نہیں، فریم کروا کر، سینے سے لگا کر صبح شام چوما کر۔“

”کوئی ایسا مشورہ دے جو قابل عمل بھی ہو اور فائدہ مند بھی۔“

”ہوں.....“ مڈر نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر ثاقب کی ٹھوڑی پر رکھا۔ ”ایسا کر، خود کشی کر لے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ ثاقب نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

”اس سے تیری جان زندگی کے جھیلوں سے چھوٹ جائے گی۔“

”بار! میں سیریس ہوں۔“ ثاقب جھنجھلایا۔

”لیکن میں بہت نانی (شریر) ہوں۔“ مڈر مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا کروں؟“ ثاقب مڈر کو دیکھا اور پھر بے چارہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

امین بلال اور شاہدہ معین الدین کا نکاح ہو گیا۔ یہ خبر سب سے پہلے اسد الدین نے سنی اور تصدیق سے پہلے پہلے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی پھر بعد میں تصدیق بھی ہو گئی۔

جو لوگ مسجد میں نکاح میں شریک ہوئے تھے وہ فرد افراد آ کر اسد الدین کو اطلاع دے کر اپنا اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔

شام میں امین بلال بھی آ گیا۔

”مجھے معاف کر دینا، میں مجبور ہو گیا تھا۔“ بس اتنا کہہ کر چل بیٹا۔

یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ بے چارہ لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔

مین تارا سے شادی میں بھی کشش نہیں تھی کہ بتا دیا گھر ہے۔ آرام سے گھر داماد بن کر رہوں گا۔

معین الدین نے اس سے بھی زیادہ دل فریب تکنیک پیش کر دیا۔

شاہدہ سے نکاح کی صورت میں وہ گھر جو بچھواڑے کو انہوں نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔ وہ امین بلال کے نام کرنے کی پیشکش کی۔ بدلے میں شاہدہ کے حق مہر کی رقم مکان کی مارکیٹ ویلیو کے حساب سے پچیس لاکھ ملے ہوئی۔

مطلب اگر کبھی امین بلال کی نیت میں فتور آئے اور وہ شاہدہ کو چھوڑنے کی کوشش کرے تو اسے پچیس لاکھ نقد ادا کرنے ہوں گے۔ یوں سودا طے پا گیا۔ سودے بازی، رشتے داری میں بدل گئی۔

دونوں گھرانوں کے تعلقات پہلے بھی کچھ اچھے نہ تھے، اب مزید کشیدہ ہو گئے۔

رضیہ، اسد الدین کے لیے ماہ پارہ کو بیابہ لائیں۔ اسد اور ماہ پارہ کو اللہ نے ایک ہی بیٹا دیا۔ سبج الدین۔ حسن اتفاق شاہدہ اور امین کو بھی اللہ نے ایک ہی بیٹی دی۔ مسفرہ..... مسفرہ امین۔ دونوں گھرانوں کے خیالات جدا، زندگی کا نظریہ جدا، گھر جدا جدا۔

پرایک چیز سماجی رہ گئی چھت..... اسی چھت پر، بھاگتے دوڑتے، کھیلنے کودتے۔ اپنے بڑوں کی لڑائیوں، رجسٹروں سے بے نیاز، دونوں کا بچپن گزرا۔ گزر بھی گیا۔

پتا ہی نہیں چلا۔ چپ چاپ، جوانی آئی۔ دبے قدموں، ہائل خاموشی سے۔

اور پھر پتا دونوں کو ہی نہیں چلا کہ وہ کب ایک دوسرے کے اسیر ہوئے۔ کب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوئے۔ وہ مسفرہ امین تھی اور اس کے بعد مسفرہ سبج ہو جائے گی۔

اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی پر وہ مسفرہ امین سے مسفرہ سبج کیسے ہو پائے گی۔ اس پریشانی نے آج کل سبج کی نیندیں اڑائی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”سبج! میرے بچے، مجھے بتا۔ ہم نے آج تک تجھے اعتماد میں لیے بغیر کوئی قدم اٹھایا ہے۔“

بڑی امی سبج کو پکارتی تھیں۔

”بڑی امی! آپ مجھے بتائیں۔ آپ لوگوں نے کبھی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتایا ہے۔“

سبج کے سوال پر سب بظنیں جھانکنے لگے۔

”ہمیشہ سب کچھ طے کرنے کے بعد مجھے بتایا جاتا ہے۔ آج بھی جو اتفاقاً دروازہ کھلا نہ رہا جاتا.....“

”ہزار بار تمہیں کہا ہے، دروازے کی کنڈی



چیک کرتی رہا کرو۔“ اسد الدین مہ پاره پر برسے۔  
”بس غلطی ہوئی۔“

”ہاں جی۔ غلطی ہوئی، ورنہ ایک آجاتا۔ تب بھی مجھے نہ بتایا جاتا۔“ وہ بھڑک اٹھا۔

”نہیں نہیں، تب تو بتائی دیتے۔“ نین تارا بولیں۔  
”ہاں تو اور کیا؟ تب کیسے چھپا سکتے تھے۔“ مہ

پارہ بولیں۔  
”آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ یہ ساگرہ والا آئیڈیا تھا کس کا آخر؟“

”نین کا۔۔۔۔۔“ اسد الدین نے اشارہ کیا۔  
”امی کا۔۔۔۔۔“ نین کی انگلی رضیہ کی جانب اٹھی۔

”مہ پاره کا۔“ رضیہ سلطانہ بہو کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

”ان کا۔۔۔۔۔“ مہ پاره کی انگلی میاں کی جانب اٹھی۔  
”سمجھنے نے سر پکڑ کر ان چاروں کو دیکھا جن کی

انگلیاں ایک دوسرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔  
”آخر ضرورت کیا پیش آئی تھی۔“ اس کا

داغ ابھی تک اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔  
”بتایا تو ہے، لوگوں کو انکھا کرنے کا بہانا۔“ مہ

پارہ بولیں۔  
”امی۔۔۔۔۔“ مہ پاره خاصا زور دے کر بولا۔ ”میں

پوچھ رہا ہوں، ساگرہ ہی کیوں۔“ میلا، قرآنی خوانی۔  
”کچھ اور بھی تو کروایا جاسکتا تھا۔“

”ہاں، ہاں۔۔۔۔۔“ پہلے میلا ہی کا سوچا تھا۔ ”مہ پارہ جلدی سے بولیں۔

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ جواب کا منتظر تھا۔  
”پھر۔۔۔۔۔“ مہ پاره نے میاں کو دیکھا۔

”پھر۔۔۔۔۔“ اسد الدین نے ماں کو دیکھا۔  
”رضیہ نے نین کو دیکھا اور نین بولیں۔

”پھر ہم نے اکڑ بکڑ کیا تھا۔“  
”اوہ میرے خدا! آخر ہم کب اس اکڑ بکڑ کا

چھپچھا چھوڑ دیں گے۔“  
”کبھی نہیں۔“ بیک وقت وہ چاروں بولے۔  
☆☆☆

”یہ لے، سمجھ سے بات کر۔“ مڈرنے کال ملا کر

کرنٹا قب کو پکڑا یا موبائل۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ سمجھ۔“

”کیسا ہے شہزادے؟“  
”اچھا سن، بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں

میں۔“ ثاقب نے مدعا بیان کرنا شروع کیا۔  
جب تک وہ بات کرتا رہا۔ مڈرنے اس کے

تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر دس پندرہ منٹ بعد اس نے سمجھ سے مدعا سلام کر کے موبائل مڈرن کو واپس کیا۔

”کیا بتا؟“  
مڈرن سوالیہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”یار! وہ بٹوارا چوک کے پاس جو بچوں کا پارک ہے، وہاں بلا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے، سامان لے کر

آ جا۔ کرتا ہوں کچھ بندوبست۔“  
”ویسے بہت بہتر ہوگا اگر تو اپنے والدین کو

منانے میں کامیاب ہو جائے۔“  
”جی، مان بھی ضرور جائیں گے جو میرا فون

اٹھالیں تو۔۔۔۔۔“  
”چل، میں دعا کروں گا تیرے لیے۔“

مڈرن نے خلوص دل و خلوص نیت سے کہا۔  
☆☆☆

وہ دونوں ایک سنگی بیٹھ پانی کے تالاب میں تیرتی تھیں دیکھ رہے تھے۔

”یار! بات یہ ہے کہ دو چار دن کی بات اور ہے، پر ایسے مستقل طور پر۔۔۔۔۔ مشکل ہو جائے گا۔“

”یہ بات بتانے کے لیے تو نے مجھے مڈرن کے گھر سے یہاں بلوایا ہے۔ تجھ سے تو وہ بہتر ہے۔

جس کے گھر میں جھگڑے ہیں دن سے رہ رہا تھا۔“  
ثاقب کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا۔

”بات تو پوری کر لے۔“ سمجھ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔  
”نا۔۔۔۔۔“ اس نے سر اٹھایا۔

”یعنی تیرے چھوٹے بہن بھائی وغیرہ۔ ان کی بات کر رہا ہے۔“

”نہیں۔ میری دادی، امی، ابو اور چھو پھو۔ بس یہی پانچ افراد ہیں ہم گھر میں۔ میرے گھر والوں کی

زندگی کے آدھے معاملات اکڑ بکڑ پر طے پاتے ہیں۔“

”اکڑ بکڑ۔“  
”کیا مطلب؟“ ثاقب حیران ہوا۔

”مطلب میں سمجھانا ہوں۔“ سمجھ بیٹھ کے ذرا کنارے کی طرف کھڑا۔ درمیان میں کچھ خالی جگہ

بن گئی۔  
”چل اب اپنا بابا یاں ہاتھ پھیلا کر یہاں رکھ لے۔ ایسے۔۔۔۔۔“

اس نے اپنا ہاتھ بیٹھ پر ایسے پھیلا کر لکھا کہ ہتھیلی بیچ والی طرف تھی اور ہاتھ کی پشت اوپر کی طرف۔

ثاقب نے کچھ حیران ہو کر اس کی تقلید کی۔  
”اچھا، تو ہمارا مسئلہ یہ ہے۔“ سمجھ نے بولنا

شروع کیا۔  
”اوں۔ ہمارا نہیں میرا۔“ ثاقب نے ٹوکا۔

”ایک ہی بات ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اتنے دن تک تیری رہائش کا بندوبست کر دوں۔ جب تک

تو کمانے کے لائق نہیں ہو جاتا۔“  
”یار! کمانے کے لائق تو میں ابھی بھی ہوں۔

ایسے بول کہ جب تک مجھے نوکری نہیں مل جاتی۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔“ وہی اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ زیادہ

سے زیادہ نین، چارون مجھے مہمان ٹھہرا سکتا ہوں۔“  
”ہوں۔۔۔۔۔“ ثاقب نے گردن ہلائی۔

”اب میں اکڑ بکڑ کروں گا۔ تو اگر تو آخری بول تیرے ہاتھ کی کسی انگلی پر ختم ہوئے تو ہم وہ کرنے کے

پابند ہوں گے جو تو چاہتا ہے اور اگر بول میرے ہاتھ کی کسی انگلی پر ختم ہوئے تو ہم وہ کرنے کے پابند ہوں

کے جو میں چاہتا ہوں۔ آگئی سمجھ میں بات۔“  
”ہوں، آگئی۔“ ثاقب نے سر ہلایا۔

”شروع کریں پھر۔“ سمجھ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہوں۔“  
کالے اور سفید امتزاج کے سنگ مرمر کے بیٹھ

بیٹھے وہ دونوں جوان، اپنے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیلائے ہوئے تھے۔ سمجھ نے دائیں ہاتھ کی

شہادت کی انگلی، ثاقب کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر رکھی اور بولنا شروع کیا۔

”اکڑ بکڑ ہو، جیسے اتنی نوے، پورے سو۔ سو سے نکلا دھاگا، چور نکل کی بھاگا۔۔۔۔۔“

وہ بولتا جا رہا تھا اور ہز بول کے ساتھ اپنی انگلی اٹھا کر باری باری اپنی اور ثاقب کی انگلیوں کو ٹچ کرتا

جا رہا تھا۔  
”اچھا کھانا کھائیں گے۔“ صاب بن کر

آئیں گے۔۔۔۔۔ ریل بولی چھکا چھک۔۔۔۔۔ صاب بولا ویری گڈ۔۔۔۔۔ ڈیل روٹی بسکٹ۔۔۔۔۔

اختتام سمجھ کے ہاتھ کی درمیانی والی انگلی پر ہوا۔  
ثاقب نے مایوس ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تو زیادہ سے زیادہ تین چار دن میری میزبانی کر سکتا ہے۔“

”نہیں، یہ تو ٹرائل تھا۔ ڈیل ہونا تو ابھی باقی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ثاقب نے نا سمجھی سے اس کی شکل دیکھی۔

”دیکھو۔ میں تو بچپن سے اپنے گھر کے کم دیش تمام چھوٹے بڑے معاملات اسی اکڑ بکڑ پر ہوتے

دیکھ رہا ہوں۔“  
”مثلاً۔۔۔۔۔“ ثاقب کو خاصی دلچسپی محسوس

ہوئی۔  
”مثلاً یہ کہ کسی کام کے معاملے میں اگر فیصلہ

کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہ امی کریں گی یا چھو پھو تو اس کام کا فیصلہ اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ کہیں جانے کے سلسلے میں

اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو کس جگہ جانا چاہیے اس کا فیصلہ بھی اکڑ بکڑ کرتا ہے۔ میری چھو پھو کے لیے آئے



ہوئے اکثر رشتوں میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کوئی بات کسی کو پسند نہیں آ رہی۔ کبھی کوئی..... تو ایسے میں.....

”تو ایسے میں بھی اکثر بکوں کے ذریعے ہی فیصلہ ہوتا تھا۔“ ثاقب نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ ”بالکل.....“ سمجھنے لگا۔

”یہاں تک کہ میرے نوکری یا کاروبار کرنے کے معاملے پر بھی اختلاف رائے ہو گیا تھا۔“ ”تو اس کا فیصلہ بھی اکثر بکوں کے ذریعے ہوا تھا۔“ ثاقب جس قدر اونچی آواز میں چیخ سکتا تھا، چیخ کر بولا۔

”سمجھنے لگا۔“ ثاقب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یار! کون لوگ ہوتے ہیں؟“ ثاقب اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

”بس کچھ ایسے ہی بچکانہ طریقے سے چلتے ہیں ہمارے معاملات۔“ ”تو یہ جو تیری نوکری اور کاروباری والے معاملات میں اختلاف تھا، یہ کن کن کے درمیان تھا؟“

ثاقب اپنا مسئلہ بھول بھال، سمجھنے کے معاملات دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”گپیں کر.....“ سمجھنے لگا۔ ”سمجھنے لگا۔“

سوچنے کا موقع فراہم کیا۔ ”ہوں..... پتا لگ گیا۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

”سمجھنے لگا۔“ ثاقب نے ہر دو اٹھائی گویا کہہ رہا ہو..... کیا.....؟“

”تیری امی اور دادی میں ٹھن گئی ہوگی۔“ ”بالکل بھی نہیں۔ میری امی انتہا سے زیادہ

سسرالی ہو ہیں۔ ساس کی بات ان کے لیے حرف آخر۔ نند کا حکم، سینے پر تحریر کر کے جی حضور، جی حضور کہتی ہیں۔ میاں کا فرمان..... بس نہیں چلتا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیں۔“

”اچھا.....“ اس نے چند لمبے دوبارہ سوچا۔ ”دادی اور ابو..... دادی کہتی ہوں گی کاروبار، ابو کہتے ہوں گے نوکری..... ہے نا۔“

اب کے جواب اثبات میں ملنے کی توقع تھی۔ ”سمجھنے لگا۔“ ثاقب نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”تو پھر..... پھر پھر اور ابو؟ ٹھیک بتایا نا۔“ وہ خطرہ نظروں سے اسے دیکھتا بولا۔

”نہیں.....“ سمجھنے لگا۔ ”سمجھنے لگا۔“

”یار! بس کر اب یہ کسوٹی..... خود ہی بتا دے۔“ ”میں.....“ اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ”اور باقی کے تمام لوگ.....“

”ہیں.....“ ثاقب حیران ہوا۔ ”ہاں۔ میں چاہتا تھا، کاروبار کروں۔ باقی سارے گھر والے چاہتے تھے میں نوکری کروں۔ ان کو لگتا تھا کہ اپنا کام کرنے سے میری ایم بی اے کی ڈگری ضائع ہو جائے گی۔“

”تو پھر یہ فیصلہ بھی اکثر بکوں نے کیا تھا کہ تجھے کیا کرنا ہے؟“

”ہاں.....“ سمجھنے لگا۔ ”سمجھنے لگا۔“

”یار! یہ اکثر بکوں تو بڑا عظیم نسخہ ہے تیرے گھر کا۔“

”جی..... اور میرے گھر والے ہیں کہ اس عظیم نسخے کو ترک کرنے پر تیار ہی نہیں ہیں۔“

”اور اگر مطلوبہ نتیجہ نہ ملنے پر کوئی مکر جائے تو؟“ ثاقب کی دلچسپی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”مکرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی تعظیم دی جاتی ہے ہمارے ہاں اکثر بکوں کے فیصلے کو، جیسے سرکاری ہسپتالوں میں ڈاکٹر کو..... جیسے پرائیویٹ ہسپتالوں میں مریم کو..... جیسی خاتما ہوں میں بیٹھے بزرگوں کو..... جیسی.....“

”بس بس، میں سمجھ گیا۔“ ”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“ سمجھنے لگا۔

”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“ سمجھنے لگا۔ ”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“

”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“ سمجھنے لگا۔ ”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“

”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“ سمجھنے لگا۔ ”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“

”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“ سمجھنے لگا۔ ”ڈیل کی طرف آئیں اب؟“

”اور میں چاہتا ہوں تو یہ مسئلہ حل کروادے۔“ ”یہ ایک مسئلہ ہے؟“ ثاقب نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”مسائل کا انبار ہے یہ..... جب تک تیری پھوپھو کو تیری ہیں، تیری شادی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو ان کی عمر اس قدر زیادہ ہو چکی ہے، اس پر بھی کوئی رشتہ ان کو پسند نہیں آتا۔“

”اب تو رشتہ آتا ہی نہیں۔ پسندنا پسند کی بات تو دور کہیں رہ گئی۔“ سمجھنے لگا۔ ”سمجھنے لگا۔“

”اوپر سے تیری کزن، جہاں تو دل لگا بیٹھا ہے۔ اس کے نانا، نانی، تیرے دادا، دادی کے ساتھ اللہ جانے کیا کیا دھوکا بازیاں کر چکے ہیں۔ پھر وہ تیرے ہونے والے سر جو لالچ میں اندھے ہو کر تیرے پھوپھو بننے بننے رہ گئے۔ یار! یہ مسئلہ حل کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ تو اپنے اکثر بکوں سے حل کروا لیا اپنی شادی والا مسئلہ۔“

”اب اکثر بکوں ایسا بھی کوئی بزرگ نہیں ہے، جو اس طرح کے مسئلے حل کروادے۔“

”تو میں کیا شکل سے بہت بڑا بزرگ لگ رہا ہوں۔“

”دیکھ ثاقب! مسئلہ تیرا بھی کوئی ایسا آسان نہیں ہے۔ ڈیل کر لے میرے ساتھ۔ تو میرا مسئلہ حل کروا، میں تیرے مسئلے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہوں۔“

”یہ لے.....“ ثاقب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”مجھے معاف کر دے۔“

”یار! تو خواہ مخواہ گھبرا رہا ہے۔ تجھے صرف ایک ٹنگ کرنی ہوگی میرے گھر والوں کے سامنے۔ ڈائریکشن، پروڈکشن میری اپنی ہوگی۔“

ثاقب چند لمبے غور کرتا رہا۔ ”چل رکھ ہاتھ پھر.....“

دونوں اپنے ہاتھ ایک مرتبہ پھر سنگی شیخ پر رکھ چکی تھے۔

اکثر بکوں جیسے

اکثر بکوں جیسے

اکثر بکوں جیسے

اکثر بکوں جیسے

اکثر بکوں جیسے

اسی نوے پورے سو سے نکلا دھاگا چورنگل کے بھاگا اچھا کھانا کھائیں گے ساسی بن کے آئیں گے ریل بولی چھکا جھک صاب بولا بیری گڈ ڈبل روٹی بسکٹ

اختتامِ آب کی بار بھی سمجھ پر ہی ہوا تھا۔ اور یہ ٹرائل نہیں تھا۔

☆☆☆

سرخ بڑے بڑے گلابوں والی کالی قمیص پہنے وہ لڑکی اور براؤن پیٹنڈ پیرس میٹھی شرت پہنے۔ پیٹنڈ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گھڑا وہ لڑکا۔ سر اٹھا کر ایسے گھروں کو لوٹنے پر بندوں کو تنک رہے تھے گویا اسی مقصد کے لیے کھڑے تھے۔

ہوا سے اڑتے دوپٹے کو ہاتھوں سے پکڑتے، کلائی میں بڑی کاج کی چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خاموش ہو گئیں۔

سمجھنے لگا۔ ”سمجھنے لگا۔“

پھر دوبارہ سے بندوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”سمجھنے لگا۔“

لڑکے والے لار ہی ہیں۔ اگر وہ مجھے پسند کر گئے تو کیا ہوگا۔“

مسفرہ اوپر تلے آنے والے ان رشتوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گئی تھی۔

”بے فکر ہو..... اب تک کوئی پسند کر کے گیا ہے تمہیں، جو یہ لوگ کر جائیں گے۔“

بظاہر سمجھنے لگا۔ ”بظاہر سمجھنے لگا۔“

پریشان تھا، یہ وہ کم مسفرہ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”سمجھنے لگا۔“

فیصلہ کر لیا ہے جو نانا، نانی (مرحوم) نے ابو کو چھنانے کے لیے کیا تھا۔“

”سمجھنے لگا۔“

”سمجھنے لگا۔“



”کیا؟“ جی ہی نکل گئی بے چارے کی۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ وہ ابو سے کہہ رہی تھیں کہ رشتے والی  
 بوا سے کہہ دیتے ہیں کہ لڑکی کے نام گھر کریں گے۔  
 پھر دیکھنا کیسے ہوتا ہے رشتہ اور کیسے ہوتی ہے شادی۔“  
 ”یارانیہ تو واقعی پریشانی والی بات ہے۔“ سہج  
 بے چارہ بوکھلا ہی گیا۔  
 ”تو اور کیا بتا رہی ہوں میں، تمہیں اتنی دیر  
 سے۔ میں کیا کروں سہج؟“  
 ”ایسا کرو، خود کٹی کرلو۔“ سہج نے فوراً مشورہ  
 پیش کیا۔

”تو تم رہ لو گے میرے بغیر؟“  
 ”نہیں، مجھے تمہارے بغیر نہیں جینا۔“ اس نے  
 گردن ہلائی۔  
 ”تو تم بھی خود کٹی کر دے؟“  
 ”نہیں، اب مجھے تمہارے ساتھ مرنے کا بھی  
 کوئی ارمان نہیں ہے ایسا۔“  
 ”سہج! مجھے لگ رہا ہے میرے مرنے کے بعد  
 بھی ناتم ایسے ہی رہو گے۔“  
 ”تو تمہارے مرنے کے بعد، کیا مجھے درویش  
 بن جانا چاہیے؟ یا بچوں ہو کر، کپڑے پھاڑ کر جنگلوں  
 میں بھاگ جانا چاہیے۔“  
 ”سہج! تم کچھ کرنا پلین۔“  
 ”کرنا ہوں۔۔۔۔۔ روز صبح سے شام تک شاپ پر  
 کسٹمرز کو ڈیل۔“

”ہمارے رشتے کے سلسلے میں۔۔۔۔۔“  
 وہ زچ ہو رہی تھی بری طرح۔ سہج کے غیر بخیدہ  
 رویے پر۔  
 ”تمہارے رشتے کے سلسلے میں تو بڑے لوگ  
 بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، تمہارے امی، ابو اور پھر وہ بوا  
 رشتے والی۔ مسئلہ تو میرا ہے، جب تک نین پھو پھوکی  
 شادی نہیں ہو جاتی، میری شادی کا تو ذکر بھی کبیرہ گناہ  
 تصور ہوگا اور نین پھو پھوکی شادی۔۔۔۔۔ حق با۔ کشمیر کا  
 مسئلہ حل ہو جائے گا، ہندوستان پاکستان کے قبضے میں  
 آ جائے گا۔۔۔۔۔ سعودی عرب، ایران بھائی بھائی بن

جائیں گے۔۔۔۔۔ امریکہ، روس گلے مل لیں گے۔  
 پر۔۔۔۔۔ یہ مسئلہ اللہ جانے بھی حل ہوگا یا نہیں۔“  
 اس نے اتنی ٹھنڈی سانس بھری کہ خود ہی سردی  
 سے کانپنے لگا۔  
 ”سہج! تمہیں ذرا سی بھی پروا ہے میری؟“  
 ”ہاں ذرا ہی تو ہے ہی۔“  
 ”تو پھر سیر لیس ہو جاؤ۔“  
 ”کس کے ساتھ؟“ مسکرا کر مسفرہ کو دیکھا۔  
 ”میرے بابا کے ساتھ۔“  
 وہ پاؤں پختی چلی گئی۔ سہج بس کانپتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆  
 ”آخر آپ لوگوں نے سالگرہ کو ہی کیوں  
 چنا۔“  
 ”لوگ اکٹھے کرنے کے لیے۔“  
 ”میرا سوال اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔“  
 ”ہم نے کب چنا۔۔۔۔۔ اکڑ بکڑنے چنا۔“ وہ  
 پارہ نے یاد کروایا۔  
 ”آخر یہ فیصلہ تمہاں کا؟“ سہج سب کی شکلیں  
 دیکھ رہا تھا۔  
 ”کون سا فیصلہ؟“ نین تارا حیران ہوئیں۔  
 ”یہی کہ میلاد اور سالگرہ میں سے کیا فائل کرنا  
 چاہیے۔“  
 ”میلاد اور سالگرہ؟“ اسد الدین نے حیرت  
 سے دہرایا۔  
 ”ہم نے کب کہا کہ ہمیں میلاد اور سالگرہ میں  
 سے کچھ فائل کرنا تھا۔“  
 ”امی نے کہا تھا۔۔۔۔۔“ وہ ماہ پارہ کی جانب  
 مگھوا۔

”میں نے کب کہا؟“ وہ حیران حیران سی اسے  
 دیکھنے لگیں۔  
 ”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میلاد کا بھی سوچا  
 تھا۔“  
 ”ہاں تو سوچا ہی تھا نا خالی۔“  
 ”فائل اس میں اور سالگرہ میں تھوڑا ہی کرنا

تھا۔“  
 ”تو پھر اکڑ بکڑ سے کس چیز کا فیصلہ کرنا تھا آپ  
 لوگوں نے؟“ سہج ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔  
 ”وہ۔۔۔۔۔ اسد الدین نے رضیہ سلطانہ کو  
 دیکھا۔  
 ”امی! بتائیں نا۔۔۔۔۔“  
 ”ارے یہ۔۔۔۔۔ ماہ پارہ بتائے گی۔“  
 رضیہ سلطانہ نے بہو کے کورٹ میں گیند  
 اچھالی۔  
 ”وہ۔۔۔۔۔“  
 ”نین! تم بتاؤ نا۔“

”اب بتا دیں نا۔“ سہج پھو پھو کو دیکھ کر بولا۔  
 ”وہ ہم نے فیصلہ کرنا تھا کہ سالگرہ کس کی منائی  
 جائے۔ تو اس کے لیے اکڑ بکڑ کیا تھا۔“  
 ”اووف۔۔۔۔۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”سالگرہ ہی  
 کیوں؟“ اس کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔  
 سب خاموش ہو گئے۔  
 ”خاندان والے کتنی ہنسی اڑائیں گے، کچھ  
 اندازہ ہے آپ لوگوں کو۔ آج تک اس گھر میں منائی  
 گئی ہے کسی کی سالگرہ۔“  
 ”تب ہی تو۔۔۔۔۔“ اسد الدین بولے۔  
 ”ہاں تب ہی تو۔۔۔۔۔“ ماہ پارہ نے ہاں میں ہاں  
 ملائی۔

”کبھی منائی جو نہیں گئی۔ اسی لیے تو منار ہے  
 ہیں۔“ نین تارا نے وضاحت کی۔  
 ”اور بڑی امی! آپ۔۔۔۔۔ آپ کچھ تو سمجھایا  
 کریں امی لوگوں کو۔“  
 ”میں نے سمجھایا تو تھا۔۔۔۔۔ پر کوئی سنے تو  
 میری۔“ رضیہ سلطانہ نے صفائی پیش کی۔  
 ”کیا سمجھایا تھا؟“ سہج کے کان کھڑے  
 ہوئے۔  
 ”کہا تھا قرآن خوانی کروالو۔“  
 ”پھر۔۔۔۔۔“  
 ”اب قرآن خوانی پر میں پارہ سے تیار ہوتی

اچھی لگتی۔“  
 ”ہاں اور نہیں تو کیا۔ قرآن خوانی پر تو پارہ سے  
 تیار نہیں ہو سکتی تھی نا بے چاری۔۔۔۔۔“  
 ماہ پارہ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔  
 ”پارہ۔۔۔۔۔ نین پھو پھو! آپ سالگرہ میں پارہ  
 سے تیار ہوں گی؟“ سہج کو سالگرہ کا صدمہ بھول گیا۔  
 ”ساری دنیا کی لڑکیاں شادی پر اپنے ارمان  
 پورے کرتی ہیں۔ میں کہاں جا کر پورے کروں اپنے  
 ارمان۔“ دو پٹہ آنکھوں پر رکھ لیا۔  
 ”ہائے میری بچی۔“ رضیہ سلطانہ بھی آبدیدہ  
 ہو گئیں۔

”تو اور کیا۔“  
 ”بے چاری کہاں جا کر پورے کرے اپنے  
 ارمان۔“ ماہ پارہ فوراً بولیں۔  
 ”اچھا تو پھو پھو کے ارمان پورے کرنے کے  
 لیے یہ فنکشن منعقد کیا جا رہا ہے۔“  
 آخر۔۔۔۔۔ سراہا تھا آئی گیا۔  
 ”ہاں تو جب پورا خاندان اکٹھا ہوگا، تب ہی تو  
 بتائیں نا۔ اب ایسے کیا فائدہ؟“ ماہ پارہ بولیں۔  
 ”کیا بتائیں۔“ سہج کے کان پھر سے کھڑے  
 ہوئے۔  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔“ سب ایک ساتھ  
 بولیں۔

”بتائیں مجھے۔۔۔۔۔ اب مزید کیا نیا کرنے  
 جا رہے ہیں آپ لوگ؟“  
 ”نہیں، کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ سب گھبرا گئے۔ سب  
 بوکھلا گئے۔  
 ”بتائیں نا بڑی امی۔۔۔۔۔!“  
 وہی تھیں جو فوراً سے اگل دیتی تھیں۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ خاندان والوں کو بتائیں  
 گے کہ نین کو شادی میں گھر دیں گے پھر دیکھنا جھٹ  
 پٹ رشتہ ہو جائے گا۔“  
 ”کون سا گھر؟“ وہ چکرائی تو گیا تھا۔  
 ”یہ پیچھے، جو کرائے پر لگا ہوا ہے۔“



”شکر ہے.....“ اس نے سکون کی سانس لی۔  
 ”شکر ہے، مطلب تم خوش ہو۔“ نین بولیں۔  
 ”جی..... بہت خوش ہوں اور شکر کر رہا ہوں کہ  
 اس گھر کو جین میں لے جانے کا فیصلہ نہیں کر لیا آپ  
 نے۔“ اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”جینز میں کیوں لے جائے گی، گھر داماد دیکھیں  
 گے امین بلال کی طرح۔“ رضی بولیں۔  
 ”اف یہ امین بلال حواس پر آج بھی سوار  
 ہے۔“ وہ بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

بھڑکتا، سرخ کام والا سوٹ۔ میک اپ سے  
 لٹھڑا ہوا چہرہ۔ کبھی، کبھی، کالی سیاہ زلفوں کی لٹکی  
 چوٹی..... کبھی لمبی اور پر کو مڑی ہوئی آرٹیفیشل  
 پگلیں..... سرخ انگارہ لپ اسٹک..... تیار ی پوری  
 طرح مکمل تھی۔  
 ”یارا! بتاؤ میں تجھے اپنی بڑی بہن رہا تھا، پر ذرا  
 زیادہ ہی بڑی لگ ہوئی ہے۔ اب تو میری آنٹی لگ  
 رہا ہے۔“ ثاقب نے میک اپ مکمل کر کے تبصرہ کیا۔  
 ”یہ جو تو نے کسروں والا میک اپ کر دیا ہے  
 میرے منہ پر۔ یہ تیرا ٹیلنٹ ہے۔ اس کے پیچھے ماں  
 باپ کو ناراض کیا۔“  
 ”سج کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد  
 ہوئی۔“

”ہا ہا ہا.....“ ثاقب نے زوردار قہقہہ لگایا۔  
 ”ایمان سے تیری آواز سن کر ایسا لگ رہا ہے،  
 ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ چن گئی ہے۔“  
 ”بندر کو کس..... اور اندر کردانت۔ اتنی محنت  
 سے گلا اور آواز خراب کی ہے، کوئی آدھ کلو امی اور  
 ایک پاؤ لیٹوں پانی میں گھول کر پیے ہیں تب جا کر  
 انکی سریلی آواز بتائی ہے۔“  
 ”اور وہ اس رشتے والی بوا کو کتنے پیے دیے  
 ہیں؟“  
 ”میں ہزار.....“ پھنسی پھنسی آواز دوبارہ  
 نکلی۔

”یاروس ہزار تو میرے بھی بنتے ہیں، ایرافن  
 میک اپ کیا ہے۔“  
 ”دس ہزار نہیں..... مجھے تو لگتا ہے، مکان  
 تیرے نام کرنا بنتا ہے۔“  
 ”تو کرو۔“ ثاقب نے ہنسی میں اڑائی اس  
 کی بات۔  
 ”اس کے لیے تجھے میرا پھوپھا بننا پڑے گا۔  
 کیونکہ میری پھوپھو سے شادی کرنے والے خوش  
 نصیب کو مکان جینز میں ملے گا۔“  
 ”وہ تو ادھر بھی مل رہا ہے، جہاں تو میرا رش  
 لے کر جا رہا ہے۔ کیا خیال ہے، ادھر ہی ٹائیٹ کر لوں  
 اپنا معاملہ۔“

”خبردار..... جو ایسا کچھ سوچا بھی..... تیری  
 آنکھیں نکال کر ناٹی میں بہادوں گا۔“  
 ”ہائے۔“ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر  
 ہاتھ رکھے۔  
 ”یہاں پر تیرا کام صرف رشتہ بکا ہونے تک  
 ہے۔ عین شادی والے دن تجھے روپوش ہونا ہے۔“  
 ”ہوں.....“ اس نے سر ہلایا۔  
 ”پھر میرا صاحب کی انٹری ہوگی اور اس  
 خاندان کو ذلت سے بچانے کے لیے، آپ جناب  
 پیش کر دیں گے۔“  
 ”ہوں.....“

”ہے نافول پروف پلان۔“ سمج نے دلا  
 طلب نظروں سے ثاقب کو دیکھا۔  
 ”ایک دم بوس..... جھول بلکہ جھولوں سے ہمارا  
 منصوبہ۔ ایسے کون دیتا ہے بیٹی۔ عین وقت پر لڑکے  
 نے غائب ہونا ہے نا۔ باقی کا خاندان.....  
 بارانی..... ان کا کیا کرے گا؟“  
 ”دو ہزار سی کس کے حساب سے بارانی بھی پو  
 نے لڑکے کر دیے ہیں۔ ملا جلا کر دولا کھ کا پروجیکٹ بن  
 رہا ہے۔“  
 ”سمج نے آئینے میں اچھی طرح اپنا جائزہ لے  
 ہوئے کہا۔ میک اپ واقعی کمال کا تھا۔ وہ خود بھی خود

”پرانے قصے چھوڑ دیں پھوپھو۔ اب کی باتیں  
 کریں۔“  
 ”ہم نے پورے خاندان میں سالگرہ کے  
 دعوت نامے تقسیم کر دیے عین اس دن انہوں نے  
 سفر کی شادی رکھ دی۔ اب خاندان والے سالگرہ  
 میں ٹھوڑا ہی آئیں گے، اس کی بارات میں آئیں  
 گے۔“

(آپ بھی شامل ہوں گی ان برائیوں میں ان  
 شاء اللہ۔ دل میں پھوپھو کو سخت کر کے بولا۔)  
 ”پھوپھو! کیا پتا، اللہ تعالیٰ آپ سے کی گئی  
 زیادتیوں کا بدلہ ان سے لینا چاہ رہا ہو اور عین وقت پر  
 دولا شادی سے انکاری ہو کر بھاگ جائے، شادی ہی  
 کیسٹل ہو جائے۔“  
 ”اللہ نہ کرے۔“ رضیہ سلطانہ دہل ہی تو  
 گئیں۔

(اوہو اللہ کو تو درمیان میں نہ لائیں، بڑی  
 ای۔)

”اللہ نہ کرے۔“ مہ پارہ بھی فوراً بولیں۔  
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“  
 وہ کہتا ہوا ہار نکل رہا تھا جب اپنے پیچھے پھوپھو  
 کی آواز سنی۔ ”آمین، آمین۔“  
 ”پھوپھو! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“  
 ☆☆☆

”یہ لے بیٹا..... پچاس ہزار اور روپوش  
 ہو جا۔“ سمج نے پیسے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔  
 ”ویسے تو میرا دل کر رہا ہے، نکاح پڑھوا لوں،  
 بجائے روپوش ہونے کے۔“ ثاقب نے دانت  
 نکالے۔  
 ”تیری بیٹی توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔“  
 ”اچھا سن۔ یہاں سے سیدھا ایر پورٹ  
 جانا۔“ سمج نے کہا تو وہ حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے  
 لگا۔  
 ”کیا روپوش ہونے کے لیے ملک تک چھوڑنا  
 ضروری ہے۔“

”پرانے قصے چھوڑ دیں پھوپھو۔ اب کی باتیں  
 کریں۔“  
 ”ہم نے پورے خاندان میں سالگرہ کے  
 دعوت نامے تقسیم کر دیے عین اس دن انہوں نے  
 سفر کی شادی رکھ دی۔ اب خاندان والے سالگرہ  
 میں ٹھوڑا ہی آئیں گے، اس کی بارات میں آئیں  
 گے۔“

(آپ بھی شامل ہوں گی ان برائیوں میں ان  
 شاء اللہ۔ دل میں پھوپھو کو سخت کر کے بولا۔)  
 ”پھوپھو! کیا پتا، اللہ تعالیٰ آپ سے کی گئی  
 زیادتیوں کا بدلہ ان سے لینا چاہ رہا ہو اور عین وقت پر  
 دولا شادی سے انکاری ہو کر بھاگ جائے، شادی ہی  
 کیسٹل ہو جائے۔“  
 ”اللہ نہ کرے۔“ رضیہ سلطانہ دہل ہی تو  
 گئیں۔

(اوہو اللہ کو تو درمیان میں نہ لائیں، بڑی  
 ای۔)

”اللہ نہ کرے۔“ مہ پارہ بھی فوراً بولیں۔  
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“  
 وہ کہتا ہوا ہار نکل رہا تھا جب اپنے پیچھے پھوپھو  
 کی آواز سنی۔ ”آمین، آمین۔“  
 ”پھوپھو! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“  
 ☆☆☆

”یہ لے بیٹا..... پچاس ہزار اور روپوش  
 ہو جا۔“ سمج نے پیسے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔  
 ”ویسے تو میرا دل کر رہا ہے، نکاح پڑھوا لوں،  
 بجائے روپوش ہونے کے۔“ ثاقب نے دانت  
 نکالے۔  
 ”تیری بیٹی توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔“  
 ”اچھا سن۔ یہاں سے سیدھا ایر پورٹ  
 جانا۔“ سمج نے کہا تو وہ حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے  
 لگا۔  
 ”کیا روپوش ہونے کے لیے ملک تک چھوڑنا  
 ضروری ہے۔“





ابھی آٹھ مہینے پہلے ہی تو اس نے اپنا پچھلے زکمل کیا تھا اور وہ پہلی لڑکی تھی اپنی کلاس کی جس کو فوراً جاب بھی مل گئی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے ہر چیز اس



”مریم! مریم! میرا رومال کہاں ہے؟“ علی نے رومال ڈھونڈنے کی کوشش کیے بغیر مریم کو آواز دی۔

”یہاں سامنے تو رکھا ہے۔“ مریم نے کرسی سے رومال، گھڑی اور ٹائی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دی۔

”اجھا! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔

ای جیسے بولیں ویسے ہی دعوت کی تیاری کرنا۔ اب گھر کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ ان کی شادی کو چھ مہینے گزر چکے تھے اور آج کی نصیحت بھی کل علی اور خدیجہ بیگم کے بیچ میں ہونے والی بیٹھک کا نتیجہ تھی۔

علم نامہ کل رات میں ہی جاری ہو گیا تھا اور فجر سے ہی وہ سارہ اور صفدر بھائی کی دعوت کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

”جی!“ مریم نے حکم پورا ہونے کا وعدہ کیا۔ علی کمرے سے باہر نکل کر سیدھا خدیجہ بیگم کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”امی! میں نکل رہا ہوں۔“ علی موبائل چیک کرتے ہوئے بولا۔

”اللہ کی امان میں دیا۔ رات جلدی آ جانا۔ صفدر سے کون بات کرے گا اور اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ باب دلہنا چھوڑ کر چکن کاربن کر لے۔ مجال ہے کہ کبھی خود ہی سب کر لے۔ کہہ کہہ کر کروانا پڑتا ہے۔“

مریم کا ذکر آتے ہی خدیجہ بیگم ہمیشہ کی طرح شروع ہو چکی تھیں اور بچپن میں گھڑی مریم با آسانی ان کے نادر خیالات سے فیض اٹھا رہی تھی۔

ابھی برسوں ہی کی تو بات تھی جب مریم نے رات کے کھانے کے لیے خدیجہ بیگم سے بغیر پوچھے انکو گوشت پکا لیا تھا۔ پھر اس کا کھانا کھانا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے گوشت کے بھاؤ سے لے کر لڑکیوں کی خود مختاری تک اس کو سنایا تھا۔ اس دن کے بعد سے مریم نے توبہ کر لی تھی کہ کبھی خود کچھ نہیں کرے گی۔

”کون سے گھر پر؟“ رضیہ اور نین دونوں حیران سی ان کی شکل دیکھنے لگیں۔

”ہاں..... کون سے گھر پر؟“ مہ پارہ بھی بولیں۔

”وہی جو یہ لوگ مسفرہ کو جہیز میں دینے جا رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ سب خواتین نے سر ہلا کر تائید کی۔

”تو پھر کس بات امین بلال سے؟“ اسد الدین نے ماں کو دیکھا۔

”ارے پہلے اپنے چھوکرے سے تو پوچھو۔“ رضیہ نے مسیح کو دیکھا۔

”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ انتہائی سعادت مندی سے سر جھکا دیا، بڑوں کے فیصلے پر۔

”تو چلو پھر۔“ رضیہ اٹھ کر گھڑی ہوئیں۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ.....“ نین تاراکی آواز پر وہ لوگ رکے۔

”مسح کا دل پھیل کر سکر پھر سکر پھیلا۔ (خدا یا! کوئی نیا پنگا نہ نکال لیں پھو پھو)“ وہ..... اکڑ بکڑ تو کر لیں.....“

”اب کس لیے؟“ سوال مسیح نے کیا مگر نظریں سب کی یہی پوچھ رہی تھیں۔

”وہ..... یہ طے کرنے کے لیے کہ شادی کے بعد مسفرہ بیاہ کر آئے گی یا مسیح بیاہ کر جائے گا۔“

”اف.....“ مسیح کی رکی ہوئی سانس خارج ہوئی۔

تو آخر پلان کا ماباب ہو ہی گیا۔ اس نے دل میں شکر ادا کر کے آنکھیں موند لیں۔

بس ایک سیکنڈ بعد جب آنکھیں کھولیں تو سب گھروالوں کو ہاتھ پھیلا کر میز پر رکھے پایا۔ نین بول رہی تھیں۔

”اکڑ بکڑ جیسے بو..... اسی نوے پورے سو.....“

”نہیں، تیرے ای ابو آ رہے ہیں۔ ایک گھنٹے میں فلائٹ پہنچ جائے گی۔“

”کیا.....“ وہ خوشی سے چور لہجے میں بولا۔

”ہاں..... میں نے ان سے رابطہ کر کے اطلاع بھجوا دی تھی کہ ثاقب نے خود کشی کی کوشش کی ہے۔

وارڈ نمبر اور کمرہ نمبر تک بتا دیا تھا۔ میرے خیال سے اب تک تو تیرا آدھا خاندان بھی ہسپتال پہنچ چکا ہوگا۔“

”تو پھر مجھے زندہ دیکھ کر وہ لوگ خود نہ جان سے مار دیں۔“

”اب آگے تو جان تیرا کام جانے۔ میں تو جو کر سکتا تھا میں نے کر دیا۔“

ثاقب مارے خوشی کے اس کے گلے لگ گیا۔

☆☆☆

”مسح بڑے پن کا مظاہرہ کرو اور اکڑ بکڑ سے مدد لے کر اپنی گھروالوں کو شادی میں شرکت کے لیے راضی کر چکا تھا۔“

نین تارا..... امین بلال کو ادھر سے ادھر بھاگتا دوڑتا دیکھ کر غصہ ہی آ رہا تھا۔

تب ہی کچھ عجیب و غریب سی چیز گویاں ان کے کان میں پڑیں جو رفتہ رفتہ واضح ہوتی گئیں۔

لڑکا شادی سے انکاری ہو کر بھاگ گیا۔ ساتھ میں وہ آنٹی بھی غائب تھیں جو اس کا رشتے لے کر آئی تھیں۔ شاہدہ خوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ امین

بلال کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہیرو کی انٹری کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

وہ، اسد الدین کو لے کر ایک کونے میں کھڑا کچھ بات کر رہا تھا۔ اسد الدین سن کر سر ہلا رہے تھے۔ پھر دونوں باپ بیٹا چلتے ہوئے رضیہ سلطانہ تک آئے۔

”امی! اس گھر پر ہمارا حق ہے۔“ اسد الدین بولے۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔“ مہ پارہ





کی مرضی کے مطابق ہی ہوئی مگر یہ والدین بھی ناں، جہاں سب سے زیادہ بچوں کی مرضی پوچھنی چاہیے وہاں وہ خود فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مریم کی شادی بھی ایسے ہی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ علی کا رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ خدیجہ بیگم، علی اور سارہ۔ مریم کی سوچ علی کے جواب سے ٹوٹی تھی۔

”امی! یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں گھر کے معاملات میں نہیں بڑا جاتا۔“

علی یہ کہہ کر فوراً آگس کے لیے نکل گیا اور مریم یہ سوچتی رہ گئی کہ مرد کے پاس کتنا آسان راستہ ہے ہر چیز سے بچنے کا، جہاں کوئی مسئلہ ہوا، چابی اٹھائی اور یہ جاوہ جا۔

”مریم! مریم!“ اس کی سوچ پھر اپنے نام کی بکار سے ٹوٹی، وہ جلدی سے چوہا ہلکا کر کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”جی امی؟“ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

”کھانے کی تیاری کہاں تک پہنچی؟“ انہوں نے چادر کی نادیہ شائیں بٹاتے ہوئے پوچھا۔

”برائی کا مسالا تیار ہے۔ قورسے کے لیے گوشت دھو کے رکھ دیا ہے۔ کبابوں کا قیہ، چولہے پر چڑھا دیا ہے۔ وہ پک جائے گا ظہر کے بعد کباب بناؤں گی۔“ مریم نے رٹے رٹائے انداز میں رات کا بتایا ہوا منہ بتایا۔

”اور بیٹھا؟“ خدیجہ بیگم نے ایسے پوچھا جیسے مریم کی پچھلی بات ہی نہ ہو۔

”ظہر کے بعد گلاب جامن کی تیاری کروں گی؟“

”ایک بات تو بتاؤ یہ سارے کام اگر تم ظہر کے بعد شروع کر دو گی تو دو گھنٹے سے بچن مٹی کر کیا رہی تھیں۔ علی کو دکھانے کے لیے بچن میں مٹی۔ دینی

میں چھ ہلا رہی تھیں۔“ خدیجہ بیگم کا شکایت نامہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ ان

کی آواز کو بند موزن کی آواز نے کیا تھا۔ مریم نے جھکے ہارے انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کا ایک اور ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ خدیجہ بیگم نے ہمیشہ کی طرح بیچ اٹھا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تو وہ سامنے والے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیتی تھیں۔

مریم اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ گھر کے بعد اس نے سووے کی لسٹ بنائی تھی تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ کرسی سے اٹھی تھی۔ پھر علی کے کپڑے پرئیں کیے۔ ساری چیزیں نکال کر رکھیں۔ پھر جا کر علی کو اٹھایا (مریم کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا۔ پچاس آوازیں دینے کے بعد علی صرف ہلکی سی کروٹ بدلتا تھا اور پھر سو جاتا تھا) پھر ان کا ناشتا بنایا۔ پرائے اور آلیٹ سے کم پرودہ دونوں مانتے ہی نہیں تھے۔ پھر پورا گھر سینٹا تاکہ زائدہ کے آنے پر جھاڑ دی جاسکے۔ پھر زائدہ سے پورے گھر کی تفصیلی صفائی کروائی، کپڑے دھوائے۔ جب تک علی سارا سودا لا چکا تھا ان سب کاموں میں بارہ بج گئے تھے تب جا کر اس نے بچن کا رخ کیا تھا تاکہ رات کی دعوت کی تیاری شروع کرے۔ لیکن یہ سب علی کو دکھانے کے لیے دینی میں بیچ ہلانے کے برابر تھا وہ علی جس کو پتا بھی نہ تھا کہ گھر میں کام کون کون سے ہوتے ہیں۔ مریم سر جھٹک کر نماز پڑھنے بڑھ گئی۔

☆☆☆

”مریم! یار گرین ٹی تو بتاؤ۔“ علی نے بچن میں کھڑی مریم کو آواز لگائی۔

”جی لائی ہوں؟“ مریم نے برتن ایک طرف رکھ کر چولہے پر پانی چڑھایا پھر کچھ یاد آتے پر تیزی سے خدیجہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا۔

”امی، آپ قہوہ پیئیں گی؟“ مریم نے کمرے میں جھانک پوچھا۔

”آدھے گھنٹے بعد لے آنا۔“ سلام پھیر کر

انہوں نے جواب دیا تھا۔ واپس آ کر مریم نے ایک اور کپ کا اضافہ کیا اور برتن دھونے شروع کر دیے۔

”یاد رکھنا! مانتا مگر برائی میں چاول تھوڑے کچرہ گئے تھے حلوہ نہیں آیا بالکل بھی۔“

یہ صفر بھائی کے نادر خیالات تھے۔

”ہاں وہ مریم کو ابھی اتنا اچھا کھانا بنانا نہیں آتا تاہم اسی لیے مگر وہ سیکھ رہی ہے۔“ علی نے بہت کمزور انداز میں مریم کا دفاع کیا تھا۔

”ہاں بھائی!۔۔ صفر ٹھیک کہہ رہے ہیں تو برسہ سال کچھ زیادہ ہی تیز ہو گیا۔“ اس بار علی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

بچن میں کھڑی مریم با آسانی سب سن رہی تھی۔ اسے لگا جیسے دن بھر کی ساری تھکن واپس کھڑوں پر آگئی ہو۔ اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا کیسے بابا اور امی اس کے کھانوں کی تعریف کرتے تھے۔ بابا تو ہر لمحے میں واہ واہ کرتے اور کھانے کے بعد ہمیشہ اس کو پیسے دیتے اور کہتے یہ تو میرے گھر کی برکت اور رونق ہے۔“ اور یہاں اس کے بنائے۔

کھانے کو کچا، اور مسالا تیز کہہ دیا گیا وہ بچن ان کھانوں کو جو اس کے کزنز اور چھو پھوپھو ماش کر کے بنواتے تھے۔

”مریم کے ہاتھ کی برائی کا تو کوئی ٹائی نہیں، لا جواب۔“ یہ سب سے چھوٹا ملہ کہتا تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے گرین ٹی کپ میں ڈالی اور آخری کپ پانی میں خدیجہ بیگم کے قہوے کا مسالا ڈال کر آج بلی کر دی۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بٹا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

”آئیے بھابھی! آپ کا کای ذکر ہو رہا تھا۔“ صفر کے یہ کہنے کی دیر تھی۔ سارہ کا فلک دکھانے کا تہجدہ گونجا تھا۔ جس پر علی پہلو بدل کر رہ گیا تھا اور مریم کے چہرے کی مسکراہٹ اسی طرح برقرار تھی۔

”بھائی! آپ یہ سب چھوڑیں اور یہ گرین ٹی پیئیں۔ ان شاء اللہ اگلی بار آپ کو کوئی شکایت نہیں

ہوگی۔“ مریم نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر کچھ لوگوں کو عادت ہوئی ہے بال کی کھال نکالنے کی جب تک سامنے والا ہاتھ جوڑ کر معافی نہ مانگ لے، یہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔

”بھابھی! ہم آپ کی برائی تھوڑی کر رہے ہیں مگر مجھے یقین کہ آپ نے برائی کی تہہ ٹھیک نہیں لگائی ہوگی۔ ورنہ چاول کچے نہ رہ جاتے۔“ علی کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہی سرخ کی ایک ٹانگ۔

”مریم! ادھر آ کر بیٹھو ذرا۔“ خدیجہ بیگم کی بات دار آواز پورے کمرے میں گونجی تھی۔ علی نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا کہ اسی بہانے صفر بھائی چپ تو ہوں گے۔

”جی امی؟“ مریم ان کے ساتھ والے صوفے پر بٹک گئی۔

”ہاتھ آگے بڑھاؤ۔“ خدیجہ بیگم نے دو عدد بڑاؤ سونے کے نگین مریم کے ہاتھ میں سجا دیے۔

”آج تم نے پہلی بار اتنی بڑی دعوت کا کھانا بنایا ہے نا، پہلے اس لیے نہیں پہناتے تھے کیونکہ ہمارا خاندان انتظار بڑا نہیں ہے کہ کوئی بڑی دعوت کرتے اور مجھے لگا یہی صحیح موقع ہے ان نگین کو حق دار تک پہنچانے کا، ویسے بھی آج کھانا اتنا لذیذ بنایا تھا کہ میں پرہیز کے باوجود بھی انگلیاں چاٹتی رہ گئی۔ سچ میں بہت ذائقہ اور برکت ہے میری بہو کے ہاتھوں میں کیوں علی؟“

اس وقت عجیب صورت حال تھی اس کمرے میں علی کے دانت ہی بند نہیں ہو رہے تھے۔ مریم کی اتنی تعریف پڑوہ جتنا بھی لایروا سہی، مریم کا احساس اسے بھی تھا۔ سارہ کا نگین دیکھتے ہی بس رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ ان پر اس کی کپ سے نظر تھی۔ صفر صاحب اپنی اتنی عزت افزائی پر سر جھکاٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی کتہ چینی کی عادت کے ہاتھوں ان کے ساتھ ایسا بہت پار ہو چکا تھا اور ایک ہی مریم جو



English

Beautify  
your skin,  
naturally



facebook.com/snscares

فرق نہیں۔ دونوں ہی بد مزہ۔  
مجھے اس وقت پتا چلا کہ تمہارے سر کا چپ  
رہنا اتنا اہم نہیں تھا جتنا میری ساس کے یہ الفاظ جو  
مجھے آج بھی یاد ہیں۔  
یہ کہہ کر خدیجہ بیگم ہنس دیں اور مریم ان کو دیکھتی  
رہ گئی۔

”یہ روئے ہوا کی طرح ہوتے ہیں ہمیں  
احساس بھی نہیں ہوتا کہ کب یہ ہمارے اندر اثر گئے  
اور ہم جس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔ آخر میں وہی بن  
جاتے ہیں۔“ انہوں نے قبوہ کا ایک گھونٹ بھرا۔  
”امی مجھے کوئی شکایت نہیں، سچ میں۔“ مریم  
کے آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔  
”چلو، آج سے ہم کوشش کریں گے ساس بہو  
بننے کی، ویسے ایک بات بولوں؟“  
”جی امی!“

”احساس کرنا اپنی جگہ مگر سچ بھی ایک حقیقت  
ہے۔ وہ گلاب جاسن انتہائی بد مزہ تھے۔ سچ سے اتنے  
تخت، تو یہ علی کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولنے لگا ہے۔“  
خدیجہ بیگم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مریم زور  
زور سے ہنسنے لگی تھی۔  
”کوئی بات نہیں۔ صبح سب سے پہلے اس کی  
ترکیب لکھ کر دوں گی۔“ انہوں نے کہا۔ مریم  
مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔  
”جی ٹھیک ہے امی!“  
”چلو اب جاؤ یہاں سے مجھے سونا ہے۔ کتنی  
باتیں کرتی ہوں۔“

مریم مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل آئی اور  
اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اور یہ سوچتی رہ گئی کہ  
پتا نہیں کیوں عورت مرد کے الفاظ کی خواہش مند ہوتی  
ہے۔ جب کہ ایک عورت کا ایک دوسری عورت کے لیے  
احساس زندگیاں سنوار دیتا ہے۔

بس ہونٹوں کی طرح بھی نکلن کو، اور بھی خدیجہ بیگم کو  
دیکھ رہی تھی۔  
”بالکل سچ کہا امی آپ نے اور گلاب جاسن تو  
اسنے نرم اور مزے دار تھے کہ کیا بتاؤں۔“ علی نے  
موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔  
”چلو تم بچے بات کرو، میں سونے جا رہی ہوں،  
مریم میرا قبوہ لا دو کمرے میں۔“ خدیجہ بیگم رخصت  
ہوتے ہوئے گفتگو کا موضوع بھی اپنے ساتھ لے گئی  
تھیں مریم اٹھ کر پکیں میں چل دی۔  
صفر کچھ دیر اپنا دماغ دوڑاتا رہا کہ کس کا مذاق  
اڑایا جائے مگر کچھ ہاتھ نہ آنے پر سارہ کو چلنے کا اشارہ  
کر دیا۔

☆☆☆

”امی! قبوہ“ مریم کمرے میں جھانکتے ہوئے  
بولی۔  
”ہاں لے آؤ۔“ خدیجہ بیگم نیکی سے ٹیک لگا کر  
بیٹھ گئیں۔ کچھ بل دونوں بات شروع کرنے کا سرا  
ڈھونڈتی رہیں۔ آخر میں مریم بول ہی پڑی۔  
”شکریہ امی!“ خدیجہ بیگم نے جیسے سنا ہی نہیں،  
کچھ بل مریم انتظار کرتی رہی کہ وہ بولیں۔ وہ اٹھ کر  
جانے لگی تو ان کی آواز آئی۔  
”ادھر آؤ مریم۔“

وہ چپ چاپ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔  
”جب پہلی بار میں نے سسرال میں کھانا پانا تھا  
تو میرے جینٹھ نے کہا تھا کہ بھابھی کیا آئے میں پتھر  
ملائے ہیں۔ یہ روٹی تو اینٹوں کا کام کر سکتی ہے۔“  
یہ بات سن کر میں بالکل سن ہو گئی۔ تمہارے  
سر چپ رہے تھے اور میری ساس نے جینٹھ کی اس  
بات کی تائید کی تھی۔ جب علی نے تمہارا دفاع کیا،  
چاہے وہ تمہارے لیے معمولی کیوں نہ ہو، میرے اندر  
ایک حسرت بھر گئی کہ کاش، اس دن کسی نے میرے  
کھانے کو بھی سراہا ہوتا۔ میری ساس نے تو یہاں تک  
کہہ دیا تھا کہ اس میں اور بچوں کے کھانے میں کوئی





# حکیم

”دیکھ تو میں رہی ہوں۔“ اس نے ناخوشی سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ”بہت سے لوگوں نے نئے دوست بنا لیے ہیں۔“

”گلتا ہے کوئی جمل رہا ہے، ایڈم۔“ داتن نے مسکراہٹ دبا کے کہا تو شہزادی نے کندھے اچکائے۔

”ابھی اتنا برا وقت مجھ پہ نہیں آیا جو تم دونوں سے جلوں گی۔ پلیز اپنی شیر لاک ہو مزہ والی سرگرمیاں جاری رکھو۔“ وہ سر جھٹکتی پنک کی طرف بڑھی تو ایڈم نے برامانے بغیر پکارا۔

”اتنی اچھی پینیل دکھانے والا تھا آپ کو۔“ پوچھا۔

پتو بیسویں قسط





”گلتا ہے پھر باس سے بے عزتی ہوئی ہے۔  
خیر ہے، چے تالیہ۔ ایسا ہوتا ہے۔ آپ کہتا ہیں۔“  
ابھی یہ دو لفظ بولے ہی تھے کہ تالیہ نے جھٹ کے  
اسٹینڈ سے چھری اٹھائی اور اس کی طرف بلندی۔  
”یہ فقرہ بول کے تو دکھاؤ تم آج۔“ چیر دینے  
والی نظروں سے گھورا تو ایڈم نے فوراً سے دایاں ہاتھ  
پچھے کر لیا۔

”واؤ۔ بڑے دن بعد شہزادی تاشہ نظر  
آئیں۔“

تالیہ نے ایک دم چھری گرا دی اور بے یقینی  
سے اپنے ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے چھری پڑی  
تھی۔ پھر جھجھکی لے کر سر جھکا۔  
”یہ میں نہیں ہوں۔“

”چے تالیہ۔۔۔۔۔ آپ کیوں خود سے جنگ کر  
رہی ہیں؟“ اب کے وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ  
نے شا کی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے ملاکہ میں چند ماہ کے لیے شہزادی کا  
صرف کردار ادا کیا تھا۔ میں وہ شہزادی نہیں ہوں جو  
حکومت کرتی تھی۔ میں ایک فین گرل ہوں جو دی  
وان فارح کی رفتار سے ملتے ملتے ہانپنے لگ جاتی  
ہے۔“

”آپ واقعی ایک ہنس کھ اور زندہ دل فین  
گرل ہی ہیں اور ایک سابقہ اسکاڑے تالیہ، مگر آپ  
وہ مغرور شہزادی بھی ہیں جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہ  
سمجھتی تھی۔ آپ یہ ”دونوں“ ہیں۔ ہم سب کے اندر  
ایک ”غلام ملکہ“ بننے کا خواہش مند وجود ہوتا ہے اور  
میں نے آپ کو اسی طرح تسلیم کر لیا ہے۔ یہ مجھے  
دانت نے سمجھایا ہے کہ انسان جو ہوتا ہے اسے اپنے  
آپ کو ویسا ہی قبول کر کے اپنی کمزوریوں کو اپنی  
طاقت بنانا ہوتا ہے۔ آپ اپنے آپ سے کیوں  
بھاگ رہی ہیں؟“

چو لہے پہ کام کرتی دانت نے محض مسکرا کے  
اسے دیکھا اور کام جاری رکھا۔ وہ ان دونوں کو آپس

میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔  
”اف ایڈم۔۔۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے۔“ اس نے سر  
دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ ”ہر چیز غلط ہو رہی ہے۔  
ادھر سے فارح نے اس رات ذوالکفلی کو میرے لیے  
یہ جٹ تھمادی اور میں اس پہیلی کو حل نہیں کر پاری۔“  
پھر جھٹسے کے گلاس تلے رکھی چٹ نکال کے اسے  
دکھائی۔ ”کیا تم اس کو حل کر سکتے ہو؟“

ایڈم نے ایک نظر ان ہندسوں کو دیکھا اور  
دوسری سادہ نظر تالیہ پہ ڈالی۔  
”بالکل نہیں۔ اسے اسی کو حل کرنا چاہیے جس کو  
وان فارح نے یہ دی ہے۔“

وہ جو ہر امید ہوئی تھی منہ بنا کے اسے دیکھنے لگی۔  
”میں ”حالم“ ہوں اور اس کو مختلف فارمولوں  
algorithms اور ciphers کے ذریعے حل  
کرنے کی کوشش کر چکی ہوں مگر یہ کوئی ایسا کوڈ ہے جو  
ٹوٹ ہی نہیں رہا۔ نہ یہ نمبر کسی کارڈ نمبر ہے نہ بینک  
ایکاؤنٹ نہ شہنشاہی کارڈ نمبر۔ ”اف۔“ وہ زچ ہو چکی  
تھی۔

”بھی تو آپ کی غلطی ہے۔ آپ اسے عالم  
یعنی تالیہ بن کے حل کر رہی ہیں۔ عالم تو ماہر ہے بے  
پناہ ذہانت کا مالک۔ بڑے بڑے کوڈز بریک کرنے  
والا۔ یہ جٹ وان فارح نے عالم کو نہیں دی تھی۔“  
تالیہ نے اچنبھے سے ابرو اکٹھے کیے۔ ”تم اتنی  
لمبی تقریر کے بجائے صاف بات کیوں نہیں کرتے“  
ایڈم۔

ایڈم کی آنکھیں شرارت سے چمکیں۔  
”وان فارح آپ کی زبانی جنگل میں آپ کی  
کہانی ضرور سن چکے تھے مگر وہ بھی کے ایل والی تالیہ  
مراد کو جو کوڈز توڑنے میں ماہر تھی جانتے ہی نہیں  
تھے۔ وہ عالم سے بھی کے ایل میں نہیں ملے تھے۔“  
”اسی؟“

”فارح صاحب صرف شہزادی تاشہ سے  
واقف تھے۔ وہ شہزادی تاشہ جس نے جنگل میں ان

کے ساتھ سفر کیا تھا۔ وہ کوئی ”عالم ملکہ“ بننے کی  
خواہش مند لڑکی نہیں تھی۔ وہ براہِ اعتماد تھی۔ اسے آگے  
کسی کی ذہانت کو کچھ نہ سمجھتی تھی۔ وہ کوڈ ڈرامین کی  
آنکھ میں بے رحمی سے تیر چلا سکتی تھی۔ اندر میرے  
پانیوں میں سفر کرتی خزانے کے جزیرے تک جا پہنچی  
تھی۔ جس نے قید خانے میں جا کے سپاہیوں سے کہا  
تھا کہ وہ ان کی ہونے والی ملکہ ہے۔ وہ فین گرل نہیں  
تھی۔ وہ ”ملکہ“ تھی اور یہ جٹ انہوں نے اس تاشہ  
کے لیے دی تھی۔ اگر آپ یہ چیف آف اسٹاف والی  
معلوم اور سادہ سی تالیہ بن کے اس پہیلی کو حل کرنا  
چاہیں گی تو آئی ایم سوری مگر آپ بھی اسے حل نہیں  
کر سکیں گی۔ نہ آپ عالم جیسی اتنی سی کثیر بن کے  
اس کوڈ کو توڑ پائیں گی۔ آپ کو پہلے یہ فین کرنا پڑے  
گا کہ آپ کون ہیں۔“

وہ اسے سنے لگی۔ چپ چاپ سنے لگی۔ پھر اس  
نے آنکھیں بند کیں۔

تاج، انگوٹھیاں، کاندرا لمبے لباس۔۔۔۔۔ تیروں  
سے بھرا ترش، گوار۔۔۔۔۔ کچھ بھی اس کے پاس نہ تھا  
مگر۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ  
مراد راجہ کی بیٹی ہے۔ ایک شکار باز۔ ایک شہزادی۔

جو ملاکہ سلطنت کے سلطان کی ملکہ بننے جا رہی  
تھی۔

جس نے راجہ مراد کو چکھا دیا تھا اور غلاموں کو محل  
کے باہر لا کھڑا کیا تھا۔۔۔۔۔

جو غار کے محافظ شکار باز کے خون میں لت پت  
وجود کی پروا کیے بغیر اس کو گردن سے دیوچ کے  
خزانے کا پوچھ رہی تھی۔۔۔۔۔

جو قید خانے میں فارح پہ تشدد کرتے سپاہیوں پہ  
غزرائی تھی۔۔۔۔۔

جو شاہی مورخ سے اپنی تعریفیں لکھوایا کرتی  
تھی۔۔۔۔۔

اور اس لمحے میں تالیہ کو احساس ہوا کہ وہ کون تھی۔  
وہ خود ”انی“ فین تھی۔۔۔۔۔

وہ اپنی تعریفیں اسی لیے لکھوایا کرتی تھی کیونکہ  
وہ اپنی ذہانت کے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھتی تھی۔  
وہ شہزادی تھی اور ایڈم مورخ جبکہ فارح غلام تھا۔  
”غلام!“ وہ چونکی۔ ”وان فارح صرف ایک  
غلام تھا ایڈم۔“ وہ بولی تو چونکا لہجہ مختلف تھا۔  
(ایڈم زبردست مسکرایا۔)

”وان فارح میری طرح (گردن اکڑائی) کوڈز  
بنانے اور توڑنے میں ماہر نہیں تھا۔ وہ تو ایک  
سیاستدان تھا۔ اسے یہ کام نہیں آتے۔ میں اس کو غلط  
طریقے سے حل کر رہی تھی۔“

اس نے جٹ اور اٹھا کے اسے غور سے دیکھا۔  
”میں اس پہ دنیا کا مشکل سے مشکل ترین فارمولا اپلائی  
کر رہی تھی جبکہ۔۔۔۔۔ اگر اسے وان فارح نے لکھا ہے  
تو۔۔۔۔۔ اسے تو کوئی بہت آسان چیز ہونا چاہیے۔“

”بھی تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ یہ کوئی  
بہت سادہ چیز ہوگی۔ آپ فین گرل بن کے نہ  
سوچیں۔ وہ ذہن شہزادی بن کے سوچیں جس کے  
سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔“ ایڈم نے پٹن اس  
کی طرف بڑھایا۔

”پتہ ہے کیا۔۔۔۔۔“ وہ اسے سنے بغیر پٹن لے  
کر جلدی سے کاغذ پہ حروف لکھنے لگی۔ ”یہ سادہ سا

Shift cipher شفٹ سائفر ہے۔ ہر ہندسہ  
حروف کی کوٹا پر کرتا ہے۔ جیسے 1 کا مطلب ہے  
پہلا حرف۔ A۔“

وہ تیز تیز ہر ہندسے کے ساتھ اس کے نمبر والا  
حروف کی لکھ رہی تھی۔ جو فقرہ بنا وہ حروف کا صرف  
ملغوبہ لگ رہا تھا۔

”چونکہ یہ شفٹ سائفر ہے تو ہر حرف سے اگلا  
صرف لکھنا ہوگا۔ 1 کے لیے A کی جگہ بی لکھوں گی  
اور۔۔۔۔۔“ تالیہ مسکرائی۔

(یہ تو بچوں والا سائفر تھا۔ ہونہ۔ میرے  
باس کو تو مشکل کوڈز ہی نہیں لکھنے آتے۔) شہزادی  
نے غرے سے سوچا تھا۔



داتن فرائی جھلی لیے ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ جٹ اب درمیان میں رہی تھی اور اس پہ لکھا نظر آ رہا تھا۔  
 "اس کا قاتل اس کی پسندیدہ فیروی ٹیل میں ہے۔"

وہ الفاظ خون کو سرد کر دینے والے تھے۔ وہ تینوں لمبے بھر کے لیے دنگ رہ گئے تھے۔  
 "اس کا کس کا؟"

"ظاہر ہے آریانہ کا۔ انہوں نے جنگل میں مجھے آریانہ کا قصہ سنایا تھا وہ چاہتے تھے کہ مگر چونکہ وہ مجھے چھوڑ رہے تھے اسی لیے انہوں نے مجھے 'قاتل' کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" ساری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ "مگر جب ان کو تین سوالوں کا علم ہوا تو انہیں لگا کہ 'میں' اور 'وہ' الگ نہیں ہو سکتے۔۔۔ تب انہوں نے ذوالکفلی کے پاس میرے لیے یہ ہنٹ چھوڑا کیونکہ وہ چاہتے تھے میں آریانہ کو انصاف دلاؤں۔ یہ انکشاف ان کو ملا کہ میں کسی وجہ سے ہوا ہو گا اور وہ یادداشت کھونے پہ اسے بھولنا نہیں چاہتے ہوں گے۔"

"مگر آریانہ کو تو صوفیہ رٹمن نے مارا تھا۔" ایڈم حیران ہوا۔

"ہاں" اس نے ہی کیا تھا وہ سب۔ سارے ملک کو معلوم ہے۔" داتن کو بھی اچنبھا ہوا۔

مگر تاہم ہنٹ مراد آنکھوں کی پتلیاں سکڑے اس جٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔ صوفیہ رٹمن نے آریانہ کو نہیں مارا تھا۔" اس کی نظریں ان الفاظ پہ جمی تھیں۔ "میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے۔ آریانہ فیروی ٹیل میں رہنے والی بچی تھی اور اس کی پسندیدہ فیروی ٹیل سنووائٹ تھی۔"

"ہاں... تو؟" داتن خفا ہوئی۔ "سنووائٹ میں بھی ظالم ملکہ نے شہزادی کے لیے جنگل میں شکاری بھیجا تھا اور ہمارے ملک کی ظالم ملکہ صوفیہ

رٹمن ہی ہے۔"

"اوپھوں۔" اس نے دھیرے سے گردن ہلائی۔ وہ ابھی تک بتا چکے کاغذ کو دیکھ رہی تھی۔ "تم بھول رہی ہو کہ اسنووائٹ میں ظالم ملکہ کون تھی۔"

"کون تھی؟"

"سوئیٹیاں! ایڈم نے ششدر آواز میں کہا تو داتن کا منہ کھل گیا۔  
 "کیا؟"

اور سارا پزل لچوں میں حل ہو گیا تھا۔ شہزادی تاہن کے لیوں پہ بالآخر ایک تلخ اور بے رحم مسکراہٹ بکھر گئی۔

"آریانہ کو عصرہ نے مر دیا تھا۔۔۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ یہ زور دے کر بولی۔ "آریانہ کی مجرم اس کی اپنی سوئیٹیاں ماں ہے۔ ان دونوں کے درمیان فاح کا 'جھوٹ' نہیں، عصرہ کا 'گناہ' آگیا تھا۔ عصرہ آریانہ کی قاتل ہے اور داتن فاح یہ بات بھول چکے ہیں۔" وہ ہنٹڈے لہجے میں باری باری دونوں کے سفید پڑتے چہرے دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

حالم کے جنگلے میں اس وقت ششدر سا سناٹا چھایا تھا۔

☆☆☆

عصرہ ہنٹ محمود کے بیڈروم کی دیوار پہ سلور بیضوی فریم کا قد آور آئینہ آویزاں تھا اور وہ خالی کمرے کا عکس دکھا رہا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور عصرہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ بیک کھنی پہ ڈالے، وہ سیمتار کے بعد سیدھا گھر آئی تھی اور ایک ہاتھ سے اسٹول اتار رہی تھی۔ پھر بیک کمرے پہ پھینکا اور سیدھی چلتی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اونچا جوڑا پابندھے، کانوں میں موتی اور گردن میں ہیروں کا میٹکلیس پہنے، اس نے مسکرا کے اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔  
 "آج کی تقریر نے سوئٹل میڈیا یہ میری

تقریروں کے بل باندھ دیے ہیں۔ اچھی تقریر لکھ کے دی تھی تاہم نے۔" وہ مسکرا کے اپنے میٹکلیس پہ انگلی پھیرتی اپنے کس سے کہہ رہی تھی۔

"مگر تاہم جتنی ہے کہ مجھے ان تقریروں کی ضرورت ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ عصرہ محمود حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اور اب وہ حکومت کرے گی کیونکہ اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔"

"واقعی میں، اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔" کمرے کے کونے سے آواز آئی تو عصرہ نے اطمینان سے چہرہ موڑا۔ وہاں بیڈ کے کنارے پہ آریانہ بیٹھی تھی۔ سفید فرائی پہنے، سفید میز بیڈ لگائے، اس کی نظریں عجیب تھیں اور فرائی کے سینے پہ خون لگا تھا۔

"مجھے معلوم ہے تم یہاں نہیں ہو آریانہ۔ اب مجھے تمہارے ڈرائے خوابوں سے ڈر نہیں لگتا کیونکہ تم مر چکی ہو۔ بے چاری آریانہ۔" بے زاری سے سر جھٹک کے دوبارہ آئینے میں دیکھا۔ عکس میں پیچھے بیڈ پہ بیٹھی آریانہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"میں آریانہ نہیں ہوں می۔ میں تو آپ کا اپنا آپ ہوں جس سے آپ ڈرتی ہیں۔" چھوٹی بچی مسکرائی۔ "مگر آپ کو اب کسی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اتنے برس آپ اس بات کے ڈر سے ملک سے بھاگنا چاہتی تھیں کہ کہیں وہ مٹی اور اس کا ساتھی آپ کے سامنے نہ آجائیں یا میں دوبارہ سے ڈیڈ کونڈ مل جاؤں، مگر چھ سال بعد ڈیڈ نے یہ نیفون میں دور کردی۔ میں تو اسی دن مر گئی تھی اور وہ دونوں گواہ بھی جن کو آپ نے بھیجا تھا۔"

"ہاں اور بالآخر میں اپنے خوف سے آزاد ہو گئی۔" وہ عکس میں خود کو مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ "اب مجھے اس ملک پہ حکومت کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"مگر آپ کو ابھی بھی ایک چیمپن ہے۔ کچھ ہے جو آپ کو بے آرام کر رہا ہے۔" عصرہ کی مسکراہٹ مٹی۔ اس نے گہری سانس لی۔  
 "ہاں۔ اور اس کا نام تاہم مراد ہے۔ فاح اور

وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ ان کے درمیان "کیا" چل رہا ہے، لیکن خیر۔۔۔ اس کی کہانی بھی جلد ختم ہو جائے گی۔ میں نے اشعر سے عثمان کے ذریعے صوفیہ رٹمن کو تاہم کے بارے میں مشکوک کر ہی دیا ہے۔ کچھ تو اس کے خلاف مل ہی جائے گا حکومت کو۔ وہ ہماری زندگیوں سے دور چلی جائے گی اور یہ راز راز ہی رہے گا کیونکہ سوائے اس کے کوئی خطرناک حد تک ذہانت کا مالک نہیں ہے یہاں۔ وہ اب چہرے پہ آئی لٹ لپیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

آریانہ کا عکس بدقسم ہونے لگا اور بالآخر وہ غائب ہو گئی۔ جب سے اس کے مر جانے کا علم ہوا تھا، اس کا عکس عصرہ کو کم کم ستانے لگا تھا۔

وہ بالآخر پرسکون ہو چکی تھی۔ شانت اور بے خوف۔ "کیا اشعر، کیا بچے اور کیا فاح۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی اب میرا راز نہیں پاسکے گا۔"

پھر تنہا کمرے میں کھڑے اس نے بیضوی آئینے سے مسکرا کے پوچھا۔

"Mirror, Mirror on the wall,  
 Who is cleverest of them all."

اور آئینہ جواب کے طور پہ ملکہ بد کا خوب صورت چہرہ دکھا رہا تھا۔

بہنوں کے لیے خوش خبری

آج ہی تشریف لائیں اور

**30% فیصد ڈسکاؤنٹ**

حاصل کریں ہماری شاپ پر موجود

تمام کتب کی سیل جاری ہے

یہ رعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے ہے

شاپ کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی فون: 32216361



دفترا دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ تیزی سے  
برآمدے میں آیا مگر وسط میں ٹھہر گیا۔

سائے ملکہ یان سو فائے چند مصاحبوں کے  
ہمراہ آ رہی تھی۔ بھورے چنے میں ملبوس سرکواس کی  
ٹوپی سے ڈھکے، قریب آتی ملکہ نے ہاتھ کے  
اشارے سے مصاحبوں کو دور رہنے کا اشارہ کیا اور  
خود اس کے سامنے آرکی۔ چنے کی ٹوپی کے بالے  
میں اس کا خوب صورت چینی چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا  
تھا۔

فاتح نے ڈول زمین پہ رکھا اور گردن جھکا کے  
تعطیلاً سلام کیا۔

”ملکہ... خوش آمدید۔“ ساتھ ہی نظریں اٹھا  
کے دیکھا۔

شاہ چین کی بیٹی نے چنے کی ٹوپی پیچھے گرائی  
اور شاہانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”سب کیسا جا رہا ہے غلام فاتح؟“  
اس نے پہلے ملکہ کو کرسی پیش کی، پھر درمیان

میں میز رکھی اور جب وہ کرسی پہ بیٹھ گئی تو وہ مقابل  
کرسی پہ بیٹھ گیا۔ غلام ہونے کے باوجود وہ ملکہ کے  
سامنے بیٹھنے سے قطعاً نہیں ہچکچایا۔ ملکہ کی مسکراہٹ  
گہری ہوئی تھی۔

”کل شہزادی تالیہ اور مورخ تین چاند والے  
جزیرے کے لیے روانہ ہوں گے جہاں سے وہ خزانہ  
ڈھونڈ کے لائیں گے۔ آپ کا بھیجا گیا چینی جہاز اگر  
وقت پہنچ گیا تو...“

”وہ وقت یہی پہنچے گا۔“  
”بالکل، اگر ایسا ہوا تو شہزادی تالیہ خزانے

سمیت واپس آئیں گی۔ امید ہے تب تک مراد راجہ  
مجھے قید کر چکا ہوگا، لیکن میں اس سے اپنے اور تالیہ  
کے لیے محفوظ راستہ حاصل کر لوں گا۔ پھر ہم ملاکہ  
سے چلے جائیں گے اور آپ کے تخت کو کسی لڑکی سے  
خطرہ نہیں ہوگا۔“

”مراد راجہ اور تالیہ... مجھے اپنے ان دونوں  
’دشمنوں‘ سے نجات مل جائے گی نا؟“ اس نے

”چناؤ“

اس نے خواب میں دیکھا۔  
وہ لکڑیوں کا گھڑ پینک کے اس کچڑ میں لت  
پت لڑکی کے سامنے جھکا۔

جو گھنٹوں کے بل زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔  
آس پاس گھنے اور اونچے درخت تھے۔

وہ گھنٹوں پہ ہاتھ جمائے جھک کے اس سے  
بولی۔

”میکس لوش۔“  
وہ ہچکا چڑھا اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

”آج تمہاری سالگرہ ہے۔ کوئی خواہش  
کرو۔“

پھر اس نے سناہ روتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔  
ٹوٹے ٹوٹے سے الفاظ سماعتوں سے کرائے۔

”چاکلیٹ... بہت ساری چاکلیٹ...“  
وہ مڑا اور ایک درخت تک گیا۔

ایک سخت خول کا پھل توڑا اور اسے چاقو سے  
کاٹا۔

اندر سے نکلتے گوڑے کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ  
اسے لگانا کہ میں گھس گئی ہو۔

ایک دم سے فاتح کی آنکھ کھلی۔  
☆☆☆

کچھ دیر کے لیے 557 برس قبل کے زمانے  
میں واپس چلتے ہیں۔

شہر تھا ملاکہ کا... وقت تھا شام کا... اور مقام تھا  
سن باؤ کے گھر کا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور وان فاتح محن میں پانی  
کا چمڑکا کرنا نظر آ رہا تھا۔ سفید پاجامے پہ پہنے  
کرتے کی آستینیں چڑھائے، ہاتھ میں ڈول پڑنے  
وہ ایک محل غلام بن چکا تھا۔ چلو بھر کے پانی محن  
کی اینٹوں پہ چمڑکتا، اور درمیان میں خود بھی گھونٹ  
بھر لیتا کہ گرمی شدید تھی اور کنویں کا پانی ٹھنڈا بیٹھا سا  
تھا۔

شہزادی سے پوچھا۔ فاتح نے سر کو خم دیا۔

”میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے ملکہ عالیہ  
کہ شہزادی تالیہ آپ کے سلطان کی ملکہ نہیں بنے  
گی۔ آپ بے فکر رہیے۔“

”تمہارے وعدوں پہ اعتبار کرنا چاہتی ہوں  
مگر...“ ملکہ نے فرخ کو دیکھ رہی تھی جہاں پانی کا  
ڈول رکھا تھا۔ ”مگر تمہارا چہرہ کہتا ہے کہ تم وعدے  
نبھانے میں ایچھے نہیں ہو۔“

”آپ کی قیافہ شناسی غلط ہے ملکہ۔ میں نے  
کبھی وعدے نہیں توڑے۔ چاہے وعدہ قوم سے کیا  
ہو یا بیوی سے یا اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے۔“

ملکہ نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں۔  
”بیٹیاں؟ تمہاری تو صرف ایک بیٹی ہے۔“

”اب ایک ہے۔ بڑی دلی مرچیلی ہے۔“  
سن باؤ کے برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ ملکہ

نے چند لمحے نظریں جھکائیں پھر اٹھا کے اسے  
دیکھا۔

”نہیں۔ جو مری تھی وہ تمہاری بیٹی نہیں تھی۔ وہ  
تمہاری بہن تھی۔“ پھر شانے اچکائے۔ ”لیکن ہو سکتا  
ہے میری قیافہ شناسی (چہرے پڑھنے کا علم) غلط ہو۔  
خیر، کل جب شہزادی تالیہ اور مورخ جزیرے کی  
طرف چلے جائیں گے تو...“

وہ بات بدل کے دوبارہ منصوبے کی طرف آئی  
مگر وان فاتح کی تمام حیات جاگ بچی تھی۔ ملکہ  
کے مقابل بیٹھے غلام نے پانی کے ڈول کو دیکھا اور  
پھر ملکہ کو۔

”نہیں... یہ قیافہ شناسی نہیں ہے۔“ اس کی  
چبھتی نظریں یان سو فائے جمی تھیں جس کی رنگت ایک دم  
جھک پڑی تھی۔

”اس روز جب آپ نے تالیہ کے سامنے اسی  
جگہ بیٹھ کے مجھے خود غرض کہا تھا تو مجھے یاد ہے آپ  
کی آمد سے چند ساعتیں قبل میں کنویں سے پانی بھر  
کے لایا تھا اور وہ ڈول بھی میں نے اسی طرح یہاں  
رکھا تھا۔ اس روز بھی میں نے ڈول سے پانی پیا تھا۔

آج بھی پیا ہے۔ آپ میرا چہرہ نہیں پڑھ رہی تھیں  
ملکہ۔ آپ پانی کو پڑھ رہی تھیں۔“

فاتح کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے اور اس نے  
آگے جھک کر ملکہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

”یہ قیافہ شناسی نہیں ہے۔ یہ جادو ہے اور  
آپ... آپ جادوگرنی ہیں۔“

نیلموں اندھیرے میں ڈوبی جوبلی پہ پل بھر  
کے لیے موت کا سناٹا چھا گیا۔ یان سو فائے کان غصے  
سے سرخ پڑے اور اس نے زور سے میز پہ ہاتھ  
مارا۔

”تم اس گستاخی کی سزا جانتے ہو غلام؟“  
”میں اتنا جانتا ہوں کہ ملاکہ میں جادوگروں

کے متعلق قوانین بہت سخت ہیں۔ اگر سلطان کو علم ہوا  
کہ آپ کے والد نے آپ کو جادو سے لیس کر کے  
بھیجا تھا تا کہ... (اس نے اندازہ لگایا) تا کہ آپ  
ملاکہ پہ قبضہ کر سکیں تو آپ کو سزائے موت دے دی  
جائے گی۔“

”تم مجھے الزام لگا رہے ہو۔“ وہ خرائی مگر لہجہ  
اتنا مضبوط نہ تھا مگر وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

”آپ نے پمپو رو کے پورے گاؤں کو تباہ کر دیا  
کیونکہ وہ جادو میں ملوث تھے۔ مراد راجہ نے اپنے

جادوگر دوستوں سے غداری کی اور آپ سے آن ملا۔  
کیا وہ آپ کا راز جان گیا تھا؟ بھی آپ نے اسے

محفوظ راستہ دے دیا۔ آپ دونوں جادوگر ہیں اور  
دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں لیکن سلطان کو  
علم نہیں ہے۔“

”آپ فکرت کریں۔ میں یہ بات کسی کو نہیں  
بتاؤں گا کیونکہ اگر آپ کو سزا ہوگئی تو مجھے اور تالیہ کو

واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔“  
یان سو فائے بیٹھے چند لمحے اس کو دیکھتی رہی،

پھر ایک دم وہ ہنس پڑی۔ یکا یک سارا غصہ غائب ہو  
گیا۔

”تمہیں لگتا ہے میں تم سے ڈرتی ہوں؟“



”آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے“  
ملکہ میں آپ سے کیا وعدہ نبھاؤں گا۔ آپ کو آپ کا  
علم مستقبل دکھائے تو دیکھ لیجیے گا۔“  
یان سونو نے اب کی بار پوری گردن جھکا کے  
ڈول میں موجود پانی کو غور سے دیکھا۔  
”میں مستقبل نہیں بتا سکتی۔ جادو صرف ماضی  
بتا سکتا ہے۔“ اعتراف کیا۔  
”اور مستقبل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟“ اسے کوئی  
یاد آیا تھا۔

”الوہی تھو۔“ وہ اب بھی پانی کو دیکھ رہی تھی۔  
”شہزادی تاشہ نے بھی آپ کے سامنے بہت  
دفعہ پانی پیا ہوگا۔ ان کا ماضی نہیں پڑھا آپ نے؟“  
”وہ جادوگر کی بیٹی ہے۔ میرا علم اس پر اور اس  
کے باپ پر نہیں چلی۔ تم البتہ۔“ اس نے نظریں  
اٹھا کے مسکرا کے فارح کو دیکھا۔ ”ایک خود غرض مرد  
رہے ہو۔“  
”اور وہ کیوں؟“

”تم نے ایک عورت سے صرف اس لیے  
شادی کی تاکہ وہ تمہاری بہن کا خیال رکھ سکے۔ تم  
اپنے باپ پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم اس سے  
بہتر ہو۔ ہمیں اپنے باپ سے نفرت تھی۔“  
”اور کیا دیکھا آپ نے میرے بارے  
میں؟“ وہ دلچسپی سے ملکہ کو دیکھ رہا تھا۔

”غلام فارح۔“ وہ اب کے نرمی سے بولی۔  
”کچھ باتوں کو نہ جاننا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں تمہیں  
تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تم منصوبے پر دھیان  
دو۔ باقی سب بھول جاؤ۔ تم کسی دوسرے علاقے  
سے آئے لگتے ہو جس کے بارے میں میں کچھ نہیں  
جانتی مگر محبتیں اور نفرتیں ہر علاقے میں ایک سی ہوتی  
ہیں اس لیے میں تمہارے دل میں کسی کے لیے نفرت  
نہیں بھرتا چاہتی۔“

یہ وہ آخری بات تھی جو یان سونو نے اٹھتے وقت  
کہی تھی۔ والن فارح نے پھر کوئی سوال نہیں پوچھا۔  
اسے ایک جادوگر کی سے اپنے ماضی کی خبر لینے میں

دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ اپنے ماضی  
سے واقف تھا۔  
پھر وہ شام بھی آگئی جب وہ مراد راجہ کو میز پر  
لے آیا اور کچھ اپنی منوا کے کچھ اس کی مان لی۔ مراد  
نے رخصت کے وقت اسے صاف لباس اور گھوڑے  
سمیت سفر کے لیے زادراہ بھی دیا۔ وہ دونوں کل کے  
دروازے پہ کھڑے تھے اور مراد اسے بتا رہا تھا کہ  
اسے کس طرح چابی کی مدد سے جنگل میں اس مقام  
تک پہنچنا ہے جہاں وہ دروازہ موجود ہے۔  
دفعہ ایک سپاہی مراد راجہ کا گھوڑا لیے قریب آیا  
تو فارح چونکا۔

”آپ میرے ساتھ آرہے ہیں راجہ؟“  
جواب مراد کی تیوری چڑھی۔  
”کیا تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں  
سن باؤ کے گھر سے اپنے صندوق اپنی نگرانی میں  
وصول کروں یا اپنی بیٹی کو اوداع کہہ سکوں؟“

”ہرگز نہیں راجہ۔ میں سورج ڈوبنے کے ٹھیک  
ایک گھنٹہ بعد آپ کو سن باؤ کی گلی کے پاس درختوں  
کے جھنڈ میں ملوں گا۔“  
”کیوں؟ تمہیں کچھ خاص کرنا ہے کیا؟ یا کسی  
سے ملنا ہے؟“ راجہ نے مسکرا کے بغور اس کی آنکھوں  
میں دیکھا۔ پھر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

”یقیناً میرے سپاہیوں میں سے کوئی ایک ملکہ  
کا وفادار ہوگا اور اس نے تمہیں آنے کا اشارہ کیا  
ہوگا۔“

”راجہ کو اپنا سونا واپس مل رہا ہے۔ اب راجہ  
کو شکایت کا حق نہیں ہے۔“  
مراد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”جاؤ“ غلام  
فارح۔ خدا کرے ملکہ مایوسی میں تمہاری گردن نہ اتروا  
دے۔“

اور ملکہ یان سونو مایوسی سے زیادہ غصے کی حالت  
میں تھی۔ اگر اس وقت وہ کل میں ہوتی تو شاید اپنے  
سپاہیوں کو اس کی گردن مارنے کا حکم دے ڈالتی لیکن  
چونکہ اس غلام کو کل میں بلانا پڑا خطر تھا اس لیے وہ

بندھارا کے محل سے چند کوس دور بنے بازار میں مل  
رہے تھے۔ سپاہی فاصلے پہ عام حلے میں ادھر ادھر  
بکھرے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہندوستانی مسالوں  
کی ایک دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ ملکہ نے  
بھورے چنے کی ٹوپی سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور اس  
کا چہرہ غصیل و غضب سے سرخ دھک رہا تھا۔  
”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مراد راجہ کو قتل کر دو  
گے“ تباہ کر دو گے۔“ وہ مٹھیاں جھٹکتے ضبط سے بولی۔  
شام ڈھل رہی تھی اور ارد گرد بہت سے تازہ  
تازہ آزاد ہوئے غلام خوش خوشی آتے جاتے دکھائی  
دے رہے تھے۔ ریش بہت تھا اور کان پڑی آواز  
سنائی نہ دیتی تھی۔ فارح کو جولیا بلند آواز میں کہنا پڑا۔  
”میں نے آپ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا  
تھا۔“

”تم خزانہ مراد کو واپس کیسے کر سکتے ہو؟ وہ  
تمہیں غریبوں کو دیتا تھا۔“  
”آپ چاہتی ہیں کہ میں وہ خزانہ سن باؤ کو  
دے دوں تاکہ وہ غریبوں میں بانٹ دے؟ کیا میں  
اتنا بے وقوف ہوں؟ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ سن باؤ  
وہ خزانہ چین بھیج دے گا۔ اور آپ یہی چاہتی ہیں۔“  
”چین بھیجنا مراد راجہ کو لوٹا دینے سے بہتر تھا۔  
تم۔۔۔ تم وہ اسے کیسے واپس کر سکتے ہو؟“

”کیونکہ وہ مجھے واپسی کا راستہ دے رہا تھا اور  
صرف وہی دے سکتا تھا۔ میں نے آپ سے تاش کو  
آپ کے راستے سے ہٹانے کا وعدہ کیا تھا“ مراد راجہ کو  
تباہ کرنے کا نہیں۔ آپ کی اور مراد کی جنگ آپ  
دونوں کا مسئلہ ہے۔ تاشہ اور میں اس ٹھیل کے  
لاٹمانی کھلاڑی تھے۔ ہمیں اپنے ملک واپس جانا  
ہے۔“

بازار پر اندھیرا چھا رہا تھا اور دکانوں کے قفقے  
روشن ہو رہے تھے۔ آج لوگوں نے مغرب کے  
ساتھ ہی اپنے ٹھیلے نہیں سمیٹے تھے بلکہ وہ غلاموں کے  
آزاد ہونے کی خوشی میں خوش ہو رہے تھے۔  
”اور تم اپنے ملک کے بندھارا بن جاؤ گے یہ

لگتا ہے تمہیں؟“ ملکہ ٹیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی  
تھی۔

”مستقبل نہ میں دیکھ سکتا ہوں نہ آپ۔ اس  
لیے کوشش ہی کر سکتا ہوں۔“

ریش بڑھتا جا رہا تھا اور لوگوں کا شور بھی۔  
”میں ابھی بھی تمہارا سر قلم کروا سکتی ہوں۔“ وہ  
برہمی سے اس کو دیکھ کے بولی تو غلام مسکرا کے قریب  
آیا اور ملکہ کے کان میں سرگوشی کی۔

”یعنی آپ شہزادی تاشہ کو پھر سے غیر شادی  
شدہ بنا دیں گی؟ اور آپ کو کیا لگتا ہے۔۔۔ فارح بن  
راہزل مرنے سے پہلے اعلانیہ انداز میں لوگوں کو نہیں  
بتائے گا کہ چینی شہزادی ایک جادوگر کی بیٹی ہے؟ میں نے  
ان لوگوں کو آزاد کرایا ہے، ملکہ۔ یہ میرے احسان  
تسلے دے ہیں۔ یہ میرا یقین فوراً کر لیں گے۔“ پھر  
سیدھا ہوا تو دیکھا، ملکہ کا چہرہ غصے اور بے بسی سے تنمنا  
رہا تھا۔

”تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم جانتے تھے میں  
مراد راجہ کی تباہی کے لیے وہ جہاز دے رہی ہوں  
تمہیں اور تم نے مجھے غلط تاثر دیا۔ خیر۔ خوش تو تم بھی  
نہیں رہو گے اپنے ملک میں۔“ فارح نے کندھے  
اچکائے۔

”آپ اپنی فکر کریں، ملکہ۔ آگے آپ کو مراد  
راجہ سے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔“  
سر جھکا کے تعظیم پیش کی اور اگلے قدموں پیچھے  
ہٹنے لگا۔

”تم میرے دوست نہیں تھے اس لیے اب  
تمہیں تکلیف پہنچانے کے مجھے افسوس نہیں ہوگا۔“  
”آپ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔“

”نقصان نہیں۔ تکلیف کی بات کر رہی ہوں۔  
سوچو۔۔۔ اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی  
جب تمہیں معلوم ہوگا کہ۔۔۔۔۔ وہ بالآخر مسکرائی۔ چنے  
کے ہالے میں دمکیا اس کا چہرہ ذرا شانت ہوا۔  
”کہ؟“ فارح نے ابرو اٹھائی۔  
”کہ تمہاری بہن کا خون تمہارے بچوں کی



ماں کے ہاتھ پہ ہے؟“  
چند لمحوں کے لیے وقت بالکل ختم گیا۔ بازار میں بچتے شادیانے... بھانت بھانت کی بولیاں... سب ایسے خاموش ہوا جیسے لوگوں کی زبانیں چمن گئی ہوں۔

”بھورے بالوں والی عورت ہے نا تمہاری بیوی؟ آخری دفعہ پہاڑوں پہ تمہاری بہن کے ساتھ گئی تھی تو کانوں میں بڑے بڑے موتی پہن رکھے تھے؟ اور تمہاری بہن سفید گھیر دار لباس پہنے ہوئے تھی؟ اور اس کے اوپر پیلا لبادہ۔ اس بچی کے لیے جو جلا دیجیے گئے تھے وہ تمہاری بیوی نے بھیجے تھے وان فاح۔ ماضی جان لینا مستقبل جان لینے سے زیادہ بڑا عذاب ہے۔ ہے نا؟“  
ملکہ نے چنے کی ٹوپی آگے سر کاٹی اور مسکرا کر سر کو خم دیا۔

وان فاح وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔  
وہ جا چکی تھی اور وہ اس سے سڑ کے سوال بھی نہیں کر سکا تھا۔ اگر ملکہ جھوٹ بول رہی تھی تو اس کو ان کے لباس کا رنگ کیسے معلوم ہوا؟  
اگلے تین دن جب وہ ایڈم اور تالیہ کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا وہ بہت چپ چاپ سا تھا۔ ایڈم اور تالیہ کیا کہہ رہے تھے وہ نہیں سن رہا تھا۔ دماغ میں صرف ایک فقرہ گردش کر رہا تھا۔

”تمہاری بہن کا خون تمہارے بچوں کی ماں کے ہاتھ پہ ہے۔“ وہ بار بار سر جھٹکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ عصرہ ایسے نہیں کر سکتی۔ عصرہ کو تو آریانہ سے محبت تھی۔ مگر کیا واقعی؟

بہت سے واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ہر بات میں وہ آریانہ کو فوجیت دیتا تھا اور عصرہ پسپائی اختیار کر لیتی تھی۔ وہ جس پسپائی کو اس کا بڑا اپن سمجھتا تھا وہ اس کے اندر پھٹا زہر پھیلا پودا بن چکی تھی۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ جنگل میں تھے اور ایڈم اور تالیہ سوچکے تھے۔ وہ اپنے انہی خیالات کی رو میں جھٹکتا آگے نکل آیا۔

جنگل اندھیرا تھا اور گھنے درختوں کے باعث چاند دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ہاتھ میں مشعل لیے آگے چلا گیا۔ دفعتاً ایک درخت کے پاس رکا۔

وہ کوکو کا درخت تھا۔ اس کے پتوں کی خوشبو نے ایک دم چار ماہ قبل والا وہ دن یاد کروادیا جب اس نے تالیہ کی ساگرہ پہ اس کو پہل توڑ کے دیا تھا۔ ایک مغموم مسکراہٹ فاح کے لبوں پہ بکھر گئی۔ اس نے ایک پھل توڑا اور تالیہ کے پاس لے آیا۔ وہ اپنے بھینوں سے بنے جھولے پہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھا سوچتا رہا کہ اسے کیا کہے۔

وہ اس کو چھوڑنے جا رہا تھا اس لیے وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کی بیوی نے ہی اس کی بیٹی کو مارا ہے۔ اور ابھی تک وہ خود بھی یقین نہ تھا۔ لیکن اب دل کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اسے کسی کو تو بتانا تھا۔ کچھ تو بتانا تھا۔ دروازہ پار کرتے ہی وہ سب بھلا دے گا۔ کوئی تو اسے یاد کروانے والا ہونا چاہیے۔ یا اللہ... اس نے کیا قربان کر دیا؟ یادداشت کا سودا اس وقت اتنا مہنگا نہیں لگتا تھا لیکن اب.....؟

کوشش کے باوجود فاح بن راجزل اس رات تالیہ کو وہ سب نہیں بتا سکا۔ یہ بہت خطرناک راز تھا۔ مگر... اپنے زمانے میں واپس آنے کے بعد..... ذوالکفلی سے وقت کے تین سوالات سننے ہوئے اس کو احساس ہوا کہ اگر اسے اپنی یادداشت واپس چاہیے تھی تو اسے ”اپنے ساتھ“ موجود شخص سے بھلائی کرنی تھی۔ عصرہ اس کے لیے سب سے اہم شخص نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی قاتل کو اس کے لیے سب سے اہم شخص ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اگر اسے کسی کے ساتھ بھلائی کرنی تھی تو وہ تالیہ ہونی چاہیے۔ اگر وہ چلی گئی تو وہ بھی نہیں جان سکے گا کہ اس کی بیٹی کو عصرہ نے کیوں مارا تھا۔ کوئی تو ہونا چاہیے جو اس کے ساتھ تخلص ہو اور اسے یاد کروائے۔ خود غرضی ہے تو خود غرضی سہی مگر اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ تالیہ اسے بھول جائے۔

اس نے ایک سطر لکھ کے ذوالکفلی کے حوالے کی۔ وہ اسے ایڈم کو ای میل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ملک کا اگلا وزیر اعظم بنے جا رہا تھا اور یہ راز بہت خطرناک تھا۔

واپسی پہ اس نے ایڈم کو ای میل لکھی اور اسے ہر پختے تالیہ کے لیے کوکو پھل بھیجنے کی ہدایت کی۔ جب وہ ہر شے بھول چکا ہوگا تو وہ پھل تالیہ کو ان کی جنگل کی آخری گفتگو یاد دلائیں گے۔ اور وہ دوبارہ کبھی برائی کے راستے پہ نہیں جائے گی۔ صرف وہی اس کی مدد کر سکتی تھی۔

اسے تالیہ مراد سے محبت نہیں تھی۔ یہ بات وہ جانتا تھا۔ تالیہ کو اس سے محبت تھی۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اور ایڈم کو کس سے محبت تھی وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھا۔ پہلے وہ چاہتا تھا کہ تالیہ اور ایڈم اس سے الگ ہو کے اپنی نئی زندگی شروع کریں لیکن آریانہ نے جیسے پہلے ہی اس کی زندگی میں ہر ایک کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اب بھی وہی بازی لے گئی تھی۔

تالیہ کو اس کے ساتھ رہنا تھا اور اسے تالیہ کے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ چاہے وقت بیت جائے... چاہے یادیں کھو جائیں... چاہے چہروں کے نقاب بدل جائیں... انہیں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑنا تھا۔

☆☆☆

حالم کے جنگل کے اوپن کچن میں خاموشی چھائی تھی۔ داتن منہ کھولے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ ایڈم جہاں دنگ رہ گیا تھا وہیں شہزادی ناشہ کے اندر جاری ناشہ اور تالیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ اپنے دونوں چہروں کو تسلیم کر کے ایک دم شانت نظر آتی تھی۔

”عصرہ محمود نے آریانہ کو قتل کر دیا تھا۔“ اس نے دہرایا تو سنا نا ٹوٹا۔ داتن نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

”مگر عصرہ تو آریانہ سے سب سے زیادہ محبت کی دعوے دار تھی۔“

”اور کسی نے مجھے کہا تھا کہ مجھے بہت سے لوگ ملیں گے جن کی زبانیں دل فریب باتیں کہیں گی لیکن مجھے ان کو ان کے اعمال کی بنیاد پہ پرکھنا ہو گا۔“ تالیہ ٹیک لگائے اس کاغذ کو کترے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”عصرہ کی زبان جو بھی کہے اس کا مکمل ہمیشہ مختلف رہا ہے۔“

”مختلف کیسے؟“ داتن کو اچنبھا ہوا۔ تبھی ایڈم کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

”مرز عصرہ بظاہر آریانہ سے محبت کی دعوے دار تھیں لیکن آریانہ جس شخص کی بہن تھی انہوں نے اس شخص کو چھ سال تکلیف دیے رکھی۔ اگر انہیں واقعی آریانہ سے لگاؤ ہوتا تو فاح میں آریانہ کو ڈھونڈتیں اور ان کی تکلیف کا احساس کرتیں۔“

”اسی لیے عصرہ بیگم اس ملک سے بھاگنا چاہتی تھیں۔“ وہ انگلیوں کی پوروں سے کاغذ کو کتر لگا رہی تھی اور گول میز پہ بیٹھے دونوں افراد اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ”تاکہ ماضی کا گناہ کبھی سامنے نہ جائے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ آریانہ تو اس دن مر گئی تھی وہ ایک دم مطمئن ہو گئیں اور فرسٹ لیڈی بننے کے خواب دیکھنے لگیں۔“

”مگر... فاح صاحب کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ داتن نے اسے ٹوکا۔ اب وہ غور سے تالیہ کی آنکھوں میں بھرتے خنر کو دیکھ رہی تھی۔ فاح کے نام پہ خنر میں اضافہ ہوا۔

”وہ ہمیشہ سے خود غرض تھے۔“ تالیہ ایک دم جج کے بولی۔ ”ان کو یقیناً قدیم ملاک میں معلوم ہوا ہوگا یہ سب۔ نہ جانے کیسے۔ اور انہوں نے اس بات کو ہم سے چھپا لیا مگر جب وہ واپس آنے کے بعد ذوالکفلی سے ملے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے اور تالیہ تو ٹھہری کے ایل کی بہترین انویسٹی گیٹر (لجیٹیمیٹ ہو تو ایڈم نے بھی چوک کے اسے دیکھا۔) سو مجھے اپنی زندگی سے باندھ دیا تاکہ میں آریانہ کی موت کا راز کھوج کے انہیں یاد کر دے۔ خود غرض۔ خود غرض۔“



وہ۔“ اس نے کاغذ کو مروڑ کے زور سے زمین پر مارا۔  
 ”یہ خود غرضی نہیں ہے، چے تالیہ۔“ وہ نرمی سے  
 بولا۔ ”یہ محبت ہے۔ آریا نہ ان کی بیٹی تھی۔ انہوں  
 نے ہم دونوں کو واپسی کا راستہ دینے کے لیے وہ سب  
 بھول جانے کا انتخاب کیا تھا۔ تو کیا ہمارا فرض نہیں  
 بننا کہ ہم ان کی بیٹی کا قاتل ان کو یاد کروائیں؟“  
 داتن نے ٹھور کے ایڈم کو دیکھا مگر وہ تالیہ کی  
 طرف متوجہ تھا۔ تالیہ کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔  
 ”اب تک مجھے لگا تھا ان کو شاید مجھ سے کوئی  
 لگاؤ ہو... میری کوئی اہمیت ہو۔ مگر نہیں۔ انہوں نے  
 مجھے اپنے ساتھ صرف ضرورت کے لیے باندھا اور  
 میں نے..... میں نے ان کے لیے ہر شے داؤ پر لگا  
 دی۔ میں نے اپنا چہرہ بھی میڈیا کے سامنے عیاں کر  
 دیا جو کہ ایک اسکا مر کا چہرہ ہے۔ کسی نے مجھے پہچان  
 لیا، کسی نے تفتیش کی تو میرا کیا ہوگا؟“  
 ”بالکل۔ وہ ایک خود غرض انسان ہے اور....“  
 داتن نے زور و شور سے تاکید کرنی چاہی تو ایڈم نے  
 تیزی سے بات کاٹی۔  
 ”انہوں نے نہیں کہا تھا کہ آپ ان کی باڈی  
 دو من بنیں۔ ساتھ رہنے کے بہت طریقے ہوتے  
 ہیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی تھی۔ اور اب ان کو خود غرض  
 کہنا چھوڑ دیں، چے تالیہ۔ کیا انہوں نے ہمارے  
 لیے کچھ نہیں کیا؟ ہم اس دروازے کے بار آپ کے  
 خزانے کے لیے گئے تھے ان کی وجہ سے نہیں مگر یہ  
 ان کا پلان تھا جو ہمیں وہاں سے نکال کے لایا ہے۔  
 جنگل میں ہمیں ہمت دلانے والا اور ملاکہ میں ہمیں  
 سکھانے والا وان فارح تھا۔ انہوں نے ہمیں اپنا  
 بہترین ورژن بننا سکھایا ہے۔“  
 تالیہ نے شکوہ کنال نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”تم خود ہی تو کہتے تھے کہ جب وہ میرا ساتھ  
 چھوڑ دیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“  
 ”تب کہتا تھا جب وہ ساتھ چھوڑنے والے  
 تھے۔ جب نہیں چھوڑا تو کہنے کی وجہ نہیں رہی۔“  
 داتن نے میز کے نیچے سے ایڈم کے جوتے کو

پیر مارا مگر وہ متوجہ نہیں ہوا۔  
 ”وہ یہ سب مجھے براہ راست بھی بتا سکتے تھے۔  
 ایک ای میل کر دیتے۔ ایک خط لکھ دیتے۔ اتنی  
 پتیلیاں کیوں رکھیں؟“  
 ایڈم بن مجھ سو گواریت سے مسکرایا۔  
 ”وان فارح کب کوئی بات براہ راست کہتے  
 ہیں؟ وہ تو ہمیشہ کوئی کہانی سناتے ہیں۔ اپنا جواب  
 سننے والے کو خود بخود لاشا ہوتا ہے۔ اب بھی انہوں نے  
 ایک پتیلی چھوڑی تھی۔“ (دور پڑے ہوئے کاغذ کی  
 طرف اشارہ کیا۔) ”آپ جانتیں تو اس کو نہ مل  
 کرتیں۔ یہ آپ کی اپنی جاس تھی۔“  
 ”تو اب میں کیا کروں؟ ان کی انویسٹی کیئر  
 بن جاؤں؟“ وہ ٹرپ کے بولی۔ اسے بہت غصہ اور  
 بہت دکھ تھا۔ ”مجھے کیا ان کی بیٹی کو جس نے بھی مارا  
 وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“  
 ”مگر مسز عصرہ تو ہیں نا آپ کا مسئلہ۔ آپ کو وہ  
 بری لگتی ہیں اور آپ سے ان کا یہ نیا اچھا روپ بھی  
 ہضم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ ان  
 سے بیکس ہیں۔“  
 ”ایڈم....“ اس نے چھری اٹھائی تو وہ جلدی  
 سے بولا۔  
 ”آپ اس جیسی کو اپنی طاقت کیوں نہیں بنا  
 لیتیں؟“ (تالیہ نے دھیرے سے چھری واپس  
 رکھی۔)  
 ”تم چاہتے ہو میں عصرہ کو ایکسپوز کروں؟“  
 خفگی سے اسے دیکھا۔  
 ”میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ موجود  
 شخص کو بھلائی پہنچائیں۔ وہ شخص سب سے اہم ہے  
 اس کو بھلائی پہنچانا سب سے اہم ہے اور یہ کام  
 کرنے کا سب سے اہم وقت ابھی ہے۔ آپ یہ  
 کریں گی تو آپ کی یادداشت واپس آجائے گی۔“  
 وہ رساں سے سمجھا رہا تھا اور داتن دانت پیستے  
 ہوئے اسے گھور رہی تھی۔  
 ”میری یادداشت آدھی تو آئی چکی ہے اور باقی

معلوم کرنے میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔“  
 ”جو ہمیں معلوم ہوتا ہے چے تالیہ، وہ ہمیشہ  
 ہماری جان بچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی کہانی میں  
 ابھی بھی کچھ ایسا ہو جسے معلوم کرنا آپ کے لیے  
 ضروری ہو۔“  
 ”ہونہہ۔ مجھے نہیں یاد کرنا قدیم ملاکہ کو۔“  
 شہزادی نے نخوت سے سر جھٹکایا۔  
 ”ابھی تک آپ وان فارح کی مدد اس لیے کر  
 رہی تھیں کیونکہ آپ کو لگتا تھا وہ آپ کو ”اپنے لیے“  
 اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہوا  
 ہے کہ وہ آپ کو اپنی مدد کے لیے ساتھ رکھنا چاہتے  
 ہیں تو آپ خود غرضی دکھا کے ان کو چھوڑ دیں گی؟  
 جس شہزادی تاشہ کو میں جانتا ہوں، جس کے قصے میں  
 نے بگارا ملا یو میں لکھے تھے وہ خود غرض نہیں تھی۔“  
 ”ظاہر ہے۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھی اور  
 کندھے اچکائے۔ ”تم یہ نہیں کہو گے تو اور کون کہے  
 گا۔“ وہ کرسی دھکیل کے اٹھی اور سیز جیوں کی طرف  
 بڑھ گئی۔ وہ سارے یون کی تھکی ہاری آئی تھی یقیناً اب  
 فریش ہونے جا رہی تھی۔  
 اوپر اس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی  
 آواز آئی تو داتن غصے سے ایڈم کی طرف گھومی جواب  
 گردن جھٹکے ہوئے تھا۔  
 ”تم وان فارح کی اتنی حمایت کیوں کر رہے  
 تھے؟“ اداس نوجوان نے پلٹیں اٹھائیں اور  
 سو گواریت سے اسے دیکھا۔  
 ”میں سچ بول رہا تھا۔ ایک باپ کا اپنی بیٹی  
 کے قاتل کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ کرنا خود غرضی نہیں  
 ہوتی۔“  
 ”وہ بالآخر وان فارح سے متفر ہوئی تھی اور تم  
 اس موقع کو استعمال کر سکتے تھے۔ اف ایڈم اف۔“  
 داتن نے تمھیں سمجھیں۔ ”فارح سب بھلا چکا ہے وہ  
 اب بھی یقین نہیں کرے گا کہ عصرہ اس کی بیٹی کی  
 قاتل ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی اب صبح کر چکے  
 ہیں۔ تالیہ اپنی زندگی میں واپس آ سکتی ہے۔ تم اس کو  
 اس زندگی میں نہ دھکیلو جس میں تکلیف ہی تکلیف  
 ہے۔“  
 ”ان کو وان فارح سے محبت ہے۔ کسی کو  
 unlove کرنا آسان نہیں ہوتا داتن۔ آسان کیا  
 یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔“  
 ”مگر چھوڑا تو جا سکتا ہے نا۔ تم اسے فارح کو  
 چھوڑنے دیتے۔ یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“  
 ”کیونکہ میں سچا انسان رہنا چاہتا ہوں  
 داتن۔“ وہ نرمی مسکراہٹ سے بولا۔ ”اور سچا انسان  
 خوشی اور غمی دونوں حالتوں میں سچ بولتا ہے۔ میں  
 نے فارح صاحب کی حمایت نہیں کی۔ میں نے صرف  
 سچ بولا ہے۔“  
 وہ اٹھ کھڑا ہوا تو داتن نے دیکھا کہ اس کے  
 کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرے پہ بے پناہ  
 تکلیف تھی۔  
 ”تم جانتے ہو تمہارا یہ سچ اسے عصرہ کو فارح کی  
 زندگی سے نکالنے اور اپنی جگہ حاصل کرنے کی  
 امید تھا وہ گا اور تمہاری تکلیف بڑھ جائے گی۔“  
 ”اللہ نے سچائی کے ساتھ فوری راحت کا وعدہ  
 کیا بھی نہیں ہے۔ سچائی میں بھٹا ہے کامیابی ہے دل  
 کا سکون ہے مگر ضروری نہیں ہے کہ اس میں خوشی بھی  
 ہو۔ سچائی قیمتی چیز ہے اور قیمتی چیزوں کے لیے  
 تکلیفیں بھیننی پڑتی ہیں۔“  
 وہ یہ کہہ کے آگے بڑھا اور زمین پر گرا کاغذ  
 اٹھایا۔ کھول کے اسے سیدھا کیا اور جیب میں ڈال  
 دیا۔  
 ”جو میں نے ملاکہ میں سیکھا ہے، میں اسے  
 بھلانا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے یاد کروانے والا کوئی نہیں  
 آئے گا۔“  
 ”اور کیا وان فارح نے خود بھی ملاکہ میں کچھ  
 سیکھا تھا؟“ وہ تندی سے بولی۔  
 ”بالکل۔ مگر انہیں تب بھی یہ معلوم نہیں تھا  
 جب ان کی یادیں ان کے پاس تھیں اور نہ اب معلوم  
 ہے۔“ وہ داتن کو دیکھے بغیر باہر کی طرف بڑھ گیا۔



حالم کا بھگد اب خاموش تھا اور ایڈم سامنے سڑک پہ چلتا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے تھے اور چہرہ غمگین تھا۔

داتن نے اتنے دن سے اس کے اندر ناممکن کی امید چکا دی تھی۔ مورخ کو شہزادی مل سکتی تھی۔ اگر مورخ شاہی قبائکین لے اور دربار میں اعلا عہدہ حاصل کر لے تو وہ شہزادی کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن جانے کیوں شہزادیوں کو صرف غلام ہی پسند آتے تھے۔

اس کا بہت مشکل سے تندرست ہوتا دل ایک دفعہ پھر سے بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ساری دنیا بھی پھر لے لیا سارے زمانے کی کتابیں پڑھ لے اسے تالیہ مراد جیسی لڑکی بھی نہیں ملے گی۔

تالیہ مراد سے زندگی میں آپ ایک دفعہ ہی ملتے ہیں اور پھر اس جیسی محبت دوبارہ کسی سے نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

تالیہ مراد اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ سنہری بال اب کھول کے شانوں پہ پھیلا رکھے تھے اور جیتی نظریں اپنے عکس پہ جمی تھیں۔ مدھم لیب کے باعث کمرہ نیم اندھیر سا تھا۔ وہ عکس کو دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے پردے پہ وہ سارے لمحے چل رہے تھے جب وہ عصرہ سے پہلی دفعہ ملی۔۔۔۔۔ وہ فارج کو لے کر اس ملک سے جانے کے لیے کئی بے چین تھی۔ اس نے تالیہ کو فائل والے قصبے میں پھنسانے کی بھی کوشش کی اور اب جب وہ ایک دم اچھی ہو گئی تو کیا تھا جو تالیہ مراد کو اس سے بے زار کر رہا تھا؟ شاید وہ اب خود بخود بولنے لگی تھی اور سچے لوگوں کو قدرت کی طرف سے یہ رعایت مل جاتی ہے کہ انہیں جھوٹوں کے جھوٹ ہضم نہیں ہوتے۔

”عصرہ محمود۔۔۔ تم نے ایک پیاری سی بچی کو کیوں مارا؟ تم اصل میں کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیا

مجھے تمہارے پیچھے آنا چاہیے یا وہاں فارج کو اس کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیے؟“

اس نے سنگھار میز پہ رکھا فون اٹھایا اور اسکرین روشن کی تو ذوالکفلی کا پیغام بگمگا رہا تھا۔

”وہاں فارج کی بلاداشت سے چند قطرے کم ہوئے ہیں۔ اسے ابھی کچھ یاد نہیں آئے گا سوائے ٹوٹے خیالوں اور بکھرے خوابوں کی صورت کے۔ چٹاؤ کا اختیار اب بھی تمہارے پاس ہے پتھر کی تالیہ۔

تم اس بوتل کو تلف کر کے اس کے ذہن کی تختی کو صاف کر سکتی ہو۔ کیونکہ جیسے جیسے اسے اگلے سوالوں کے جواب ملیں گے اس کی تکلیف بڑھتی جائے گی۔ تمہاری تکلیف اور تمہارے خوابوں نے تمہیں دیوانہ کر کے قدیم لامکہ میں پہنچا دیا تھا۔ سوچو اس کے خواب اس کے ساتھ کیا کریں گے؟“

اس نے دھیرے سے فون رکھ دیا۔ پھر پلکیں اٹھا کے اپنے عکس کو اجنبیت سے دیکھا۔

اسے اپنی خواب دیکھنے کی صلاحیت واپس کب ملی تھی؟ جب اس نے سات برس پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو بھلا کے اس شخص کو اہم جانے کی جواب اس کے ساتھ ہے۔ اس کا شوہر۔

سات برس اس کے خواب اسے چابی کا راستہ دکھاتے رہے تھے اور ماضی کے وہ چند کڑے جو اس کو آج تک دکھائی دیے تھے وہ انیر پوٹ پہ کیے اس ایک فیصلے کا نتیجہ تھے۔

اس کا کیا مطلب تھا؟

یہی کہ تالیہ مراد نے آج تک مکمل طور پہ ان تین سوالوں کے جواب نہیں پائے تھے۔ اور آج اسے ان کو مانا تھا۔

لیب کی مدھم زرد روشنی کمرے میں بکھری تھی اور شہزادی اسٹول پہ بیٹھی اپنے عکس کو تنگ جا رہی تھی۔

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟

انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام کون سا

ہونا چاہیے؟

”تم خود سب سے اہم ہوتا تالیہ۔“ اندر سے کسی نے جھجھوڑا۔ ”تمہیں وہاں فارج کو چھوڑ کے کچھ عرصہ انڈر گراؤنڈ چلے جانا چاہیے یا کسی دوسرے ملک۔

تمہارے خلاف فتنش شروع ہو چکی ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے تالیہ۔“

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم شخص کون ہونا چاہیے؟)

اس نے فون اٹھایا اور کال ملا کے اسپیکر آن کیا۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھتی، موبائل ہتھیلی پہ اٹھائے ہوئی۔

”میں ان یادداشتوں کو تلف کر کے یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ مجھے ان سے ہزار گلیے ہیں ذوالکفلی، مگر جس شخص سے وفاداری کا عہد کیا تھا جس کی یمنون مجھ پہ اٹھ کر رہی ہے میں انکیشن سے پہلے ان کو چھوڑ جاؤں؟ ہرگز نہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑوں گی۔ وہ میرے لیے اس وقت سب سے اہم ہیں۔ خود سے بھی زیادہ۔“

(انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام کون سا ہوتا ہے؟)

”پتھر تالیہ۔۔۔ اس کے ساتھ رہنا تمہارے اوپر مصیبتیں لاسکتا ہے۔“ وہ فکر مند تھا یا شاید بن رہا تھا۔

”تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ اور اس وقت اپنے ساتھ موجود شخص کو بھلائی پہنچانا میرے لیے سب سے اہم ہے۔“ وہ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے تکلیف سے بولی۔ نگاہوں کے سامنے اپنی تمام شناختیں، تمام چہرے، حلیے اور چوریاں گھوم گئیں۔ اگر فتنش کرنے والوں نے پیچھا نہ چھوڑا تو۔۔۔؟

مگر اس نے سر جھٹک دیا۔

”میں تمہارے لیے فکر مند ہوں تالیہ۔ تم اس

کی یادداشتیں تلف نہ کرو مگر ابھی انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ۔ وہ وزیر اعظم بن جائے دس ماہ یا سال کے اندر اندر تم واپس آ جانا اور اس کی مدد کرنا۔“

(انسان کی زندگی میں کسی بھی کام کا سب سے اہم وقت کون سا ہوتا ہے؟)

”نہیں ذوالکفلی۔“ شہزادی نے خود کو دیکھتے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ ”جو کرنا ہے“ ابھی“ کرنا ہے۔“

”تالیہ۔۔۔۔۔“ وہ جیسے غمگین ہوا۔ ”کاش تم نے اپنے تینوں سوالوں کے جواب نہ حاصل کیے ہوتے۔ تم نے اپنی زندگی مزید مشکل بنا دی ہے۔“

”میرے ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کو یاد کرنے سے مجھے فرق پڑے یا وہ مجھے پہلے سے معلوم نہ ہو۔ میری فکر مت کریں۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کے فون رکھ دیا۔ پھر برش اٹھا کے آہستہ آہستہ بالوں میں پھیرنے لگی۔

ویسے بھی ایک بچی کے بچپن کے چند فراموش کردہ سالوں میں ایسا کیا ہو سکتا تھا جواب اس کی زندگی پہ اثر انداز ہو؟ وہ اتنی دور نکل آئی تھی کہ اب اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

یہ تالیہ محبت مراد کی خوش فہمی کی آخری رات تھی۔

☆☆☆

فارج کی آنکھ فجر کے قریب ایک جھلکے سے کھلی۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو

ماؤف ہوئے ذہن سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ اپنے گھر کے ماسٹر بیڈ روم میں۔ اسے کی کھنڈ میں۔۔۔۔۔ بے خبر سوئی عصرہ کے قریب۔ اس نے گہری سانس لی۔

تو وہ سب خواب تھا مگر عجیب سا خواب تھا۔ اس نے خود کو جنگل میں دیکھا تھا۔ جس اور گرمی میں پسینے سے شرابور۔۔۔۔۔ درختوں کے درمیان ایک گھنٹوں کے بل زمین پہ بیٹھی روٹی ہوئی لڑکی۔۔۔۔۔ سنہرے بال۔ کچھڑا لود پڑے۔۔۔۔۔ وہ اسے



کہتا ہے کوئی خواہش کرو اور وہ کہتی ہے کہ اسے چاکلیٹ کھانی ہے تب وہ اسے وہ پھل دیتا ہے۔ اس پھل کی خوشبو اسے اب تک محسوس ہو رہی تھی۔ اور جنگل کی گری بھی۔

وہ ہاتھ روم میں آیا اور آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے چہرے پہ بانی ڈالا۔ خواب ابھی تک ذہن میں تازہ تھا۔ وہ گڑی تالیہ تھی اور وہ پھل... پھل نہ جانے کون سا تھا۔ مگر وہ اپنی چیف آف اسٹاف کو خواب میں کسی مہنگی ورلڈ میں کیوں دیکھ رہا تھا؟ یا اللہ! کیا یہ بڑھتی عمر کا اثر تھا یا ایک خوبصورت عورت کے ساتھ کام کرنے کا نقصان؟

اس نے سر جھکا اور زور سے تولیے سے چہرہ رگڑا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ اس خواب کا نشان کوئی اس کے چہرے پہ نہ دیکھ لے۔

صبح ناشتے کی میز پہ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس پلیٹ کی طرف متوجہ تھا اور عصرہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوڑا باندھے کانوں میں موتی پہنے نیلے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ خود بھی نہیں جانے کے لیے تیار لگی تھی۔ آج کل اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔

”تم نیند میں ڈسٹرب لگ رہے تھے۔“ دفعتاً اس نے تریوڑ کا شربت گلاس میں اٹھیلے ہوئے غور سے وال فارج کو دیکھا۔

اس نے پلیٹ پہ جھکے چہرے کاٹنے سے انڈا توڑتے ہوئے شانے اچکائے۔

”اچھا... مجھے پتا نہیں چلا۔“ (ہاں تمہیں پتا نہیں چلا کہ تم نیند میں ”میک یوروش تالیہ“ بڑبڑا رہے تھے؟) اس نے اندر ہی اندر مل کھاتے سو جا کر بظاہر مسکرائی۔

”مجھے لگا کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔“

”مجھے کھلی آنکھوں والے خوابوں کی عادت ہے۔“ مسکرا کے شانے اچکائے تو عصرہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

بچے اسکول جا چکے تھے اس لیے وہ دونوں ناشتے کی طویل میز پہ تنہا بیٹھے تھے۔ ملازم ناشتہ لگا کے ہٹ چکے تھے۔ کھڑکی سے باہر اس کی کار کے ساتھ ڈرائیور قمر (جو ادھا باڈی مین بھی تھا) اور گارڈز کھڑے نظر آتے تھے۔

”تالیہ آج نہیں آئی۔ وہ اب اکثر نہیں آتی۔“ عصرہ نے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کان کے موتی پہ انگلی پھیرتے پوچھا۔

”اشعر ناشتہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ میں نے کل اسے کہا کہ وہ اس سے بات کر لے۔“ اس نے صرف تالیہ کا نام سنا تو جیسے بتانا یاد آیا۔

”اس کا نام تالیہ ہے فارج... اور وہ تو شادی شدہ ہے۔ نہیں؟“ قمر سے یاد دلایا۔

”اس نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ اس کی شادی ختم ہونے والی ہے۔“

”چلو اچھا ہے کہ وہ اپنے مسئلے بتاتی رہتی ہے۔ اچھے لوگوں کو ایک دوسرے کا یونہی خیال رکھنا چاہیے۔“

مسکرا کے سادگی سے کہہ رہی تھی۔ فارج اب ٹپکلیں سے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پلیٹ پہ تھیں اور عصرہ کی چپتی نظریں اس کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

”میرا فون چارج ہو گیا ہو تو لے آؤ۔“ وہ کرسی دھکیل کے اٹھا اور کوٹ پہنتے ہوئے یاد دلایا۔ عصرہ کی بات کو نظر انداز کیا۔ مگر وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی گردن میں کئی سی ابھر کے معدوم ہوئی تھی۔ کوئی تو چور تھا وال فارج کے دل میں۔

وہ اندر آئی اور اس کا فون بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اٹھایا۔ چارجر بن ٹکالی تو اسکرین روشن ہوئی۔ عصرہ نے لمحے بھر کو سوچا پھر گول بن دیا۔ برانا پاسورڈ درج کیا۔ 2580۔ اوپر سے نیچے قطاری صورت۔ مگر فون نے کھلنے سے انکار کر دیا۔

”تم نے پاسورڈ بدل دیا ہے فون کا؟ مجھے کال کرنے کے لیے کھولنا پڑا تو کھلا نہیں۔“

”پتا نہیں۔ تاشہ پاسورڈز بدلتی رہتی ہے اور اپنی وائرس ڈالتی رہتی ہے تاکہ فون ہیک نہ ہو۔ میں تو فنٹر پرنٹ سے کھولتا ہوں۔“ اس نے سرسری سا کہتے ہوئے فون لیا اور لا پرواہی سے جیب میں ڈالتا۔

کوٹ کی نادیہ سلوٹس درست کرتا آگے بڑھ گیا۔ عصرہ طنز پر مسکرا دی۔

اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی دروازہ بند کیا اور غصے سے کلب کوچ کے دیوار پہ مارا۔ سارے بال آبشار کی طرح کمر پہ گرتے چلے گئے۔

”تاشہ... تاشہ... تاشہ...“ اس نے دونوں منھیاں کشیوں پہ رکھ لیں اور دبی آواز میں چلائی۔

”میری آدمی عمر آریانہ آریانہ سنتے بیت گئی اور اب یہ تاشہ...“

دیوار پہ لگے بیضوی آئینے میں وہ غصی و غضب کی تصویر بنی نظر آ رہی تھی۔

”وہ سمجھتا ہے کہ تالیہ اور اس کے درمیان جو بھی چل رہا ہے وہ میرے سامنے اپنا ”ایماندار اور سچا“ ایجنڈا قائم رکھے گا؟ وہ سمجھتا ہے کہ میں بے وقوف ہوں؟“

وہ قدم قدم چلتی قریب آئی اور اپنے عکس کو دیکھا۔ جیسے آنکھوں نے کاہل کو پھیل دیا تھا اور بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ اس نے کلینزر کی بوتل پوروں پہ اٹھائی اور پھر اسے آنکھوں تلے لگایا۔

”فارج راحل... میں تمہارا پردہ چاک کر کے دکھاؤں گی۔ بس اس الیکشن کو گزر جانے دو۔“ وہ ٹشو سے اب آنکھ کے کنارے صاف کر رہی تھی۔

”میں بے وقوف عورتوں کی طرح روز روز تم پہ شک نہیں کروں گی۔ میں ثبوت کے ساتھ ایک ہی دفعہ تمہیں شرمندہ کروں گی۔ تب تک جتنے تعلقات نبھانے ہیں تالیہ مراد سے بجاہ لو۔“ رگڑ کے کاہل صاف کیا تو آنکھیں سرخ پڑنے لگیں۔

”اور تالیہ مراد... میں نے تمہیں سمجھنے میں دیر

کر دی۔“ وہ اب سنبھلے ہوئے انداز میں بالوں کو واپس لپیٹ رہی تھی۔

”میں نے تمہیں اپنی دوست بنایا تاکہ تم اشعر کی زندگی کی ساسی بن سکو گین تم تو میرے ہی ساسی کے پیچھے پڑ گئیں۔ میری نظروں سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یاد رکھنا فارج صرف عصرہ کا رہے گا۔ اگر نہیں تو پھر کسی کا نہیں ہو سکے گا۔“

اس نے کس کے جوڑا بنایا پھر چہرے پہ میک اپ فکس کر لیا اور مسکرائی۔ خوبصورت سیاسی بیوی کی رکی مسکراہٹ۔ اور پرس اٹھالیا۔

وہ آج پھر ایک جگہ مدعو تھی اور اسے اپنے اس کردار کو بخوبی سمجھنا تھا۔

وال فارج کے لیے نہیں۔ خود اپنے لیے۔

☆☆☆

لفٹ اوپر کی طرف گامزن تھی۔ بارین نیشل کا آفس چند منزلیں دور رہ گیا تھا۔ اندر تنہا کھڑی تالیہ منزلوں کے بدلتے نمبرز دیکھ رہی تھی۔ اسے لائن فیکس کے اوپر اس نے سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کی مانگ نکال کے پونی بنا رکھی تھی۔ چہرہ مطمئن اور پرسکون تھا۔ وہ اچھی نیند لے کر اٹھی تھی اور کسی خواب کی یادداشت نے اسے نہیں ستایا تھا۔

لفٹ کے دروازے کھلے تو اس نے آفس کی لابی میں قدم رکھا۔ سامنے ریسیپشن ڈیسک پہ اس کی جانب پشت کے کھڑا اشعر ریسیپشنسٹ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کسی خیال کے تحت مزاح تو تالیہ نے نظر پڑی۔

وہ بھی اس کے عین سامنے آ کے رک گئی۔ نظریں اس کی گردن پہ لگے کٹ پہ ٹھہر گئیں۔ پھر اس کے چہرے کو دیکھا۔

اشعر محمود کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے راستہ دینے کے لیے ہٹ گیا تو وہ آگے بڑھ گئی۔ اشعر بھی پیچھے آیا۔ وہ یقیناً اپنے آفس جا رہا تھا۔

تالیہ آگے چلتی اس کے ہی آفس کے دروازے پہ جاری اور پھر اس کی طرف گھوی۔ وہ



چونکا۔

”کل رات کے لیے سوری اٹھیں۔“ وہ مصاحبت مگر سنجیدہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اتنی جارحیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

وہ دونوں اس کے آفس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور فی الوقت راہداری میں کوئی نہ تھا۔

”بالکل۔ آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا مگر....“ وہ اس کی معذرت پر متعجب ہوا تھا۔ ”آپ کا غصہ فطری تھا۔“

”خیر... اب وہ معاملہ سٹیل ہو چکا ہے۔ میں نے عصر سے بات کر لی تھی۔ وہ بھی اپنے عمل پر شرمندہ تھے۔ ان کو افسوس ہے کہ انہوں نے آپ سے ایسا کام کیوں کروایا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

اشعر نے گہری سانس بھری۔

”ان کا قصور نہیں ہے، وہ صرف....“

”قصور آپ دونوں کا ہے، ایش۔“ مجھے گلہ صرف یہ ہے کہ آپ لوگ ڈائریکٹ صوفیہ رحمن کے پاس چلے گئے۔ اگر آپ کو مجھ سے مسئلہ تھا تو آپ میرے پاس آتے، ایک دفعہ تو مجھ سے کہتے کہ تالیہ تم یہ جاب چھوڑ دو، ہم تمہیں اسے ارد گرد برداشت نہیں کر سکتے۔ کہہ کے تو دیکھتے۔“ وہ دکھ سے بولی تو اشعر نے مزید تعجب سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے یہ کہتا تو آپ کیا کرتیں؟“

”میں کیا کرتی؟“ وہ دو قدم آگے آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”میں آپ کی شہرگ پہنچ رہی تھی کہ تالیہ مراد اس آفس سے کہیں نہیں جاری اور اگر کسی نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو وہ جان سے جائے گا۔“ پھر اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا۔ ”مگر اس کے لیے سوری۔“

اشعر کا تعجب عفا ہوا۔ لبوں پہ زخمی مسکراہٹ در آئی۔ لمبے بھر کو اس کا معذرت خواہانہ انداز دیکھ کے

اسے عجیب سا لگتا تھا مگر تالیہ ویسی ہی تھی، جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ دیکھ کے اچھا لگتا تھا۔

وہ آگے بڑھ گئی تو اس نے بشارت سے پکارا۔

”کانفرنس روم میں آجائے، بچے تالیہ۔“

پہنچنے والے ہیں۔ ایک ضروری امر زیر غور ہے۔“

وہ مڑی نہیں، بس سر ہلا کے آگے چلتی گئی۔

☆☆☆

سو پ پارلر اس صبح قدرے دیران بڑا تھا کیونکہ ”لئے“ دیر سے بیدار ہونے والی قوم تھی اور ایسی جگہوں پر رش دوپہر کے بعد ہی بڑھتا تھا۔ فی الوقت میزیں خالی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں ریسپشنسٹ ہو یا موپ لگا تا لڑکا، سب کن آنکھوں سے درمیانی میز پر بیٹھے بوڑھے شیف کو نو وارد آدمیوں سے بات کرتے دیکھ رہے تھے۔

پراسیکیوٹر احمد نظام آگے کو جھکے شیف کی آنکھوں کو پڑھ رہے تھے اور ساتھ بیٹھا انویسٹی گیٹر باری باری دونوں کو دیکھتا تھا۔

بوڑھا شیف ہاتھ میں پکڑی اٹاراج تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ لڑکی.... آپ پوچھ رہے ہیں کہ یہ ہمارے پاس کام کرتی تھی یا نہیں؟“

”میں کورٹ سے ایک آرڈر لا کے آپ کے ریسٹوران کے ارد گرد تمام دکانوں کے سی سی ٹی وی فوٹیج نکلاوا سکتا ہوں، شیف صاحب۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے پوچھ لوں تاکہ....“

”تو پوچھیے نا۔“ شیف نے مسکرا کے تصویر واپس رکھی اور پیچھے کوہو کے بیٹھا۔

”یہ لڑکی تالیہ مراد اس ریسٹوران میں جاب کرتی تھی کیا؟“ پراسیکیوٹر نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھا۔

”جی۔ بالکل۔ اس نے چند ماہ یہاں جاب کی تھی۔ کیا آپ کو کاغذی ثبوت بھی فراہم کر دوں؟“

شیف کا جواب پراسیکیوٹر کے لیے غیر متوقع تھا۔ انہوں نے چونک کے انویسٹی گیٹر کو دیکھا۔ وہ

بھی سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

”بالکل۔ مجھے تمام ڈینا چاہیے۔ ایک ایک چیز۔“

”میں ہر چیز نکال لاتا ہوں۔ اور ہاں.... وہ اس ریسٹوران کے علاوہ تنگو کامل کے گھر بھی کام کرتی تھی۔ ان سے واقف ہیں آپ؟ وہ ان کی ملازمہ تھی۔“

”نہیں۔ ان کا کوئی ایڈریس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟“ پراسیکیوٹر احمد نظام بالکل سیدھے ہو چکے تھے۔ ان کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

”بالکل ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔“ شیف سادگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

ریسپشنسٹ سوچر ڈیوٹر سب کن آنکھوں سے ان افراد کو دیکھ رہے تھے جو اب دبی دبی پر جوش سرگوشیوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ بالآخر ان کے ہاتھ ایک محسوس ثبوت لگا تھا۔

☆☆☆

کانفرنس روم میں اس وقت محض وہ تینوں موجود تھے۔ فاتح کھڑا دیوار پر نصب اسکرین کو دیکھ رہا تھا جبکہ تالیہ اور اشعر اس کے دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آفس کی ایک مصروف فوج کا آغاز ہو چکا تھا اور اسکرین پر حاکمی کو دکھایا جا رہا تھا۔

حاکمی درمیانے قدر والا سیاستدان تھا جو پارٹی انتخابات میں وان فاتح کا مخالف امیدوار تھا۔

بارین شیشل کے صدر کے لیے ہر پانچ سال بعد الیکشن (چناؤ) منعقد کیا جاتا تھا۔ جو محض صدر بننا پارٹی کی حکومت آنے پر اسی کو وزیر اعظم بنایا جاتا تھا۔ چونکہ پارٹی اس وقت اپوزیشن میں تھی اس لیے سرکاری ٹی وی چینل ٹی این کے انتخابات کی کوریج نہیں کرتے تھے۔ یہ انتخابات عام انتخابات کی طرح پولنگ اسٹیشنز پر بیٹل پیپر کے ذریعے نہیں ہوتے تھے بلکہ اس میں صرف ان ڈھائی لاکھ لوگوں نے حصہ لیا تھا جو پارٹی کے ممبرز تھے۔

ایکشن والے دن ان ممبرز نے اپنے فون سے

پارٹی کی ویب سائٹ پر جا کے اپنا شناختی کارڈ نمبر درج کر کے کسی ایک امیدوار کو ووٹ دینا تھا۔ چونکہ یہ انتخاب سوشل میڈیا کے ذریعے ہوتا تھا، اس لیے اس کی ساری مہم بھی سوشل میڈیا پر چلائی جا رہی تھی۔ اس وقت اسکرین پر ان کے سامنے حاکمی کے فیس بک پیج پر اپ لوڈ کی گئی ایک ویڈیو دکھائی جا رہی تھی جس میں حاکمی اور اس کی بیوی امپرن پہنے کسی مسجد کے باہر گھاسا پہ کھڑے چاول پلیٹوں میں بھر بھر کے بچوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ یہ کسی چیرینی ایونٹ کی ویڈیو تھی جس میں (بقول رپورٹ کے) وہ میاں بیوی باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ کیونٹی سرورس کی اس خوبصورت مثال کو وہاں جھوم میں کھڑے۔ لوگ سراہ رہے تھے۔ باری باری تقسیم نئے اپنا پیالہ لاتے اور سیاستدان صاحب مسکرا کے اس کو چاؤلوں سے بھر دیتے۔

ہرگز رتے بچے کے ساتھ وان فاتح کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اشعر نے ریموٹ اٹھا کے اسکرین بھجائی اور کرسی فاتح کی طرف گھمائی جو ناخوش لگ رہا تھا۔

”حاکمی ابھی یتیم خانوں کا دورہ نہیں کرتا۔ میں اسے جانتا ہوں۔“

”ہم سب اسے جانتے ہیں، آجنگ۔ مگر آپ کی چائے والی ویڈیو اتنی مشہور ہوئی کہ حاکمی کو یہ اسٹنٹ کرنا پڑا۔“

”یعنی حاکمی نے ہماری نقل کی ہے۔ واؤ۔“ وہ سر جھٹک کے بولی تو فاتح نے نظروں کا رخ پھیر کے اسے دیکھا۔ وہ سنہرے بالوں کی بیچ کی ماگ نکال کے پونی بنائے سیاہ کوٹ میں سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صبح دیکھا گیا خواب ابھرا۔ کچھڑا اور سرخ مٹی سے لت پت چہرے والی تالیہ جسے وہ جھٹک کے کہہ رہا تھا۔

”کوئی خواہش کرو۔“

اس پھل کی خوشبو ابھی تک اس کے تھنوں میں محسوس ہوتی تھی....



فاریح نے سر جھٹکا اور مینگ پتہ توجہ دی۔  
 تالیہ کہہ رہی تھی۔ ”اور اب حاکمی کی ویڈیو بھی  
 مشہور ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا پر لوگ اچھی چیز کم  
 اور مشہور چیز زیادہ دیکھتے ہیں۔“  
 ”ہاں تو ٹھیک ہے۔“ اشعر نے ہاتھ  
 جھاڑے۔ ”ہم کوئی نیا اسٹنٹ کر لیتے ہیں جو اس  
 ویڈیو کو باند کر دے۔“  
 مگر فاریح نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ دونوں  
 پہلوؤں پر ہاتھ جمائے کھڑا وہ اکتایا ہوا لگتا تھا۔  
 ”کسی کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے کاٹنا  
 ضروری نہیں ہوتا۔ اس سے بڑی لکیر لگانی پڑتی  
 ہے۔ اس سے مقابلے کے بجائے اس سے بہتر کام  
 کرنے کی کوشش کرو۔“ وہ ناخوشی سے کہہ کے مڑا اور  
 دروازے سے باہر نکل گیا۔  
 اشعر نے بے اختیار تالیہ کو دیکھا۔  
 ”میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ ہم اس سے بہتر  
 اسٹنٹ کر سکتے ہیں۔“  
 وہ سر جھٹکے فولڈر میں کاغذات ڈالنے لگی۔  
 ”ان کو اسٹنٹ کرنا پسند نہیں ہے۔ ہم ان کی مرضی  
 کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“  
 ”چائے کا اسٹال بھی تو ہم نے ان کو بغیر  
 بتائے منتخب کیا تھا؟ تالیہ۔“  
 ”جب ہم ٹیم تھے اور ہم میں سے کسی ایک نے  
 دوسرے سے غداری کی کوشش نہیں کی تھی۔“  
 کھٹکاک سے فولڈر بند کیا اور جی کے بولی۔  
 ”وان فاریح نے مجھے کہا تھا کہ اگر میں آپ  
 سے بہتر تعلقات کا خواہاں ہوں تو مجھے آپ سے بچ  
 بول کے تمام معاملات درست کر لینے چاہئیں۔ پہلی  
 دفعہ میں نے ان کی نصیحت مانی اور اس کا نقصان ہی  
 ہوا۔“ وہ ہوا۔  
 (بہتر تعلقات؟) وہ لمبے عرصے کوں رہ گئی۔ اشعر  
 نے پہلی دفعہ اتنے ڈائریکٹ انداز میں بات کی  
 تھی۔ تو کیا وہ اور فاریح اسے ڈسکس کرتے رہے  
 تھے؟

”یہ نصیحت آپ کو وان فاریح نے کی تھی؟“ اس  
 کے گال سرخ ہوئے۔  
 ”بالکل۔ آپ ان سے کفرم کر لیجیے۔“ وہ تلخی  
 سے کہہ کے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔  
 باہر نکلا تو فاریح راہداری میں جا رہا تھا۔ ساتھ  
 ہی فون پر کچھ ٹائپ بھی کر رہا تھا۔ کن اکھیوں سے  
 اسے آتے دیکھا تو سرسری سا پوچھا۔  
 ”تم نے ناشہ سے اپنے معاملات درست کر  
 لیے؟“  
 ”نہیں۔ مزید بگڑ گئے ہیں۔ اب وہ میری شکل  
 بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“  
 اشعر کڑواہٹ سے کہہ کے آگے بڑھ گیا تو وہ  
 چونک کے اسے جاتے دیکھنے لگا۔  
 صبح تک اسے لگا تھا کہ اشعر اور تالیہ کا ایک  
 ہونا ”ممکن“ ہے مگر یہاں تو.....؟  
 خیر..... اسے دکھ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔  
 محض شانے اچکائے اور اپنے آفس کی طرف بڑھ  
 گیا۔  
 دروازے پر وہ ٹھہرا۔ تالیہ کی میز کرسی اس کے  
 آفس کے باہر چھٹی تھی اور اس پر اس کی چیزیں رکھی  
 تھیں۔  
 وہاں کوئی مانوس خوشبو اس کے نتھوں سے  
 نکرائی تھی۔ چونک کے میز کو دیکھا جس پر ایک چھوٹی  
 ٹوکری میں تین کوکو فروٹ رکھے تھے۔  
 کسی سحر زدہ لمحے کے زیر اثر فاریح نے ہاتھ  
 بڑھایا اور ایک چھل اٹھایا۔ اس چھل کی کھروری جلد  
 رنگ..... سب وہی تھا۔  
 ”کھائیں گے؟“ تالیہ کی آواز پر چونکا۔  
 وہ ہال کی چوکھٹ پر کھڑی مسکرائے اسے دیکھ  
 رہی تھی۔ فاریح نے انہوں کہتے ہوئے آہستہ سے  
 چھل رکھ دیا۔  
 ”یہ وہی چھل ہے نا جو تمہارا شوہر تمہیں بھیجتا  
 ہے۔“ سرسری سا پوچھا۔  
 وہ آگے آئی اور اپنی چیزیں میز پر رکھیں۔ پھر

ان کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ سر جھٹکانے سے سنہری  
 پونی دائیں بائیں جھولنے لگی تھی۔  
 ”جی۔ اسے لگتا ہے مجھے یہ بہت پسند ہیں۔“  
 ”تو نہیں پسند کیا؟“  
 تالیہ نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”ہر چیز  
 کا ایک وقت ہوتا ہے جس میں وہ اچھی لگتی ہے۔ بار  
 بار ہرانے سے وہ اپنا اثر کھودیتی ہے۔ مجھے یہ پھل  
 صرف تب اچھا لگا تھا جب..... خیر۔“ اس نے سر  
 جھٹکا۔ جنگل والا واقعہ یاد آیا تھا۔  
 ”جب؟“  
 ”میری سالگرہ ہے۔ اس نے مجھ سے میری  
 خواہش پوچھی تو میں نے کہا کہ مجھے چاکلیٹ کھانی  
 ہے اور اس نے یہ پھل لا دیا۔ اس کے اندر کا گودا  
 اس وقت چاکلیٹ جیسا لگا تھا۔ اب نہیں لگتا۔“  
 ”اس نے چاکلیٹ کیوں نہیں دی؟“  
 تالیہ نے سر اٹھا کے اسے دیکھا اور سادگی سے  
 بولی۔ ”کیونکہ ہم اس وقت جنگل میں تھے سر..... اور  
 جنگلوں میں پسند کی چیزیں نہیں ملتیں۔“  
 لمحے بھر کو وان فاریح ساکت رہ گیا۔ پلک تک نہ  
 جھپک سکا۔  
 عجیب De Ja vu (ایسی صورت حال جو  
 لگے کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہو) جیسا احساس تھا جو اس  
 کو اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ کچھ ایسا ہی دیکھا  
 تھا اس نے خواب میں؟  
 پھر بدقت وہ مسکرایا اور ”ہوں“ کہہ کے آگے  
 بڑھ گیا۔  
 (شاید اس نے مجھے یہ کہانی پہلے بھی سنائی ہو۔  
 تبھی میرا لاشعور اسے خواب کی صورت میرے  
 سامنے لے آیا ہو۔ میں چیزیں بھولنے لگا ہوں۔  
 شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔) اس نے ذہن سے ہر  
 خیال کو جھٹکتے ہوئے خود کو تسلی دی۔  
 جتنا وہ اس خواب کو یاد کرنے کی کوشش کرتا اتنا  
 وہ ذہن سے محو ہونے لگتا۔  
 تالیہ نے کن اکھیوں سے اسے اندر جاتے

دیکھا اور سوچا۔ (کیا اسے کچھ یاد آیا تھا؟ اس نے  
 اسی پھل کے بارے میں کیوں پوچھا؟ شاید ایسے  
 ہی۔) وہ مشکوک سی نظروں سے بند دروازے کو  
 دیکھتی اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔  
 ☆☆☆  
 ایڈم بن محمد کے چھوٹے سے گھر کے باغچے میں  
 مرغی گھاس چھتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چوزے  
 اب بڑے ہو چکے تھے اور چوں چوں کرتے اس کے  
 آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ برآمدہ خالی بڑا تھا اور  
 راہداری کا دروازہ کھلا تھا۔ بچن سے مسالوں کی خوشبو  
 اور برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔  
 بھاری بھر کم داتن شاہنگ بیگز اٹھائے  
 برآمدے میں کھڑی تھی۔ زور سے سلام جھاڑا تو ایڈم  
 کی ماں تو لیے سے ہاتھ پوچھتی راہداری میں آئی اور  
 تعجب سے اسے دیکھا۔  
 ”میں لیانہ صابری ہوں۔ ایڈم سے ملتا ہے۔“  
 ماں نے اچھٹے سے اس ڈھیلے سے بچے میں  
 لمبوس فرہر عورت کو دیکھا جس کے ہتھکڑیاں لے ہال  
 کندھوں تک آتے تھے اور وہ اسے دیکھ کے پلکیں  
 جھپکا جھپکا کے مسکرائی تھی۔  
 ”میں ایڈم کو بلاتی ہوں۔“ وہ اسے سر سے پیر  
 تک دیکھتی اندر چلی گئی۔  
 ایڈم کاغذوں کا ڈھیر پھیلانے بیٹھ رہا تھا۔  
 بچن سے مختلف جگہوں پر نشان لگا رہا تھا۔ ماں اس  
 کے سر پر جا کے غرائی۔  
 ”یہ تم سے ملنے عجیب عجیب لوگ کیوں ہر روز  
 چلے آتے ہیں؟“  
 ”اب کون آیا ہے؟“  
 ”ایک امیر سی عورت۔“ ماں کی نظروں میں  
 اس کے ہاتھوں میں پڑے ڈیزائنر شاہنگ کے بیگز  
 گھوم گئے۔  
 ایڈم نے گہری سانس لے کر کاغذ اکٹھے کیے۔  
 لیون پر مسکراہٹ درآئی تھی۔  
 ”وہ ایک شہزادیوں جیسی خوب صورت اور رحم



دل لڑکی ہے ایو۔ اس میں عجیب کیا ہے۔  
پھر سر اٹھایا تو ماں بے یقینی سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ چونکا۔

”جے تالیہ آئی ہیں نا؟“ ایو نے دائیں بائیں نفی میں گردن ہلاتی تو وہ کاغذ چھوڑ کے تیزی سے باہر بھاگا۔

برآمدے میں آرام کرسی پہ داتن پیروں کی قیمتی بجائے بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میز پہ شاپنگ بیگ رکھے تھے۔

وہ کمر پہ ہاتھ جمائے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو دھوپ کا راستہ رک گیا۔

”یہ آپ کیا اٹھالانی ہیں۔“  
داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا پھٹا ہٹا کے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں جاہتی ہوں کہ تم جتنے اچھے نظر آسکتے ہوئے نظر بھی آؤ۔“

ایڈم کے ہاتھ پہلوؤں میں جا گرے۔ حیران سا ہو کے اس کے سامنے کرسی بٹھک کے بیٹھا۔

”آپ مجھ سے کیا کروانا چاہ رہی ہیں۔“  
”تم نے کچھ نہیں کرنا۔ تم اب ایک معروف اخبار کے رپورٹر ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سیلبرینی رپورٹر بن جاؤ۔ ویسے تو اپنی کنسلٹنسی کی میں فیس لیا کرتی ہوں لیکن تم تالیہ کے دوست ہو تو تمہیں میں معاف کرتی ہوں۔“

شان بے نیازی سے ہاتھ جھلایا۔ ایڈم نے آنکھیں سکڑ کے اسے دیکھا اور پھر آگے کو جھک کے ان بیکڑ میں جھانکا۔

”برائنڈ سوٹ جوئے، شرٹس، گھڑی۔ اور یہ ہیر موز، پرفیومز۔ اف داتن.... اس سب کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ شرمندہ ہوا۔

”یہ سب ضروری ہے اور اب تم میرے ساتھ میری دوست کے سیلون چل رہے ہو جہاں تمہارا نیا ہمیر کٹ کیا جائے گا، تمہیں گرم کیا جائے گا، تمہیں بڑے اینتکڑ کی طرح اوڑھنا پہننا سکھایا جائے گا۔ پھر تم جم جاؤ گے۔ گو کہ تم تیلے ہو مگر تمہیں خبیث میں

آنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر....“  
”آپ مجھے جے تالیہ کے قابل بنانا چاہتی ہیں؟“ وہ زنجی سا مسکرایا تو داتن نے گہری سانس لی۔

”تم کسی بھی طرح دان فارغ سے کم نہیں ہو۔ کپڑوں جوتوں سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ابھی دان فارغ کو عام سال لباس پہنا دو تو کوئی اسے دیکھے گا بھی نہیں۔“

”وہ جیا میں معمولی لباس پہن کے ہی جائے بنایا کرتے تھے اور جے تالیہ ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا کرتی تھیں۔“

اس کی مسکراہٹ کا زنجی پن گہرا ہوا۔ داتن نے گہری سانس لی اور آگے ہو کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”تم ایمان داری سے اسے حاصل کرنا چاہتے تھے نا؟ ایمان داری میں مشقت ہے۔ اور قیمتی انسان مشقت کے بغیر نہیں حاصل کیے جاسکتے ایڈم بن محمد۔

خود پہ محنت کرو اور اپنی ذات میں اعتماد لاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی وہ تمہیں ٹھکرا دے تو قسمت کو الزام دینا خود کو نہیں۔ کیونکہ جب انسان خود کو الزام دینے لگے تو

رشتہ ٹوٹنے کے غم کو سردائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“  
وہ چند لمحوں ادا سی سے اسے دیکھے گیا، پھر مسکرا کے سر ہلایا۔ ”اوکے۔ تو اب ہم سیلون چل رہے ہیں؟“

”ہاں اب ہم سیلون چل رہے ہیں۔“ داتن بھی مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگر اسے تالیہ کی نظروں میں خود کو کسی قابل بنانے کے لیے محنت کرنی تھی تو وہ کرے گا۔

اگر زندگی چانس کا دوسرا نام ہے تو ایک چانس وہ بھی لے گا۔ گھر سے نکلے وقت اس نے طے کر لیا تھا۔

☆☆☆

دان فارغ کی رہائش گاہ کا گیٹ کھلا تھا اور اندر ایک کار جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ عصرہ محمود جو کہ

ابھی ابھی تیار ہو کے پورچ میں آئی تھی اندر آتی کار کو دیکھ کے وہیں ٹھہر گئی۔ ڈرائیور اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑا منتظر تھا اور وہ اس کار کو رکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی جس کے اندر اشعر بیٹھا تھا۔

”تم نہیں جا رہی تھیں؟“  
وہ کار سے باہر نکلا اور اس کی طرف آیا۔ عصرہ کو دیکھتے ہی نظروں میں ستائش در آئی تھی۔ سبز اسکرٹ بلاؤز کے اوپر زرد اسٹول سر پہ اوڑھے، وہ کانوں میں ہیرے پہنے بہت باوقار لگ رہی تھی۔

آنکھیں البتہ مشکوک انداز میں اس پہ جمی تھیں۔

”ہاں۔ دن میں کئی جگہوں پہ جانا پڑتا ہے۔ تم اس وقت یہاں؟“  
وہ ناشتے کے وقت آیا کرتا تھا یا رات میں۔

یوں کام کے اوقات میں کب آتا تھا۔

”فون پہ بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے خود آ گیا۔“ ساتھ ہی اشعر نے ہاتھ کے خفیف سے اشارے سے اسے گرد گرد کھڑے گاؤڑ اور ڈرائیور کو دور جانے کا کہا۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئے۔ اب وہ

دونوں عصرہ کی کار کے پاس آنے سامنے کھڑے تھے۔

”وہ بہت ناراض ہے مجھ سے؟“  
کے خلاف یہ چال نہیں چلی چاہیے تھی۔

”کون؟“ عصرہ نے اچھے سے اسے دیکھا۔  
”تالیہ اور کون۔“ پھر وہ ٹھنکا۔ ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے صبح اسے خود سارے معاملے سے آگاہ کر دیا ہے کہ صوفیہ رحمن کے پاس عثمان کو بھیجے گا آئیڈیا آپ کا تھا۔“

”یا اللہ! ایش؟“ عصرہ دنگ رہ گئی۔ ”میری تو اس سے کل سے بات ہی نہیں ہوئی۔“  
اشعر نے گہری سانس لی۔

”مجھے شک تھا۔“  
”ایش تم کیا کہہ رہے ہو۔ تالیہ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم اس کے خلاف نفیث شروع کروا رہے تھے؟“  
”ظاہر ہے میں نے بتایا تھا مگر آپ کا نام نہیں

لیا تھا....“ اس نے سمجھ کے سر جھکا۔ ”اس نے خود ہی بھانپ لیا کہ اس میں آپ کا ہاتھ ہے۔ بہر حال ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور....“

لیکن عصرہ کی سوئی ایک ہی بات پہ انگ گئی تھی۔

”تم نے اسے.... تم نے اسے خود بتا دیا؟“  
اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”مگر کیوں؟“ ایش؟

اشعر نے کار سے ٹیک لگائی اور شانے اچکائے۔

”آجنگ نے مجھے کہا تھا کہ اگر میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے سچ بولنا چاہیے۔“

”سچ بانی فٹ۔“ وہ ایک دم غصے سے غرائی۔  
”تم نے فارغ کو تو نہیں بتایا نا؟“

”نہیں.... اور میرا نہیں خیال“ وہ ان کو بتائے گی۔

”تم کس دنیا میں رہتے ہو اشعر محمود؟ یا اللہ.... یا اللہ!“ لال سمجھو کا چہرے کے ساتھ عصرہ دبا دبا چلائی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اشعر کا منہ نوچ لے۔

”وہ دونوں تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ وہ لڑکی یہاں کیریر بنانے نہیں آئی۔ وہ فارغ بن راحل کو حاصل کرنے آئی ہے۔ وہ.... وہ مکار gold-digger میرے شوہر کے پیچھے ہے“

تمہارے نہیں۔“  
اشعر ایک دم سیدھا ہوا۔ اس پہ جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالی الٹ دی تھی۔

”واٹ؟“  
”تم ان کے ساتھ رہتے ہو اور تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟ کہاں گیا میرا عیار اور شاطر بھائی؟ اور کہاں سے آ گیا یہ بے وقوف مرد جس کی آنکھوں پہ تالیہ مراد نامی پٹی بندھ گئی ہے؟“ وہ پھنکار رہی تھی اور وہ سن سا کھڑا تھا۔







بدلتا۔ جس ایڈم نے ان سے محبت کی تھی وہ یہ ایڈم ہے۔“ سینے پہ اٹکی سے دستک دی۔ ”بدلا ہوا ایڈم معلوم نہیں ان سے محبت کرتا ہوگا یا نہیں؟ اونہوں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتا تھا۔

”ہر انسان یونیک اور الگ ہوتا ہے۔ خود کو نکھارتا اور گردن کرنا اچھی بات ہے لیکن کسی دوسرے انسان کے لیے ہرگز نہیں۔ مجھے وان فارخ کا lesser version نہیں بنتا۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ مجھے.....“ اپنے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے ان ای میلز پہ کام کرنا ہے۔ آئیں کھانا شروع کرتے ہیں۔“ اس نے ساری بات ہی ختم کر دی تھی۔

داتن دھمی دل سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

سوموار کی صبح وہ آفس میں تھی اور جب سے آئی تھی اسٹافرز کے ساتھ بیٹھی قطار میں لگے کمپیوٹرز پہ کیبڈین کے اعداد و شمار کا تجزیہ کر رہی تھی۔ ارد گرد پرجوش اسٹافرز کا جھجکا لگا تھا اور بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔

بھی اشعر کا پیغام فون پہ جگمگایا۔ ایک ریسٹوران کا نام اور وہاں پہنچنے کی ہدایت کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ ادھر فارخ اور وہ اس کے منتظر ہیں۔ تالیہ نے سراساٹھا کہ گھڑی دیکھی تو بچ بریک قریب تھی۔ صبح سے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ جانے یہ غیر اعلانیہ سچ اتنا ضروری کیوں ہو گیا تھا کہ ایکشن سے چار دن پہلے وہ لوگ اس میں وقت ضائع کر رہے تھے؟ کوفت سے سوچتی وہ نیچے آئی اور کیب بلالی۔

”مجھے ہر چیز یاد آگئی ہے“ ذوالکفلی۔ آپ بھی۔“ کیب کی پچھلی نشست پہ بیٹھے اس نے ذوالکفلی کو فون ملا کے کان سے لگایا تو دیکھا ڈرائیور نے چونک کے بیک ویو مرر میں اس کو دیکھا تھا۔ وہ سنبھلی اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے قدیم طے

میں کہنے لگی۔

”پچھلے دو دن سے مجھے سب یاد آ گیا ہے۔ میرا بچپن۔ ہم کیسے محل سے نکالے گئے تھے۔ اور پھر مراد راجہ کیسے راتوں کو چھپ کے پمپرو کے لوگوں سے ملتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ وہ بے زاری سے کہہ رہی تھی۔

”جانتا ہوں۔ تمہاری بوتل خالی ہو چکی ہے“ پتری تالیہ۔ ”وہ گہری سانس لے کر افسوس سے بولا۔

”میرے ماضی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو مجھے حیران کرے۔ تمہارا کردار بھی مجھے الجھا نہیں سکا۔ سب کچھ میں جانتی ہی تھی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”یادیں عجیب چیز ہیں پتری تالیہ۔ لوگ ان کو یاد کرنے سے نہیں ڈرتے۔ ان کے وار سے خوف کھاتے ہیں۔ ماضی یاد آ جاتا الگ چیز ہے مگر کسی خاص موقع پہ اس یاد کا دل پہ حملہ آور ہو جانا بالکل الگ۔“

”واٹ ایور۔“ اس نے سر جھٹک کے فون رکھ دیا۔ کیب منزل تک پہنچ چکی تھی۔

وہ ایک خوب صورت اور پزیرش ریسٹوران تھا جس کے بڑے سے ہال کی چھت اور اونچی تھی اور اس سے لٹکتے قانونوں کے کرکٹرز دوپہر میں بھی چمک رہے تھے۔ دور دور تک بھلی میزوں پر امراء اور با اثر کاروباری حضرات بچ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک میز پہ فارخ اور اشعر کے ساتھ عصرہ محمود بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔

تالیہ نے گہری سانس لی۔ (تو وہ ایک فیملی بچ تھا؟ پھر اسے کیوں بلایا تھا؟ یقیناً یہ بھی مزہ عصرہ کا آئیڈیا ہوگا۔)

وہ قریب آئی تو اشعر فوراً اپنی جگہ سے اٹھائی مگر عصرہ نے دیکھا کہ وان فارخ بھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اتنا بے نیاز انسان تھا کہ ہم کسی کے لیے اٹھتا تھا۔ تاہم عصرہ مسکراتی رہی۔ تالیہ کے سلام کا جواب بھی

انہی سے دیا۔ میز گول تھی اور چاروں طرف ایک ایک کرسی رکھی تھی۔ عصرہ اور اشعر آمنے سامنے تھے اور تالیہ وان فارخ کی سیدھ میں بیٹھی تھی۔ چونکہ محل تھا۔

”اس بچ کی کوئی خاص وجہ ہے سر؟“ اس نے ہلکین پھیلاتے ہوئے خجیدگی سے پوچھا۔

”تم سب لوگ پچپن میں اتنے مصروف ہو کہ ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔“ فارخ سے پہلے عصرہ ہتھیلی پہ ٹھوڑی بجائے خوش دلی سے گویا ہوئی۔ ”میں نے زبردستی آج ان دونوں کو وقت نکالنے پہ مجبور کیا ہے۔ ان شاء اللہ آگے ڈنر ہم فارخ کے جیتنے کی خوشی میں ساتھ کریں گے۔“

تالیہ نے اس کے بچے سنوڑے چہرے کو دیکھا اور مسکرائی۔ ”آپ کی پلائنک کی داد دینی چاہیے سبز عصرہ۔ آپ تو وہ کرکٹرز ہیں جو ہمارے گمان میں ہی نہیں ہوتا۔“

عصرہ محمود کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر پہ اسٹول اوڑھے میک اپ اور تازک جیولری سے خود کو مزین کیے وہ ٹھوڑی کو ہتھیلی کے پیالے پہ لگائے تالیہ کو دیکھتی رہی۔ اشعر البتہ ٹھنکھار اتو تالیہ نے نظریں اس کی طرف موڑیں۔

”ایکشن ابھی ہم نہیں جیتے لیکن سلیپر یٹ کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک چیز ابھی بھی ہے۔“ وہ یوں دوستانہ لہجے میں بولا جیسے دونوں کے درمیان کچھ ہوائی نہ ہو۔

”اچھا۔ وہ کیا؟“ فارخ نے اس سے پوچھا۔ وہ آج گرے سوٹ میں ملبوس تھا، ایک گھٹنے بعد اسے کی انٹرویو میں جانا تھا۔ البتہ بانی دونوں کی نسبت وہ شاش بشاش اور آرام دہ نظر آ رہا تھا۔

”چپے تالیہ نے ادیب کا اسٹینڈل جس طرح ڈیڑل کیا اور ایمان کو جھوٹا ثابت کیا، وہ قابل تحسین ہے۔“

”حالانکہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔“ عصرہ کی مسکرائی گہری نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”ہم سب

ماہنامہ  
حنا  
لاہور

اپریل 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

اپریل 2019 کی شمارہ کی ایک پولی

ہو گہر کے لیے ماحولیات حنا

☆ ”دل دیاں گلان“ ریمانڈ آڈیو کامل ہال

☆ ”آئیڈیل“ سیدہ حبیبہ بخاری کامل ہال

☆ ”کھل انھے گلاب“ حنا شرعی کامل ہال

☆ ”می رقصم“ بشری سیال کامل ہال

☆ ”شہر دل کا راستہ“ تحسین اختر کامل ہال

☆ ”حاصل زیست ہوتم“ نصیر آصف کامل ہال

☆ ”سیما بیت عام، سویرا لک، ٹاکنول“

سادہ چوہدری اور راجہ انوار شج کے افسانے

☆ ”دل گزیدہ“ امہرم کامل ہال

☆ ”اسیر عشق“ سدرۃ البتہ کامل ہال

اس کے علاوہ

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل

سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

اپریل 2019

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی  
بک اسٹال سے طلب کریں









”سیرہ..... سیرہ.....! آنکھیں کھولو، پلیز آنکھیں کھولو!“

اس نے اپنے گال پر اک ہاتھ کا لیس محسوس کیا تھا۔ وہ ہاتھ گال چھپتا رہا تھا۔ ہاں! وہ محسوس کر سکتی تھی..... اچھا تو وہ محسوس کر سکتی تھی تو وہ زندہ تھی۔ زندہ تھی۔ اس نے نیم غنودگی میں ہی ڈرپ کی سوئی والا ہاتھ نقاہت سے بیڈ پر مارا۔

وہ مریکپوں نہیں گئی تھی؟ آخر کیوں؟ وہ بری طرح سے ٹوٹی تھی۔ نہیں رہنا چاہتی تھی وہ زندہ..... اس تکلیف کے ساتھ اتنی اذیت کے ساتھ..... ہل ہل سکتی زندگی..... لمحہ در لمحہ میں ڈوبی حیات یوں کہ ساعت ساعت تڑپتی ہوئی تھی۔

اسے ایسی زندگی نہیں چاہیے تھی۔ زندگی ہو تو وہ ہو کے اسے جینے کا من چاہے نہ کہ یوں مرنے کا..... اور اگر کسی نے زندہ ولی کا مطلب جاننا ہوتا تو وہ لغت کا سہارا نہ لیتا..... وہ بس سیرہ غفار کو اک بار مل لیتا۔ سیرہ تو ایسی سیرہ تھی مگر اب.....

☆☆☆

اس شہر میں اگر کوئی بابائے کیمسٹری تھا تو وہ حسان بن زید تھا۔ پڑھانا نہیں تھا کانسٹیٹ کو حفظ کروا دیتا تھا فارمولے، مساوات، بیلنس کرنا کوئی اس سے دیکھے ازبر کر دیتا تھا۔ کیمیکل ری ایکشن روڈا دیتا تھا۔ ایسی خدا داد صلاحیت کا مالک تھا کہ سارا شہر اپنے بچوں کو کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کروانا چاہتا تھا۔ حسان بن زید بنانا چاہتا تھا اور اگر ابھی حسان بن زید کو دیکھو تو وہ لکچرر دیتا نظر آئے گا۔

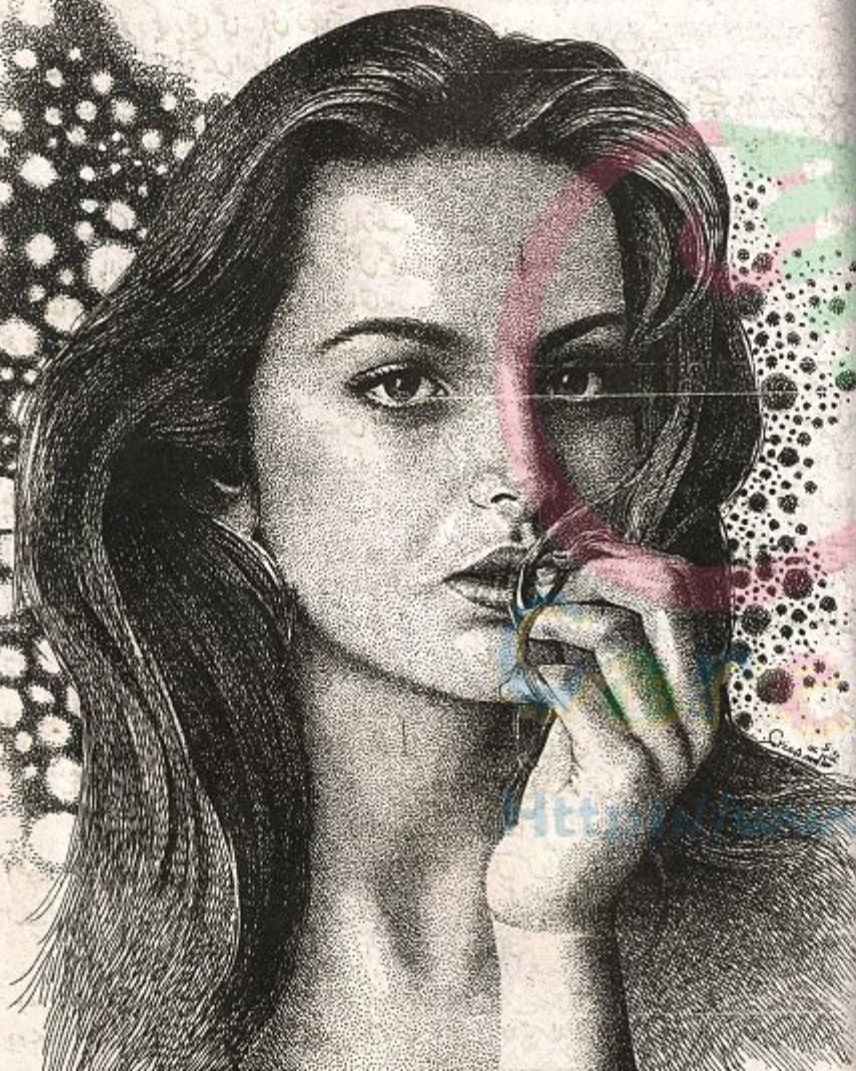
یہ ایک کوچنگ سینٹر کا کمرہ تھا۔ اور وہ آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے۔ ملٹی میڈیا کے سہارے کھٹا کھٹ

اتنا ہی سرد تاثر تھا جتنا کہ موت کا ہوتا۔

ارد گرد مشینوں کی آواز تھی اور اس کا سانس دھیمہ دھیمہ چلتا تھا۔ بھرے بھرے گالوں کی سرخی کھو گئی تھی۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ رنگت زرد سے زیادہ پھکی اور سفید ہو چکی تھی۔ اور وہ مرنے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔

☆☆☆

نیمو کا سائیکل ہوا۔ اسپتال میں چند دن گزارنے کے بعد جب وہ گھر آئی تو اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ خود سے اٹھ کر بیٹھنے سے بھی قاصر تھی۔ وہ اپنے ہر کام میں محتاجی کا شکار ہو چکی تھی۔ اپنی ارد گرد جلتے پھرتے زندگی کے مختلف کام سر انجام دیتے لوگ



لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتے ہوئے لکچرر ڈیلیور کر رہا تھا اور بچے..... وہ اپنے قلم تیز چلاتے۔ اس لکچر کو..... اس کے بولے گئے الفاظ کو اسکرین پر نظر آتے مواد کو اتارتے جاتے تھے وہ ایک خاص قسم کے سافٹ ویئر کی مدد سے پڑھاتا تھا اور ابھی جب وہ لکچر دے رہا تھا تو اک کونے سے یک دم آواز آئی تھی۔

”سرا! یہ مساوات کیسے بیلنس ہو رہی ہے؟“  
”اوپر آئیے۔“ اس نے طالب علم کو بلایا اور جب وہ ڈائس کے پاس گیا تو حسان نے بازو برہنہ کر کے اس کے آگے کی۔

اور اب وہ طالب علم اس برہنہ بازو پر سمجھ نہ آنے والی مساوات لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گول چہرہ..... بھرے بھرے گال..... یا قوت کی سرخی کو مات دیتے ہونٹ..... سیاہ سیدھے، پشت تک آتے بال..... اور اوپر سے اٹھارواں سن..... جوانی تھی تو انڈر کر آئی تھی۔ جوانی میں تو گدھی بھی پیاری لگتی ہے وہ تو پھر سیرہ بھی۔ جس کو دیکھو اور زندگی کا مطلب جان لو۔ ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی لڑکی اور جب وہ ہنستی تھی نا تو آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہو جاتی تھیں تو اور وہ بھی پیاری لگتی تھی۔

اور اب..... یہ وہ ہی سیرہ تھی..... وہ ہی سیرہ..... پیاری Acute leukemia! نیمو تھراپی کا تیسرا سائیکل اور پڑنے والی سیرہ..... جو کہ اب ہار مان چکی تھی۔

اگر ابھی تم اسے دیکھو تو وہ ہسپتال کے ایک بستر پر جت لیٹی چھت کو گھورتی نظر آتی تھی۔ چہرے پر کچھ



اسے زہر لگتے تھے۔

”وہ کیوں تندرست تھے کیوں؟ انہیں بھی بیمار پڑنا چاہیے۔ بستر پر ہونا چاہیے۔ وہ چلتے کیوں ہیں کیوں؟“

اسے شدت سے حسد محسوس ہوتا اور حسد آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جانا چاہتا تھا مگر فطرت اسے روکنے بھی نہ دیتی تھی۔

ابھی بھی وہ لاؤنج کے کاؤچ پر لیٹی اسکرین پر چلتی تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ امی زبردستی اسے کمرے سے نکال کر لائی تھیں اور بی وی آن کر کے لگائیں۔ اسے ان تھرٹی تصاویر میں رہتی بھر دل چسپی نہ تھی وہ تو انہیں یوں دیکھتی تھی کہ جیسے ٹائٹل توڑ دے گی ان کی۔ بازو کے تسمے ادھیڑ دے گی اسی طرح کا محتاج بنادے گی کہ جیسے وہ خود ہو چکی ہے۔ کوئی مارننگ شو تھا اور میزبان اب مہمان کو بلارہی تھی۔ چینل بھی کوئی مقامی تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر دیکھا تھا اور پھر جیسے نظر نہ ہٹا سکی۔ چند لمحوں بعد۔۔۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھی تھی۔

معلوم نہیں اسے کیا ہوا تھا مشکل سے ہی مگر وہ اٹھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئی، پہلے بیڈ کرسیاں ہموار کیا اور پھر لیٹ ٹاپ آن کیا۔ کمرہ کھول کر اس نے وہاں ایک نام ٹاپ کیا اور اب وہ سامنے دیکھنے والی معلومات کو پڑھنا چاہتی تھی مگر نظر بار بار پھر سی جاتی تھی۔ سرگھومتا سا تھا۔۔۔ وہ فوکس نہیں کر پاتی تھی مگر پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ کسی توانائی بھی جو یک دم اس کے اندر ایک جوان انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی اور اس نے اپنی مطلوبہ معلومات گوگل سے حاصل کر ہی لی تھیں۔

”کیا کر رہی ہو سیرہ؟“ امی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے کمرے تک آئی تھیں اور اب یوں اسے لیٹ ٹاپ کھولے دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔

”سچ۔۔۔ اور طبیعت خراب کرو گی؟“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے لیٹ ٹاپ لیا تھا۔ جانتی تھیں کہ وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔ اپنی من مرضی کے کام ہی

کرتی تھی۔

”امی!۔۔۔۔۔“

”جی ماں کی جان۔۔۔۔۔!“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔ کتنے عرصے بعد اس نے یوں پکارا تھا۔

”مجھے اکیڈمی میں داخلہ لینا ہے۔“  
اور امی کو ایک دم الیکٹرک شک لگا تھا۔  
”سیرہ!۔۔۔۔۔“ وہ حیرت سے بس یہ ہی کہہ سکی تھیں۔

☆☆☆

اور وہ یک ٹک۔۔۔۔۔ ملک چمپکے بنا۔۔۔۔۔ سانس لیے بنا اسے کتنی تھی۔ اسے زندگی سے اب اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ بس اک وہ آواز۔۔۔۔۔ بس وہ آواز چاہیے تھی۔ وہ سننا چاہتی ساری عمر، تاحیات۔۔۔۔۔ اور ہاں! وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔

محبت اک مجرہ اور وہ رونما ہو چکا۔ اللہ کی نازل کردہ اک پھونک۔۔۔۔۔ جو مردہ دلوں کو زندگی کی حرارت بخشنے۔۔۔۔۔ محبت اگر اک غیر منطقی شے ہے تو یہ منطقی سیرہ غفار پرفٹ بیٹھی تھی۔ محبت ادھ جو کہ ہوئی ہوئی ہے اور ہو جاتی ہے۔ سو وہ سیرہ غفار کو بھی ہو گئی تھی۔ کیا فرق پڑتا تھا؟ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑی تھی۔ اس کا وجود ہڈیوں کی ایک گانٹھ بن چکا تھا۔ بیماری سے اس کے حواس خسرے متاثر ہو رہے تھے۔ مگر اس سب سے کیا فرق پڑتا تھا، جان لو کہ لیکو میا جان لیوا تھا۔

جو بیماری اب کہ لاحق ہوئی تھی نا۔۔۔۔۔ وہ تو جان ہی نہ چھوڑتی تھی اور اس کے لیے تو کیسوں کا کوئی سائیکل بھی نہ تھا جو کہ اس کی Acutends کے آگے ذرا سا اٹاپ ہی لگا دیتا تھا۔ وہ اس کو چنگ سینٹر میں بس اک کیمیشری کی کلاس لینے آئی تھی۔ وہ کلاس لینے نہیں آئی تھی۔ وہ تو حسان بن زید کو دیکھنے آئی تھی۔

☆☆☆

وہ تیرا دن تھا۔

”رول نمبر سترہ۔۔۔۔۔ نیو ایڈمیشن۔۔۔۔۔ سیرہ غفار۔“

اور اس کے مسکرانے پر دل یوں دھڑکا کہ جیسے کسی پہلی کو کرک کے ہی چھوڑے گا۔ اس کا سانس لینا مشکل ہوا۔ ہاتھ پر ابھی تک کیسول لگا ہوا تھا۔ گوکہ حالت بہتر ہونے پر ہی اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے اس کا داخلہ کروایا گیا تھا مگر وہ پھر بھی کسی دوسرے عام، نارمل انسان کی طرح نہیں تھی۔

رول نمبر سترہ۔۔۔۔۔ سیرہ غفار؟۔۔۔۔۔

اور اب کے سب بچوں نے گردنیں گھاگھا کر اسے دیکھا۔ اس کی زرد رنگت کچھ اور زرد ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔

”جی سر!“ اک منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔  
”طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟“ اور اس نے بے حد حیرت سے حسان کو دیکھا۔  
”آپ کو میری طبیعت کا۔۔۔۔۔“

”یہ بات اہم نہیں۔۔۔۔۔ اہم میرا سوال ہے۔ طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟“ اس کی بات ترنت کائی گئی تھی۔ سیرہ نے رد عمل میں ہونٹ پیچھے تھے۔  
”طبیعت اب ہی تو اچھی ہوئی ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”ٹھیک ہوں سر۔۔۔۔۔!“  
”مجھ میں آرہا ہے آپ کو؟ کوئی مسئلہ تو نہیں۔“  
”نوسر۔۔۔۔۔!“ رٹا رٹایا جواب آیا۔ ”پر وہاں سمجھنے کے لیے آتا ہی کون تھا۔“

”اچھا!۔۔۔۔۔ ذرا ادھر آئیے پھر۔۔۔۔۔“ وہ اب اپنی آستین چڑھا رہا تھا اور سیرہ کا خون خشک ہوا۔  
”یہاں آکر ذرا یہ تو بلیکس کریں۔“

اور سیرہ غفار نہیں جانتی تھی کہ وہ یوں پکڑی جائے گی۔ وہ ٹھس کھڑی رہی۔  
”سیرہ۔۔۔۔۔!“ اب کے تحکم سے بلایا گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے ڈانس کی جانب بڑھتی تھی۔ اس نے پہلے ہی بازو پر اک مساوات لکھ رکھی تھی۔ (یوں تو وہ oral ٹیٹ لیا کرتا تھا مگر سیرہ

جیسے طالب علموں کو پکڑنے کا اس کا یہ ہی طریقہ تھا) سیرہ نے اک نظر اس کے برہنہ بازو پر ڈالی۔ دوسری نظر سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر نظر جھکالی۔ جانتی تھی کہ وہ دیکھ نہیں سکتا۔ وہ ناپینا تھا مگر پھر بھی اس سے اس کا چہرہ بند دیکھا گیا۔  
اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اور اس وقت اس کا دل شدت سے چاہا۔ اتنی شدت سے کہ شدت آنکھوں سے بہہ نکلی۔

”کاش حسان بن زید تم ذرا دیر پہلے ملے ہوتے۔۔۔۔۔ یا پھر کاش۔۔۔۔۔ اے کاش میں یوں نہ ہوتی۔۔۔۔۔ کوئی عام سی لڑکی ہوتی مگر یوں نہ ہوتی۔۔۔۔۔ میں اب چاہ کر بھی تمہارے ساتھ کی چاہ نہیں کر سکتی۔ کہ یہ ہو نہیں سکتا۔۔۔۔۔ سیرہ کیسا دکھ بھر دل لے کر مرے گی۔ آہ! اور آنسو اک گرم قطرہ حسان کے بازو پر گرے۔۔۔۔۔ وہ بری طرح چونکا! سیرہ نے قلم اٹھایا۔ اور لکھا۔۔۔۔۔!“

”مساوات میں نہیں تم برابر کرو حسان بن زید!۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اب ذرا کرنا یہ مساوات برابر؟ تمہاری ساری کی ساری کیمیشری ٹاک کے راستے باہر نہ نکلی تو کہنا۔“

اس نے جملہ لکھا۔ زور سے قلم کو ڈاکس پر رکھا، سر اٹھا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ حسان نے ترنت اپنی آستین نیچے کی تھی۔ اس کا منہ سرخ ہوا۔۔۔۔۔ جڑے بھج گئے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ”گیٹ آؤٹ۔“

وہ دھاڑا سیرہ پھر وہاں رکی نہ تھی۔ وہ ٹاک کی سیدھ میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ چند لمحوں تو لگتی ہی تھے خود پر قابو پانے کے لیے۔ سو وہ بھی فوراً ہی نارمل نہ ہو سکا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہوا اور وہ پھر معمول کی طرح یوں پھر دینے لگا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور طالب علم سوالیہ نظر دل ایک دوسرے کو تکتے تھے کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ آخر کیا ہوا تھا؟

☆☆☆



حسان بن زید۔ پورا کٹی نا پینا۔ ہو سکتا تھا کہ حسان بھی عام ناپیدائوں کی طرح۔ ایک محتاج کی زندگی گزارتا۔ ایسی زندگی کہ جس میں کوئی وسیلہ روزگار بھی نہ ہوتا۔

وہ میرے تیرے کا محتاج رہتا مگر..... یہ اس کی غیر معمولی ذہانت تھی جس نے اس کے باپ کو مجبور کیا تھا کہ وہ حسان کے لیے کچھ لگ سوچے۔

حسان انجیل اسکول میں پڑھتا رہا اس کا باپ اسے کسی چیز کا محتاج نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سو وہ قرض اٹھا کر اس کے لیے باہر ممالک سے خاص ایکو پینٹ منگواتا رہا۔ گوکہ پاکستان میں بھی کچھ ایکو پینٹ موجود تھا مگر زید صاحب! یوں سمجھ لیجیے کہ ایک لیول آگے جانا چاہتے تھے۔ Auditory Access Devices سے لے کر نیکٹ اسکیلوٹیک انہوں نے حسان کے لیے بہت محنت کی تھی۔ حسان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے اور جب اب اسے کسی گھرانے کو حسان، جیسا بچہ پالنا پڑے اور پھر تعلیم کا حصول ممکن بنانا پڑے تو آپ ان کی کئی کی جانے والی محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس کے باپ نے اپنی ہڈیاں محنت میں گھائی تھیں تو آج حسان اس مقام پر تھا کہ یونیورسٹی ایجوکیشن حاصل کر رہا تھا اور وہ بھی اپنے خرچے پر۔

سن یہی سن کوئی پچیس تیس کا ہوگا۔ وہ اگر آنکھوں سے کالا چشمہ اتارے تا تو کوئی جان نہ سکے کہ وہ ناپینا ہے۔ شخصیت وہ کہ لڑکیاں پیچر کم سستی اور اسے دیکھتی زیادہ تھیں اور جب کسی کو کوئی نمیریکل یا مساوات یا پھر کوئی موضوع سمجھ نہ آتا تو وہ یوں ہی۔ بازو پہ لکھوا کر سمجھاتا تھا۔ پہلے وہ طالب علم کا مسئلہ سمجھتا اور پھر کاغذ قلم کے ذریعے اسی مسئلے کو سمجھاتا تھا۔

اور یہ اس کے ساتھ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ یوں ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے ایسی حرکت کی تھی۔ وہ عموماً لڑکیوں کے معاملے میں احتیاط کرتا تھا اور اگر کسی لڑکی کو کچھ سمجھ نہ آتا تو وہ کسی اچھے لائق طالب علم کو

سمجھانے کا کہہ دیتا۔ بہت کم..... بہت ہی کم وہ لڑکیوں کو یوں ڈاکس تک بلاتا تھا اور آج.....

اس کا بازو عادی تھا..... کہ اس پر بہت سے عدد لکھے جاتے تھے۔ علامتی نشان کھینچے جاتے تھے۔ مگر آج وہ کیا تھا جو لکھا گیا..... یہ کس شے کا علامتی نشان تھا جو کھینچا گیا۔ بازو میں اس جگہ سے دھک رہا تھا کہ جہاں وہ لفظ لکھے گئے۔ مل مل کر دھونے کے باوجود..... وہ جلن جیسے بار بار تازہ ہوتی تھی۔ دھک دھک جاتی تھی اور حسان بن زید نے زندگی میں پہلی بار محبت کے اظہار کا مزہ چکھا تھا..... ایسا اظہار جو سکون نہ دے۔ قد اونچا نہ کرے۔ کسی سنگھاسن پر نہ بٹھائے بلکہ اک بے چینی بھری الجھن بخش جائے۔

تو کیا وہ ماگل بھی جو جھجھجھے..... ہاں پاگل ہی تو تھی۔ اس کی آنکھ سے ٹپکنے والا گرم پانی جیسے روح کو جھلسا گیا تھا اور اس بات پر مہر ثابت کرتا تھا۔

کہ ہاں! ابھی اسے حسان بن زید سے محبت! کرلو پھر جواب کرنا ہے، ہے تو بس ہے۔

☆☆☆

وہ ”زندگی“ جو یک دم اک جوان انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی نا وہ جیسے پانی کا بلبل ثابت ہوئی تھی، اپنی موت آپ مری تھی۔ لڑنے کا حوصلہ جو پہلے ہی ختم تھا۔ اس کا گراف کچھ اور نیچے گیا تھا۔ وہ میڈیسن نہ کھانے کی ضد کرتی اور بعض اوقات آنکھ بجا کر ڈسٹ بن میں چھینک دیتی۔ اس دوران وہ اسپتال کا چکر بھی لگا آئی تھی۔ ایڈمٹ رہی تھی۔ کیو کا چوٹھا سائیکل ہوتا تھا اور حالت تھی کہ دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے موت کو گلے لگانے کی تیاری میں تھی۔ اسے ترس نہیں آتا تھا۔ اپنے ماں، باپ پر..... ماں جیسی بہن جو بھی اسے منتوں ترلوں سے بھی بہانوں سے، کبھی جذباتیت سے اور کبھی رعب سے دوائی کھلانے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی۔

وہ رو پڑتی..... ہاتھ باندھ دیتی پر سیرہ غفار کو علینا غفار برہم نہیں آتا تھا۔ ذرا سا بھی نہیں آتا تھا۔ اتنا سا بھی نہیں..... محبت نے اسے ”بے حسی“ سنگ

”ولی“ کا تختہ بخشا تھا..... جب اسے زندگی سے راحت نہیں ملتی تھی مرتے مرتے بھی زندگی نے اسے نہ بخشا تھا تو وہ کیوں راحت بانکتی پھرے..... کیوں؟

”سیرہ..... سیرہ کیوں کرتی ہو ایسا؟..... خدا را ترس کھاؤ ہم پر۔“ اس کی بہن رو پڑی تھی۔

”اسے ترس آیا..... آیا ترس اسے؟..... نہیں آ یا نا! تو میں کیوں کھاؤں ترس..... کیوں؟“ وہ حلق کے بل چلائی۔ اور علینا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو سیرہ!“ اور سیرہ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ منہ موڑ لیا۔

”سیرہ مجھے بتاؤ..... بتاؤ نا پلیز..... کس کی بات کر رہی ہو۔“ مگر اس کے ہونٹ مہر بند ہو گئے۔

علینا پوچھتی رہی..... اس کی منت کرتی رہی لیکن اسے جواب نہیں دینا تھا سو نہیں دیا۔ علینا تھک ہار کر اٹھ گئی اور جب دروازے تک پہنچی تو۔

”آپنی امیری وصیت لکھ کر محفوظ کرلو۔ مجھے اپنی آنکھیں ڈونٹ کرنی ہیں اور تمہیں انہیں حسان بن زید تک پہنچانا ہے۔ وہ جب بھی دیکھے تو میری نظر سے دنیا کو دیکھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا نا آپ! تو روز قیامت مجھے اپنا چہرہ نہ دکھانا.....“

وہ بڑے بے حس لہجے میں بولتی تھی۔ سرد انداز میں بات کرتی تھی۔ اور علینا.....!

”حسان بن زید!“ اس کے لب بنا آواز ہلے تھے۔

”یہ تو اس کا یکمشری کا..... اوہ! تو اس نے اس لیے اکیڈمی میں.....“ اور علینا شاک کے عالم میں منہ پر ہاتھ رکھے اسے تک رہی تھی اور وہ گردن موڑے کھڑکی سے باہر۔

☆☆☆

”میں علینا ہوں سیرہ غفار کی بہن؟ آپ کو یاد ہوگا میں آپ کو اس کے بارے میں خالص تاکید.....!“

”کیسے آتا ہوا؟“ اور اس کے تاثرات سیرہ غفار پر ہی سرد ہوئے تھے۔

”سیرہ آپ کو اپنی آنکھیں ڈونٹ کرنا چاہتی ہے تو.....“

”اب میں کیا اس کے مرنے کا انتظار کروں گا۔ اسے کہیے گا کہ میری فکر میں ہلکان ہونے کے لیے میرے ماں باپ ہیں اس کی ضرورت نہیں مجھے!.....“ اتنے سخت جملوں پر علینا کا دل جیسے کٹ کر گر گیا تھا۔

”اس کے مرنے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا آپ کو۔ وہ مر رہی ہے۔“ اس نے مر رہی ہے پر زور دیا۔

”Acute Leukemia“ اس نے

تکلیف سے کہا اور وہ سن کر رو گیا تھا۔ بازو پر اک قطرے کی تیز جلن جیسے زندہ ہوئی تھی۔ کچھ الفاظ جیسے خون سے داغے گئے تھے۔

”ایم سوری.....“ وہ دھیمی آواز میں بس یہی کہہ سکا۔

”یاد ہوگا آپ کو۔ اس کی طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا آپ کو۔“

”میں سمجھا لے ہی کچھ بخار و خوار ہو گیا ہوگا۔“ اور اس کا لہجہ معذرت کرتا ہوا لگتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ میں انوالو ہو گئی ہے..... تب ہی ضد کر کے آئی تھی۔ نہیں معلوم..... نہیں جانتی میں کہ اس نے آپ کو کہاں دیکھا مگر سیرہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو یوں منہ سے کسی کا نام لیتی۔“ اور حسان کا منہ سرخ ہوا۔ اس نے نام نہیں لیا بس آنکھیں آپ کو ڈونٹ کرنے کا کہا نا!.....“

ذرا سی دیر کو اس نے سانس لیا۔

”مگر بیماری کی وجہ سے وہ بہت بدل گئی ہے۔ باغی ہو گئی ہے۔ اس نے آپ کا نام نہیں لیا مجھے روشنی کی کرن دکھائی ہے۔“

اور علینا چپ ہو گئی اتنی چپ کہ بے ساختہ حسان کو کھانٹ کر اسے متوجہ کرنا پڑا۔

”وہ کیسے کے سائیکل کے لیے نہیں مان رہی..... اور میں.....“ علینا نے بے ساختہ خشک پڑتے ہونٹ تر کیے۔

”میں آپ سے ایک فیور لینے آئی ہوں۔“



”جی؟“ وہ ذرا ساجرا ہوا۔

”کیا آپ اس سے ملنے آ سکتے ہیں؟ مجھے یقین

ہے کہ آپ کے کہنے پر وہ مان جائے گی۔“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں بس؟“ وہ بدکا۔

”پلیز!..... خدارا بات کو سمجھیے۔ وہ مر رہی ہے اور

آپ.....“

”پلیز خاتون..... پلیز۔ میں کیسے یہ کر سکتا ہوں۔

آپ جانتی ہیں نا..... سمجھ سکتی ہیں نا میرے آنے کو وہ نیا

سمجھے گی اور میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔“

”آپ کے دھوکے سے کسی کو زندگی ملتی ہے حسان

صاحب! زندگی!..... جو اک بار چلی جائے تو لوٹ کر

نہیں آتی۔ واپس نہیں ملتی۔“ علینا جذبہ بانی ہوئی۔

”چلیں فرض کریں میں آتا ہوں۔ وہ سائیکل کرا

لتی ہے۔ چلیں یہ بھی فرض..... بلکہ اللہ کرے کہ اس کے

بعد وہ مکمل صحت یاب ہو جاتی ہے تو پھر سچ اسے پھر سے

مارندے گا۔“ وہ جی تندہی میں بولا تھا۔

”تب کے مرنے اور ابھی کے مرنے میں بہت

فرق ہے حسان صاحب! بہت فرق۔ دل کے مرنے

سے سانس نہیں ٹوٹتی اور سانس کے ٹوٹنے سے لوگ مر جاتا

کرتے ہیں..... اس پار چلے جایا کرتے ہیں کہ جہاں

سے واپس کوئی نہیں آتا۔

ہمیں اس کے دل کی نہیں..... اس کی ضرورت

ہے۔ ہمیں وہ اپنے سامنے سانس لیتی نظر آتی رہے بس

دکھتی رہے۔ سوچ سکتے ہیں آپ اس کے جانے

سے..... اس کے ماں باپ پر، بھہ پر کیا بیتی گی؟ سوچ

سکتے ہیں آپ؟ سوچ سکتے تو یوں بات نہ کرتے۔ زندگی

اہم ہے..... اس کی سانس ضروری ہے اور تب کیا ہوگا؟

کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ جاردن روپٹ لے گی.....

مردہ دل ہو جائے گی مگر پھر اگر زندگی ہوئی نا تو وہ اسے

خود..... گھٹنوں پر ٹیک کر زندہ رہنے پر مجبور کرے گی۔

محبت کے بنا بندہ جی سکتا ہے حسان صاحب! پر سانس

کے بنا نہیں۔

ہوگا۔ ہماری نسلیں آپ کے پاؤں دھو دھو کر پئیں گی اور

بچے آپ کے نام کا تعویذ پہنا کر بن گئے۔“

وہ ایک کاغذ اس کے سامنے بٹختے ہوئے بولی اور

ایسا کرتے ہوئے اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

ناک سرخ ہو رہی تھی اور ہونٹ لرز لرز کر اندر کی حالت

بیان کر رہے تھے..... اور حسان بن زیدیوں ساکت بیٹھا

تھا کہ جیسے ہوتو برف کا مجسمہ مگر کھلنے کو تیار.....

”زندگی دینے والی ذات بے شک اللہ کی ہے

حسان بن زید مگر یاد رکھیے گا..... یاد رکھیے گا کہ وسیلہ ہمیشہ

وہ انسان کو ہی بناتا ہے۔“

اور اس نے ایک اور آنچ دینا جملہ پھینکا تھا۔ وہ

کچھ اور کھلا تھا۔

☆☆☆

8 جولائی 2018ء۔

صبح سے دن ڈھلا۔ دوپہر ہوئی۔ سہ پہر آن

پہنچی مگر وہ نہیں آیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ علینا کا

دل یوں جیسے گھٹ گھٹ جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ آج

تو دل بند ہو کر ہی رہے گا۔ وہ نہیں آیا تو؟.....

اور اس کے بعد، اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں

اور چھلک چھلک پڑتی تھیں۔

اس نے چاہا کہ وہ اسے ایک کال کرے مگر

ذہن نے کہا توڑ انتظار، دل نے کہا نہیں نہیں انتظار

جان لیوا ہے۔ عزت نفس نے بھی ہش ہش کر کے

چپ کر دانا چاہا مگر وہ جو اندر بیڈ پر سویوں اور نالیوں

میں جکڑی پڑی تھی۔

وہ جو کہ کمبو نہ کروائے پر بعد تھی، وہ جو کہ کسی

نرس، ڈاکٹر کو آتا دیکھ کر زور زور سے چیختی لگتی تھی۔

سونیاں چیخ چیخ کر جسم سے اتارنے لگتی تھی۔ ہاتھ مار

کر دوایاں گرا دیتی تھی۔

وہ اس کی ”زندگی“ تھی اور زندگی کے آگے کیا

دماغ اور کہاں کی عزت نفس..... جو تیلے چل نہ ڈالے

وہ انہیں۔ اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کال

ملائی۔

بیاری ہے تو آپ کو اس کا واسطہ..... باپ جان ہے تو

میں ان کی جوتیوں کو ہاتھ لگاتی ہوں..... اور اگر اللہ

آپ کا بھی رب ہے تو اس کی ربانیت کا واسطہ۔ خدارا

آجائیں۔“

وہ ہلکتے، سکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اس کا

سکنا، بلکنا دل کو درد سے بھر رہا تھا۔

”میں یہاں ریسپشن پہ ہوں۔ کمرہ نمبر بتائیے

پلیز!.....“

اور وہ آواز نہ تھی..... آپ حیات تھا۔ اس نے

فون بند بھی نہ کیا..... ایک دم پھینکا اور روتے ہوئے

ریسپشن کی طرف بھاگی تھی۔ اور اسے دیکھ کر.....

عین اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر

گری اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ

پھوٹ کر رو دی تھی۔

”اب سیرہ کیسے نہ کروائے گی کمبو..... ہاں تو

سیرہ اب بولو..... کیسے نہ ہوگی۔“

☆☆☆

”سیرہ.....!“ اور اس نے نیزا ریت سے اسے

دیکھا۔

”حسان بن زید آیا ہے۔“ اور سیرہ اس کی آنکھ

اس جملے پر حیرت کی آخری حد تک پھیل گئی۔ وہ اگر

اتنی توانا ہوتی کہ اک پھینکا کھا کر اٹھ بیٹھتی تو وہ یہ ضرور

کرتی۔ اتنی سکت ہوتی کہ وہ دوڑ کر دروازہ کھول کر

دیکھ کر یقین کرتی تو وہ ضرور دوڑ کر دروازہ کھولتی۔ سیرہ

فی الوقت حیران ہو سکتی تھی بہت حیران! سو وہ

ہوئی.....

اس نے بے یقینی سے دروازے کی سمت

دیکھا..... اور دروازہ آہستہ سے کھلا..... وہ اسٹک اور

ہاتھ کی مدد سے ٹولتے ہوئے آگے بڑھا۔

”سیرہ.....؟“ اس نے پکارا۔ مگر سیرہ تو

ساکت تھی..... اک دم ساکت۔ جواب دیتی تو دیتی

کیسے؟

”پلیز یہاں بیٹھیے.....!“ علینا نے مدد کی۔ وہ

اسی طرح سے ٹولتے ہوئے آگے بڑھا۔

”کیسی ہو؟“ نرم سا لہجہ اور سیرہ کی آنکھ بھر

آئی۔ وہ نیچے پر سر رکھے، گردن موڑ کر اسے ایک ٹک

تک رہی تھی۔

”علینا! کیا آپ ذرا سا وقت دیں گی، ہمیں؟“

”شش..... شیور!.....“ علینا بھڑائی آواز میں

کہتے ہوئے وہاں سے ہٹی تھی۔ اور اب..... حسب

دستور خاموشی۔

اثر بھی لے رہا ہوں تیری چپ کا

تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں

”مجھے کہا گیا کہ سیرہ مجھے آنکھیں ڈونٹ کرنا

چاہتی ہے مگر سیرہ کو کیا معلوم..... کہ جب سے وہ

مساوات برابری کرنے کے لیے دے آئی ہے مساوات

حل نہیں ہوئی۔ کسی طرح سے برابر نہیں ہوئی۔ اور لو

بھی میری یکسوئی تو نکل گئی ناک کی راہ پکڑ کر۔

بولو سیرہ! اب بھلا کریں تو کیا کریں؟.....“

اور سیرہ وہ روتے روتے ہنس دی۔

”مساوات برابر کرو حسان بن زید.....

ہمدردی نہ کرو۔“ وہ کبھی سی آواز کے ساتھ جھنجھٹے انداز

میں بولی۔

”ہمدردی کرنی ہوتی تو اسی لمحے ہوتی سیرہ

غفارا! جب حسان بن زید ہمیں شٹ اپ بولتا.....

یوں کرے سے باہر جانے دیتا جب کہ اسے تمہاری

طبیعت کا معلوم بھی ہو چکا ہو۔“ سچ میں ذرا سے

جھوٹ کی آمیزش ہوئی۔

”جان آگے ہی رخصت پہ جا رہی ہے حسان!

یوں تو نہ مارو.....!“ اور وہ بے طرح سے رو دی۔

”سنو سیرہ غفارا..... سنو! حسان بن زید تمہاری

آنکھوں سے نہیں..... تمہاری آنکھوں کو“ دیکھنا چاہتا

ہے۔“ اور وہاں کوئی خوشبو بہار کے جھوٹے کی صورت

پھٹی اور سیرہ غفارا کے ہنسنے سے ہوتے ہوئے اس

کے پورے وجود کو ہکا بکا کر گئی تھی۔

”میں ذرا ڈاکٹر سے کل کی ٹائمنگ پتا کروں

اور تم!..... خبردار اب جو تم نے ذرا سی بھی بدتمیزی کی۔

کر.....“



مسکراتے لیوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا..... یوں جیسے وہ دیکھ ہی لے گا۔

”حسان! یہ ہمدردی ہوئی یا جھوٹ ہونا تو جان لینا تمہاری جان سے کم پر نہیں ٹلوں گی میں!“ اور وہ ہنس دیا۔ ”اور اس سب کے لیے تمہاری صحت شرط ہے۔“ سیرہ نے جیسے ہار مان کر اسے دیکھا تھا۔ اندر اس کا علاج ہو رہا تھا اور باہر حسان کے کانوں میں اس کی آواز گونجتی تھی۔

”حسان! پہلے میں مرنا چاہتی تھی۔ خود مرنا چاہتی تھی اور اب اگر میں مر گئی تو خود کو بھی معاف نہ کروں گی..... اور اللہ بھی مجھے میری اس غلطی کے لیے معاف نہ کرے۔“

اف وہ شدت پسند لڑکی..... لیکن ہر محبت کرنے والا شدت پسندی تو ہوتا ہے۔ سیرہ بھی تھی۔ لمحہ لمحہ جیسے اپنے ساتھ پتھر کی بھاری سل باندھ لایا تھا۔ دل پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور حسان شدت سے منتظر تھا..... شدت سے چاہتا تھا کہ اس کے کان اک ایسی آواز سنیں جو یہ کہے کہ سیرہ اب ٹھیک ہے۔ کبھی کا کامیاب سائیکل ہوا۔

اس موت جیسے سرد کوریڈور میں بیٹھے، انتظار کی سل میں لیٹے..... اس کی آنکھ سے اک قطرہ گرا تھا۔ اور وہ قطرہ نہ تھا..... وہ محبت کی پہلی بوند تھی کہ جو سیرہ

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ گلیاں یہ چوہارے

فائزہ افتخار

قیمت - 400 روپے

ملتان کا بندہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

کی محبت میں گری تھی۔

”زندگی دینے والی ذات ہے شک اللہ کی ہے مگر وسیلہ وہ ہمیشہ انسان کو ہی بناتا ہے۔“ اور وہ وسیلہ بنایا گیا تھا۔ وہ چن لیا گیا تھا۔ اس کے دل کو سیرہ کے لیے نرم کر دیا گیا کہ سیرہ کو ابھی مرنا نہیں تھا..... اسے جینا تھا۔ حسان بن زید کے ساتھ اور حسان کا وسیلہ..... وہ سیرہ تھی..... سیرہ کیا پتا کون کی ذور وقت کے کسی لمحے میں اسے آن لے اور پھر وہ سیرہ کی آنکھوں سے نہیں سیرہ کی آنکھوں کو دیکھے۔ اور اس لمحے حسان بن زید نے شدت سے خواہش کی..... بری طرح سے ٹوٹ کر دعا کی..... اتنی کہ جو آج تک نہ کی تھی۔ اسے سیرہ کی آنکھیں دیکھنی تھیں اس لیے اسے میرے رب

اسے زندگی بخشے والے، اے روشنیوں کے خالق تو نور ہے سو میری آنکھوں کو بھی نور سے بھر دے۔

”محبت بڑی ہی Odd شے ہے کہ یہ even ہو نہیں سکتی اور یاد رکھیے! گاریاضی کا ایک اصول ہوتا ہے کہ دو Odd نمبر مل کر ہمیشہ ایک even نمبر بناتے ہیں۔“

اس کمرے کا دروازہ کھلا..... ساعتوں نے وہ آواز جیسے اچک لی تھی..... گھبراہٹ میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دل کی دھک دھک جیسے کچھ اور سننے نہ دیتی تھی مگر اس کی سماعتوں نے اس دھک دھک کے شور میں بھی سنا.....

”شی از فائن ناؤ۔ تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔“ اور اس نے ایک گہرا سکون بھرا سانس لے کر آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا۔ علیٰ کچھ کہہ رہی تھی مگر اسے سنائی نہ دیتا تھا اور کراچی کے ایک اسپتال میں ایڈمی صاحب نے دم توڑا تھا۔

”اور وہ اب ہے..... جو زندگیاں بخشا بھی ہے اور لیتا بھی ہے۔“



## بہنوں شمع کا اپنا مابینامہ

### اپریل 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا

اپریل 2019

کے شمارے کی ایک جھلک



✽ ”اس آسمان کا چاند“ حیا بخاری کا مکمل ناول،

✽ ”ابرم ہے تو“ شیریں ملک کا مکمل ناول،

✽ ”شہر تمنا“ نعیمہ ناز کا سلسلے دار ناول،

✽ ”شہر زاو“ صائمہ اکرم چوہدری کا ناول،

✽ ”شام کی حویلی میں“ رخسانہ نگار عدنان کا ناول،

✽ ”سین کا سرال“ راشدہ رفعت کا ناول،

✽ افشین نعیم، عندلیب زہرا، نذیر فاطمہ، عائشہ تنویر اور سویرا ملک کے افسانے،

✽ معروف اداکار ”احمد میر“ سے ملاقات،

✽ ”دستک“ فنکاروں سے تعارف کا سلسلہ،

✽ ”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ قارئین کا سلسلہ،

✽ ”شمع کے ساتھ ساتھ“ قارئین سے سروے،

✽ ”بیارے نبی علیہ السلام کی بیماریاں“،

✽ خط آپ کے اور دیگر مستقل مستقل سلسلے شامل ہیں،

شمع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں، ہمیں خط لکھنا نہ بھولے گا۔

شمع اپریل 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں



عمیرہ احمد

## الحق

حسن جہاں سے زندگی میں ایک غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن وہ بھی معاف نہیں کی گئی، وہ بار بار خط لکھ کر اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے۔

ایک پھر تو اسے اللہ تعالیٰ کو خط لکھتا ہے اور اسے ایک درخت کے تنے میں رکھ دیتا ہے۔ وہ جواب کا منتظر ہے ایک دن ماں بتاتی ہے کہ اس کے خط کا جواب آگیا ہے۔

ایک بوڑھا خطاط آیت کی خطاطی کر رہا ہے۔ ایک دم اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسے اپنے گرد روشنیوں کا ہالہ رقصاں نظر آتا ہے۔

قلب مومن انڈسٹری کا کامیاب ترین ڈائریکٹر ہے۔ اسے خود پر اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ مومن سلطان ایک باصلاحیت فنکار ہے لیکن اسے اب تک اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی موقع نہیں ملا ہے۔ انڈسٹری میں ہیر وٹس اس کے ٹیلنٹ سے خائف ہیں، وہ اسے آگے نہیں آنے دیتیں۔

مومن کا باپ سلطان میک اپ آرٹسٹ ہے۔ وہ اداکارہ حسن جہاں کا میک اپ مین رہ چکا ہے اور اس کا بہت بڑا مداح ہے۔ اب بیماری کی وجہ سے انڈسٹری سے آؤٹ ہے۔ مومن کی ماں ثریا بھی اپنے وقت کی اداکارہ ہے۔ اب انڈسٹری نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مومن کے اکلوتے بھائی جہانگیر کے گردے جواب دے چکے ہیں۔ وہ ڈائریکٹر پر ہے



گردے کے ٹرانسپلانٹ کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ مومن فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فلم انڈسٹری پسند نہیں ہے لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔

## نویں قدم





میرے استاد محترم!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ سے مل کر آیا ہوں اور ابھی تک حذر زدہ پھر رہا ہوں۔ پیرس فشن ویک میں شرکت کے لیے پیرس آیا ہوا ہوں اور ہر شام شانزے لیزے پر دنیا کی چکا چوند میں سے گزرتے ہوئے آپ کو یاد کرتا ہوں۔

خوب صورت عورتوں کے ہجوم میں جینگے ترین برانڈز کی یلغار میں دنیا کی اس بھیڑ میں سکون صرف اُس تخلیق میں ہے جو آپ کرتے ہیں، وہاں ترکی کے اُس چھوٹے سے گھر کی خاموشی اور سکون شانزے لیزے کی اس چکا چوند پر بھاری پڑتی ہے۔

آپ کے پاس اُس گھر میں بیٹھ کر مجھے نہ پیرس یاد آتا تھا، نہ میلان مگر یہاں اس دنیا میں گھومتے ہوئے آپ کی باتیں اور آپ کی خطاطی میرے ساتھ گھومتی ہے، میرا سایہ بن کر..... نہ میں کان بند کر سکتا ہوں نہ آنکھیں..... کر بھی لوں تو فرق نہیں پڑے گا، آپ تو کہیں دل اور دماغ کا حصہ بن گئے ہیں..... یا شاید روح کا.....

بڑا غلط کیا آپ نے اسے بیدار کر کے..... اب یہ اس ہجوم کے بیچ میں رہنا نہیں چاہتی جہاں میں رہتا ہوں، مجھ سے اپنے جیسوں کی محبت مانتی ہے..... وہ میں اسے کہاں سے لا کر دوں عبدالعلی صاحب؟ میں تو آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو جانتا ہی نہیں جس کے پاس یہ خوش ہو جائے اور اسے خوش کرنے کی تلاش میں نکلوں گا تو دنیا چھوڑنی پڑے گی، وہ میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس ”دنیا“ کو پانے کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔ اس دنیا کو پا کر کھودینے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ آپ تو مومن ہیں، آپ نے سچی ”دنیا“ کی تسنن کی ہی نہیں۔ وہ بار بار چل کر آپ کے پاس آئی بھی تو آپ نے اپنی روح کے دروازے بند رکھے۔ مگر آپ کسی ایسے کو جانتے ہیں جو دنیا کو پا کر اسے خود کھودے؟ کوئی ایسا ملے تو مجھے ضرور ملوائیں اُس سے۔ ابراہیم کی مشکل شاید وہ ہی آسان کر دے۔

اس بار آپ کو دیکھ کر دل بڑا بوجھل ہوا، شاید اس لیے بھی زیادہ یاد آ رہے ہیں آپ..... آپ کو غم زدہ اور رنجیدہ دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ یاد آتے رہے۔

میں نے پہلی بار جانا، میرے یورپ آ جانے اور پیچھے سارے رابطے ختم کر دینے کے بعد وہ کیسے تڑپتے ہوں گے۔ ملے تو مر گیا، مگر میں نے تو زندہ ہوتے ہوئے بھی انہیں ترسا دیا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا عبدالعلی صاحب کہ یورپ آ کر پیچھے رہ گئے رشتوں کو بھول ہی گیا تھا میں..... گاؤں..... گھر..... ماں، باپ، بہن، بھائی..... سب..... آزاد پرندہ بن کر جینا چاہتا تھا میں، پر یہ یاد ہی نہیں رہا تھا مجھے کہ آزاد پرندہ اُڑتا آسمان میں ہے مگر گھونسلہ وہ بھی درخت پر ہی بناتا ہے جس کی جڑیں مٹی میں ہوتی ہیں۔

آپ ملے کے لیے غم کو دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ نہیں بھول رہے۔ آپ ظالم نہیں تھے پر میں ظالم تھا۔ ظالم کو اپنے ظلم کا احساس ہو کر تب تک مظلوم ہی نہ رہے تو پھر ظالم کیا کرے؟ میرے ماں باپ سالوں پہلے دنیا سے چلے گئے اور مجھے احساس زیاں آج ہو رہا ہے..... اب اگر تو یہ بھی کروں تو کس منہ سے کروں؟

میرا دل چاہتا ہے، میں آپ سے آپ کا غم بانٹ لوں۔ کاش غم کوئی چیز ہوتا جو میں آپ سے لے کر کہیں دور پھینک آتا۔

میں نہیں جانتا، آپ کا پچھتاوا کیا ہے جس کا بار بار ذکر کر کے آپ پچ ہو جاتے تھے۔ مگر میں یہ بھی نہیں جانتا، ملے کے پاس کیوں واپس نہیں آیا مگر میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اُس نے جو کیا کیوں کیا ہوگا..... پیار بہت کچھ بھلا دیتا ہے۔ رب سب سے پہلے..... ماں باپ اُس کے بعد..... دنیا سب سے آخر میں..... میں گزرا

ہوں اس راستے سے..... اس کے سبب شکیب جانتا ہوں اور فراز تو اس راستے میں کہیں ہے ہی نہیں اس کا کیا ذکر کروں۔

ملے کی بد قسمتی بس اتنی کہ اُس کی قسمت میں شو بزنس کی عورت لکھی تھی۔ میں پاکستان کے شو بزنس کو نہیں جانتا۔ اٹلی اور یورپ کے شو بزنس کو جانتا ہوں۔ شو بزنس کی عورت میں جیسا نہیں رہتی۔ یہ اُس پیشے کی مجبوری ہے پروفا کیوں نہیں ہوتی.....؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتیں۔ ملے نیک روح تھا، بھنگ گیا۔ شو بزنس بڑی ظالم دنیا ہے اور اس دنیا سے جڑنے والے بھی۔ یہ سراب بن کر نظروں کو بہکا تا ہے اور تب تک بہکا تا ہی رہتا ہے جب تک انسان اندھا نہ ہو جائے۔

آپ کی بہو ایک بُری عورت تھی، اس لیے آپ کے لیے آزمائش بن کر آئی۔ لیکن عبدالعلی صاحب یہ آزمائش آپ کی زندگی میں نہ آئی تو آپ کا مرتبہ کیسے بڑھتا۔ نیکوں کے راستے میں آزمائشیں آتی ہیں اور بُروں کے راستے میں نمل۔ یہ آپ ہی نے کہا تھا مجھے؟

استاد محترم! آپ کی باتیں آپ ہی کو لکھتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں میں۔ پر کیا کروں، آپ کو دلاسا دینا چاہتا ہوں اور اُس کے لیے میرے پاس لفظوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اگر میں کچھ کر سکتا ہوں آپ کے لیے تو مجھے حکم دیجیے۔ سید ابراہیم اُڑتا ہوا آئے گا۔ آپ کا بیٹا نہیں بن سکتا مگر آپ کا فرماں بردار ضرور ہو سکتا ہوں۔

ایک گمراہ  
سید ابراہیم

☆☆☆

وہ میز بہت سارے کاغذات سے بھری ہوئی تھی اور اُن کاغذات میں کیا کیا تھا، کوئی پہلی نظر میں جان بھی نہیں سکتا تھا۔ قلب مومن نے اُس میز پر ہمیشہ کھانا دیکھا تھا یا قہوہ یا پھر اخبار مگر اب اُن تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز دوبارہ اُس میز پر نہیں آنے والی تھی۔

وہ کتنے دن سے وہاں اُس گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں سے مل رہا تھا۔ وہ کتنی بھول گیا تھا۔ وہ کتنے دن سے وہاں آنے والی ڈاک بغیر کھولے اس میز پر ڈھیر کرنا جا رہا تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ غم میں نہیں تھا وہ حیرت میں بھی نہیں تھا۔ وہ کس کیفیت میں تھا؟ وہ یہ بوجھ نہیں پا رہا تھا۔ بے خبری کی وہ کون سی دنیا تھی جس میں وہ اب تک جیتا آتا تھا، وہ صرف یہ بوجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کسی سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اُس نے آخری بار انہیں آئی سی یو میں دیکھا تھا اور اُس کے وہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں بعد اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اُس ہسپتال میں اُن کو اُن آخری چند گھنٹوں میں ملنے کے لیے آنے والا واحد شخص نہیں تھا۔ وہ ہسپتال اُس کے آنے سے پہلے عبدالعلی کے اُن شاگردوں سے بھرا ہوا تھا جو اُن کے ہسپتال میں ہونے کا سن کر پتا نہیں کہاں کہاں سے آئے تھے اور قلب مومن کا عبدالعلی سے رشتہ جان کر اُس سے تعزیت کرنے لگے تھے۔

قلب مومن کا خیال تھا، اُسے اب عبدالعلی کی تدفین کے انتظامات کرنے پڑیں گے۔ اُسے یہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسٹیٹ کی طرف سے ان کی آخری رسومات ادا کی جارہی تھیں اور اس سب میں قلب مومن کی جیسے کوئی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بیک گراؤنڈ میں چلا گیا تھا۔ ایک خاموش تماشائی کے طور پر..... یا شاید اجنبی میں آ جانے والے تماشائی کے طور پر۔

انہیں اپنی زندگی میں قلب مومن کی ضرورت شاید رہی ہو۔ موت کے بعد نہیں رہی تھی۔ وہ مجمع جو انہیں دنیا سے رخصت کرنے کے لیے آیا تھا وہ کہاں کہاں سے آ رہا تھا اور کیوں آ رہا تھا۔ قلب مومن ششدر تھا۔ وہ



جانتا تھا۔ عبدالعلی نامور خطاط تھے مگر وہ ناموری کتنی تھی۔ قلب مومن نے اتنے سالوں میں یہ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اور اب جب وہ اُن کا مقام دیکھ رہا تھا تو وہ ششدر تھا۔  
آدھی رات کو وہ اُس میز پر پڑے اُن لفافوں کو باری باری کھولنے لگا تھا۔ وہ مختلف ممالک کے کلچرل مشنریز کی طرف سے آئے ہوئے تعزیتی پیغامات تھے۔ دُنیا کے بڑے بڑے آرٹ میوزیمز اور گیلریز سے آئے ہوئے تعزیتی خط۔ عبدالعلی کا کام کہاں کہاں نہیں رکھا ہوا تھا اور وہ اُن کا کلوتا پوتا اس سب سے بے خبر تھا۔  
اُس گھر میں رات کے اس پر عجیب سی خاموشی تھی اور اس خاموشی میں اگر کچھ تھا تو کاغذ کی آوازیں یا آتش دان میں چمکتی لکڑیوں کی آواز۔

قلب مومن نے ہاتھ میں پکڑا وہ سرکاری خط میز پر رکھ دیا جس میں حکومت جاپان نے عبدالعلی کے لیے بعد از مرگ ایک سول ایوارڈ دینے کی اطلاع دی تھی۔ اُس خط میں اس سے پہلے دیے جانے والے ایک اور ایوارڈ کا ذکر بھی تھا اور اس گھر میں قلب مومن نے کبھی نہیں ان ایوارڈز میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس گھر کی دیواروں پر مکمل اور نامکمل خطاطی کے نمونوں کے علاوہ کچھ اور تھا ہی نہیں۔ قلب مومن کے اپارٹمنٹ کے برعکس جو اُس نے ہر اُس "ثبوت" سے سجا رکھی تھیں جو دُنیا نے اُسے اُس کی نام وری کے لیے دیے تھے۔ اشتہار کی طرح۔

اور اُسی اپارٹمنٹ میں کھڑے ہو کر وہ عبدالعلی سے پوچھتا رہا تھا کہ اُنہیں اُن کے کام نے اتنے سالوں میں کیا دیا اور عبدالعلی بغیر گنائے چپ کھڑے اُس کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اور اب اُن کے جانے کے بعد اُن کے سامان میں قلب مومن وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جو دُنیا نے اُنہیں دیا تھا۔  
وہ کتنے دن اور کتنی راتوں سے نہیں سویا تھا، وہ جیسے کتنی بھول گیا تھا۔ اُسے عبدالعلی کے بارے میں سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ رونے کا بھی نہیں۔ پچھتانے کا بھی نہیں، اور اب اتنے دنوں کے بعد رات کے اُس پہر میں وہ جیسے یہی سارے کام کر رہا تھا۔  
"تو دادا! یہ تھے آپ۔۔۔ اور میں قلب مومن کبھی آپ کو جان ہی نہیں پایا۔۔۔ یا آپ نے جاننے دیا ہی نہیں۔"

ایک کے بعد ایک لفافہ کھولتے، اُن تعزیتی پیغامات پر نظر ڈالتے قلب مومن نے سن ذہن کے ساتھ سوچا تھا۔

"مجھے ساری دُنیا جانتی ہے۔ آپ کو کون جانتا ہے۔ آپ نے زندگی کے اتنے سال جس کام کو دیے اُس نے آپ کو کیا دیا۔۔۔ اور مجھے دیکھیں۔۔۔ مجھے کون نہیں جانتا۔" اُس نے دادا سے کہا تھا۔

Lourve میوزیم میں اُس ہفتہ کو The Last Master of Mohaqqiq کے نام کیا گیا تھا۔ قلب مومن نے ہاتھ میں پکڑے اُس اطلاع نامہ کو بھی بے حد خاموشی کے ساتھ کاغذوں کے اُسی ڈھیر پر رکھ دیا جنہیں کھولتے کھولتے اُس کے ہاتھ تھکنے لگے تھے۔

Lourve سے برٹش میوزیم، برٹش میوزیم سے یونائیٹڈ نیشنز کی جنرل اسمبلی۔ عبدالعلی کا کام ہر جگہ موجود تھا اور اب اُن کے کام کی تصاویر اخبارات کے اُس ڈھیر میں مختلف ہیڈنگز کے ساتھ تھیں جو اس گھر میں سالوں سے آتا تھا اور اتنے دنوں میں جمع ہوتے ہوئے رڈی کے ایک ڈھیر کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اُس رڈی کے ڈھیر کو قلب مومن اب کھنگال رہا تھا۔ اُس شخص کے بارے میں جاننے کے لیے جس کو اُس نے ساری عمر جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ اُسے ترکی کے بہترین بورڈنگ اسکول میں پڑھانا کیسے اور ڈکرا پائے تھے۔ اُسے امریکا کی اُس مہنگی

ترین یونیورسٹی میں کیسے پڑھاتے رہے تھے۔ قلب مومن کو آج اندازہ ہوا تھا۔ عبدالعلی کے لیے "دُنیا" جمع کرنا اتنا آسان تھا۔۔۔ چلتی بجانے جتنا۔۔۔ اور وہ پھر بھی اُس کی طرح اس پینٹ ہاؤس میں نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اُسی لکڑی کے چھوٹے سے گھر میں گزاری تھی۔ وہ سارے ایوارڈز جو انہیں دُنیا بھر کی حکومتوں اور آرٹ ایسوسی ایشنز کی طرف سے ملتے رہے تھے، وہ اسی گھر میں پڑے چند بکسوں میں بند تھے۔ دھول مٹی اور حالوں میں اُلٹے ہوئے۔۔۔ یوں جیسے لینے والے نے اپنے اُن اعزازات کو کبھی کھول کر دیکھا تک ہی نہ ہو۔ وہ گھر زندگی میں پہلی بار قلب مومن کے لیے بھول بھلیاں بن گیا تھا۔ وہاں بڑی ہر چیز عقل کو خیرہ کرنے والی۔۔۔ اور اُس گھر کا جانے والا مالک اُس کو سارے جواب دیتے ہوئے گونگا کر گیا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دیواروں پر لگی کیلی گرافیز کو اُس نے پہلی بار بغور دیکھنا شروع کیا۔  
"اور میں قلب مومن" عزت" اور شہرت میں کبھی تیز ہی نہیں کر سکا۔ نام اور ناموری کا فرق ہی نہیں پہچان سکا۔ کامیابی کا مفہوم ہی نہیں سمجھ پایا۔"

اُن کیلی گرافیز کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کو عبدالعلی کے جنازے کے مناظر نظر آنے لگے تھے۔ وہ ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ تھے جو عبدالعلی کے لیے نکل آئے تھے اور قلب مومن اُس میں چوٹی جیسا رہ گیا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو بھی وہ دُنیا سے اپنا آخری سفر اُسی شان و شوکت سے کرتے۔

"اور وہ جمع جو دادا کو آخری بار رخصت کرنے آیا تھا۔۔۔ وہ لاکھوں کا مجمع کیا صرف انسانوں کا تھا۔۔۔ یا پھر۔۔۔ اللہ کی بھیجی ہوئی ہر مخلوق بھی اُس میں جو عبدالعلی بن تراب کو آخری سلام پیش کرنے آئی تھی۔"

قلب مومن نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ وہاں اب جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دیوار پر لگے وہ خطاطی کے شاہکار۔ رات کے اس پہر جیسے عبدالعلی کی زندگی کی داستان قلب مومن کو سنانے میں مصروف تھے۔ ہر رنگ، ہر اسٹروک پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "میرا لکھنے والا اپنے عہد کا بڑا انسان تھا۔"

وہ اب دوسرے کمرے میں پڑا وہ صندوق کھولنے لگا تھا جس کے اوپر پینٹنگ کے بہت سارے پرش اور رنگ بڑے رہتے تھے اور قلب مومن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُس کے اندر کیا ہو سکتا تھا۔ مگر اب وہ اُسے کھول کر بیٹھا تھا۔

وہ سارے ایوارڈز اور اعزازات اُس صندوق میں اوپر نیچے پڑے ہوئے تھے جن کا ذکر وہ کچھ دیر پہلے اُن اخبارات اور لیٹرز میں پڑھ رہا تھا۔

"اور میں سمجھتا تھا، عبدالعلی بن تراب کو گھمنڈ ہے۔ ایسے کام کا گھمنڈ جو بے مقصد ہے۔ مگر عبدالعلی بن تراب نے تو اپنی ساری زندگی صرف اللہ کی بڑائی اور کبریائی بیان کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اپنی عظمت اور بڑائی بیان کرنے والی ہر شے تو چھپادی ہی انہوں نے۔" اُس نے اس صندوق کو دوبارہ بند کر دیا تھا۔

"وہ ٹھیک کہتے تھے، انہوں نے ساری زندگی اللہ کی کبریائی بیان کی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا، وہ اللہ کی نظر میں نہ رہتے۔" بند صندوق کے ڈھکنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔

"اور میں۔۔۔ میں کون ہوں؟ اللہ کی بڑائی بیان کرنے سے انکار کرنے والا۔۔۔ عبدالعلی کے خاندان کا آخری فرد۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

خسارہ ہی خسارہ تھا جو وہ اتنے سالوں میں جمع کر رہا تھا۔ اُس کے سارے اثاثے اپنے مالک سمیت پل بھر میں بے مول ہو گئے تھے اُس گھر میں پڑی چیزوں کے سامنے۔

"ہم بھتے ہیں جن چیزوں کو ہم خرید لیتے ہیں، حاصل کر لیتے ہیں ہم اُن کے مالک بن جاتے ہیں۔ ہم اُن کے مالک نہیں بنتے اُن کے غلام بنتے ہیں۔ وہ چیزیں ہماری مالک بن جاتی ہیں۔ اُن کی زندگیاں ہمارے گرد



نہیں گھومتیں، ہماری زندگیاں اُن کے گرد گھومنے لگتی ہیں۔“  
عبدالعلی نے ایک بار کہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اُسے عبدالعلی کی زندگی کی فلاسفی کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اُس کا خیال تھا، اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا بھی نہیں چاہیے۔ وہ انہیں ایک ”نا کام“ انسان سمجھتا رہا تھا کیونکہ اُس کا خیال تھا۔ اُن کا کام اُن کے لیے دنیا کی آسائش کا ڈھیر نہیں لگا سکتا تو وہ کام ”اچھا“ کام نہیں۔ وہ انسان ”کامیاب“ انسان نہیں۔ اور اب اُن کے جانے کے بعد کئی راتیں کو اسی طرح جاتے ہوئے وہ اس ”نا کام“ انسان کی کامیابی کو ماپنے کی کوششوں میں بے حال ہوا جا رہا تھا۔

عبدالعلی دین اور دنیا کو ساتھ لے کر جیسے تھے گرد دنیا کو اپنے اور حادی کے بغیر۔ وہ، قلب مومن صرف دنیا سمیٹے بیٹھا تھا اور دنیا اب آکٹوپس کی طرح اُسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ نکلنا چاہتا تھا اور نکل نہیں پاتا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا اور اُس کی ٹانگیں شل تھیں اور قلب مومن کو کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔  
زندگی میں بڑے ”سچ“ وقت پر سارے پردے اُس کی نظروں کے سامنے سے ہٹے تھے مگر بڑے غلط وقت پر اُسے اپنی زندگی کے بارے میں دوبارہ سوچنا پڑ گیا تھا۔  
اُسے اپنے ایئر منٹ کے لاؤنج میں لگی ہوئی عبدالعلی کی وہ پیٹنگ یاد آئی جو انہوں نے اُسے فلم میکنگ کو کیریئر بنانے کا فیصلہ کرنے پر اُس سال اُسے اُس کی سالگرہ پر دی تھی۔

ابھد نا الصراط مستقیم  
مجھے سیدھا راستہ دکھا

وہ سیدھا راستہ جو نہ GPRS دکھا سکتا ہے نہ عقل..... وہ راستہ جو دل کی گلیوں سے گزر کر روح تک پہنچتا ہے اور صرف ایمان کی روشنی میں نظر آتا ہے۔ قلب مومن اب ایمان کہاں سے لاتا۔  
وہ اُس رات عبدالعلی کے گھر میں بے مقصد پھرتا رہا تھا۔ ایک ایک کمرے کے سو سو چکر کاٹتے ہوئے..... اندر باہر..... اندر باہر..... پتا نہیں کیا تھا جو گم ہوا تھا..... پتا نہیں کیا تھا جو ڈھونڈنا تھا۔

☆☆☆

”مومنہ سلطان جنوبی ایشیا کی وہ پہلی ایکٹریس بن گئی ہیں جنہوں نے سپورٹنگ ایکٹریس کے رول کے لیے آسکر ایوارڈ جیتا ہے۔ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟“  
ریڈ کارپٹ پر ٹیلی سے انٹرویو کرنے پوچھا تھا۔ وہ ایک ایوارڈ شو میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھی مگر ایوارڈ شو سے پہلے ہونے والا وہ ریڈ کارپٹ چھپلے ویک اینڈ پر مومنہ سلطان کی اُس جیت سے شروع ہو کر بار بار اُسی پر ختم ہو رہا تھا۔ جو غیر متوقع تھی ناقابل یقین تھی..... مگر اس وقت پورے پاکستان کے لیے وہ بے پناہ خوشی اور فخر کا باعث بنی ہوئی تھی۔

پاکستانی میڈیا چھپلے کچھ مہینوں سے اُس کی آسکر کے لیے نامزدگی کو بھی اسی طرح کورتج دیتا آ رہا تھا جیسے وہ صرف نامزد ہونے پر ہی جیت گئی ہو اور اُس کا سفر بس اتنا ہی تھا۔ مگر وہ نامزد ہونے کے بعد آسکر جیت بھی جائے گی، اس کا یقین کسی کو ابھی تک نہیں آ رہا تھا۔ وہ پاکستان شو بزنڈ سٹری کے بڑے اور یادگار کموں میں سے ایک تھا اور اب اگر اُس کی گونج بار بار سنائی دے رہی تھی تو یہ کسی کے لیے بھی اچھی بات نہیں تھی۔  
ٹیلی نے اپنی پلیٹیں بے حد مصنوعی انداز میں جھپکائیں۔ اپنے گاؤں کو سیدھا کرتے ہوئے اُس نے انٹرویو کے بجائے کیرہ کو دیکھتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

”I am so proud of her.“..... میں نے خاص طور پر ایڈی ایوارڈ شو کی اس تقریب کو مومنہ سلطان کے لیے لائیو دیکھا تھا اور جب اُس کا نام وز کے طور پر پکارا گیا تو میں نے اتنی چیخیں ماریں خوشی میں کہ

اتنی چیخیں تو مومنہ سلطان نے بھی نہیں ماری ہوں گی۔“  
ٹیلی بے حد جذباتی انداز میں بات کرتی جا رہی تھی۔

”میں بتا نہیں سکتی اپنی فیلنگز۔“ اُس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ انٹرویو کرنے اُس کی بات کو درمیان سے کاٹتے ہوئے بے حد غیر جذباتی انداز میں اگلا سوال کیا۔  
”آج کس ڈیزائن کو پہنا ہوا ہے آپ نے؟“

ٹیلی ایک دم گڑبڑائی تھی۔ ابھی تو اُس نے جذباتی انداز میں اپنی آنکھوں میں آنے والے وہ آنسو بھی صاف کرنے تھے جو اُمڈ ہی نہیں رہے تھے تب ہی اُس کے ریڈ کارپٹ پر مومنہ سلطان کے بارے میں دیے گئے ممتکس کو جھٹکیوں میں جگہ ملتی۔

”میں..... ہاں یہ HSY ہے..... as always۔“ اُس نے لمحہ بھر لگایا تھا جذباتی سے غیر جذباتی ہونے میں۔ اب وہ اپنا گاؤں جھک کر دکھا رہی تھی۔ کسی دوسرے کی کامیابی کے بارے میں بات کرنے سے زیادہ تکلیف دہ کام دنیا میں کوئی نہیں ہوتا اور وہ بھی اپنے شو بزنڈ کے ساتھیوں کے بارے میں..... ٹیلی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ مومنہ سلطان پر حسد اور رشک وہ کر چکی تھی۔ اب اُسے اُس سے موازنے اور مقابلے کا مسئلہ تھا۔

”آپ کی اگلی فلم قلب مومن کے ساتھ تھی..... وہ کب شروع ہو رہی ہے؟“ انٹرویو گارڈن کو سراہنے کے بعد سیدھا اُس کی دکھتی رگ پر آیا تھا..... قلب مومن کی spiritual فلم جواب فلم انڈسٹری میں قلب مومن کی نفسیاتی فلم کے طور پر مشہور تھی۔

”ہاں..... وہ..... بہت جلد..... اپ ڈیٹ دوں گی جلدی۔“

ٹیلی نے مسکراہٹوں کے جلوے بکھیرتے ہوئے جیسے اپنی عزت بچائی اور دل ہی دل میں قلب مومن کو چار گالیاں اور دیں۔ وہ اتنے مہینوں سے گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھا اور وہ اُسے فلم کی ڈش دے کر پھنس گئی تھی اور دنیا مومنہ سلطان کا طواف کرنے میں مشغول تھی۔

☆☆☆

”اس وقت ہم مومنہ سلطان کے پرانے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں مومنہ سلطان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا وقت گزارا اور یہاں پر لوگوں کی خوشی دیدنی ہے۔ ہم اُن کے ایک ہمسائے سے ابھی ابھی بات کر کے ہٹے ہیں اور اب ہم اُن کے علاقے کے ایک اور ساتھی سے آپ کی ملاقات کر دیتے ہیں اور اُن کے تاثرات آپ کو سنواتے ہیں۔“

نیوز رپورٹر خوشی اور سینے دونوں سے بے حال تھا اور گلی میں اُس کے گرد لوگوں کا جھوم تھا جو ہر قیمت پر کیرہ کے فریم میں آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رپورٹر اب جھوم سے بات کرنے لگا تھا۔

”میں تو جی اُس دن سے ناچ رہی ہوں جس دن سے ایوارڈ ملا ہے..... ٹک ہی نہیں رہی جی میں..... مجھے تو ہمیشہ سے پتا تھا کہ مومنہ باجی نے کوئی بڑا ہی کام کرنا ہے۔ میں تو کبھی رہتی تھی انہیں۔“ جھوم نے شاید اور بھی کچھ کہنا چاہا تھا مگر نیوز رپورٹر نے مداخلت کرتے ہوئے اُس کی بات سچ میں کافی تھی اور واپس اسٹوڈیو چلنے کا اعلان کیا تھا۔

ایل ای ڈی پر اب وہ نیوز کا ستر آنے لگی تھی جو اسٹوڈیو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”ابھی آپ نے اسپیشل رپورٹ دیکھی ہے مومنہ سلطان کے آسکر کی جیت کے بعد عوام کا رد عمل اور اُن کے اپنے سننے اور پرانے علاقے کے رہائشیوں کے اُن کی اس جیت پر تاثرات..... ہم آپ کو یہاں یہ بتاتے







لینے جاؤ گی..... پھر اسبچ کرنا اور میرا جینک پکڑنا کہ اگر جہانگیر نہ ہوتا تو۔۔۔

اس کے کانوں میں جہانگیر کی آواز گونجی تھی۔ وہ جانے سے پہلے جیسے اُس کی قسمت کا حال بتا کر گیا تھا اور مومن نے اسکر ایوارڈ لیتے ہوئے جہانگیر کو وہ ایوارڈ ڈیڈی کیٹ کیا تھا بالکل ان ہی الفاظ میں اُس کا شکر یہ ادا کیا تھا جن میں اُس نے کہا تھا۔

”جہانگیر نہ ہوتا تو مومن سلطان آج یہ ایوارڈ لیے یہاں کھڑی نہ ہوتی۔ اُس کے ہونے نے مجھے ایک اداکارہ بنایا۔ اُس کے نہ ہونے نے ایک ستارہ..... وہ نہیں آسمان میں آج یہ ثرائی تھاے مجھے دیکھ رہا ہوگا اور منتظر ہوگا کہ میں اُس کا نام لوں اور شکر یہ ادا کروں تو جہانگیر تمہارا بہت بہت شکر یہ تم نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔“ اُس کے کانوں میں اپنی بھرائی ہوئی آواز اور گونجتی ہوئی تالیوں میں جہانگیر کے لیے کہے ہوئے لفظ اس خاموشی میں بھی بازگشت کی طرح گونجنے لگے تھے۔ وہ پچھلی رات پاکستان آئی تھی اور آنے کے بعد سب سے پہلے جہانگیر کی قبر پر گئی تھی۔ اُسے آسکر دکھانے۔ یوں جیسے اُس آسکر کو حاصل کرنے کا سارا مقصد ہی یہ تھا۔

میز پر پڑا نوں اٹھا کر اُس نے اُس کی سکرین دیکھی۔ وہ ایروپلین موڈ میں تھا اور بے حد شائستہ تھا نہ وہاں کوئی پیغام تھا نہ کوئی مسد کال، نہ کوئی آنے والی کال نہ کوئی آنے والی میٹنگ کی یاد دہانی..... اور اب وہ اُسے آن کرئی تو یک دم بار بار اُسے اپنا سانس بحال کرنے کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی..... نام کے لیے.....؟ ناموری کے لیے.....؟ شہرت کے لیے.....؟ کامیابی کے لیے.....؟ رزق کے لیے.....؟ یہ سب اب تھا اُس کے پاس ان میں سے کسی چیز کے لیے بھاگنا نہیں پڑ رہا تھا اُسے۔ مگر اس کے آگے کیا تھا اور اس سب کے بعد کیا تھا یہ وہاں بیٹھے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”What is next to ecstasy?“ اُس نے ”چیر کامل“ میں ایک جگہ پڑھا تھا اور اب وہ خود سے وہی سوال کر رہی تھی۔

”کامیابی کے بعد کیا.....؟ اُس سے بڑھ کر اور کیا؟“

☆☆☆

”یار! کوئی اس طرح تھوڑی کرتا ہے جس طرح مومن بھائی نے کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ دادا کی ڈیجھ ہوگی لیکن مہینوں عاقب ہو جاؤ..... نہ بیچ کا جواب دو نہ نوں اٹھاؤ نہ ای میل کھولو اگلا خوار ہو جائے۔“ داؤد اُس شام بُری طرح تپا ہوا تھا۔

وہ مومن کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ اُس کی اور بیٹا کی روز کی روٹین تھی وہ بے مقصد وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ کام کرنے کے لیے نہیں تھا اور جو بھی تھا وہ التوا میں رہ چلا گیا تھا کیونکہ مومن یہاں نہیں تھا، اور اُس کے بغیر کمپنی کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں کمپنی کے باقی لوگوں کی طرح ہر روز آتے اور بیٹھ کر قلب مومن کے نمبر پر کالز اور ای میل ایڈریس پر میسر کرتے رہتے اور پھر تھک ہار کر اٹھ جاتے۔ وہ ترکی میں تھا مگر کس حالت میں تھا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ اب تنگ آ چکے تھے۔

”بغیر پے کے اتنے مہینوں سے بیٹھے ہیں اور مومن بھائی کو احساس تک نہیں ہے۔“ داؤد واقعی بُری طرح گبڑا ہوا تھا۔

”میں نے تو اب پہلی فرصت میں کوئی بھی کمپنی جو آئن کر لیتی ہے۔ جہاں سے بھی مجھے لیٹر آ گیا۔“ بیٹا نے جیسے اعلان کیا تھا۔

”اور میری تو قسمت خراب ہے، جہاں اپلائی کر رہا ہوں۔ آگے سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔“ داؤد نے جیسے انا اللہ و اللہ دہا۔

اس سے پہلے کہ بیٹا کچھ کہتی، دروازہ کھول کر ایک شخص اندر آیا تھا اور پہلی نظر میں بیٹا اور داؤد نے اُسے پہچانا ہی نہیں تھا..... وہ قلب مومن تھا۔ آنکھوں کے گرد جلتے، بڑھی ہوئی شیو، بے ترتیب بالوں کے ساتھ..... وہ دونوں بے اختیار اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔

”مومن بھائی..... واٹ اے سر پرائز..... آپ کب آئے؟“ داؤد نے بے اختیار لپک کر اُس سے گلے ملنے ہوئے کہا۔

”ابھی ایک گھنٹہ پہلے..... ایرپورٹ سے سیدھا آفس ہی آیا ہوں..... یہ اسکرپٹ دینے..... بل اس پر میٹنگ کروں گا تم لوگوں کے ساتھ..... فی الحال گھر جا رہا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے اُن کی میز پر ایک اسکرپٹ رکھتا ہواڑ کے بغیر اور اُن کی کوئی بات سے بغیر چلا گیا تھا۔

داؤد نے میز پر پڑا ہوا وہ اسکرپٹ اٹھا یا۔ اُس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

”الف..... اے اسٹوری اینڈ فلم بالی قلب مومن۔“

”یہ ترکی میں بیٹھ کر یہ کرتے رہے ہیں؟“ اُس نے جیسے بے یقینی کے عالم میں اُس اسکرپٹ کے صفحے اُلٹتے ہوئے کہا تھا۔

”میرا سوال یہ ہے کہ اس اسکرپٹ کو پڑھے گا کون؟“ بیٹا نے اُس کی بات کے جواب میں اتنی ہی سنجیدگی سے کہا۔

”دونوں کو ہی پڑھنا ہوگا..... اگر میٹنگ ہے تو ظاہر ہے پوچھیں گے وہ کہانی کے بارے میں۔“ داؤد نے کہا۔

”تم پڑھ کر سنا دینا مجھے کہانی..... میں اپنی رات اسے پڑھنے میں ضائع نہیں کر سکتی..... میرا motivation level اس وقت بہت لو ہے ویسے ہی۔“ بیٹا نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اپنے بیک میں ڈالیں، وہ آفس سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اُس کا اپارٹمنٹ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہاں شکور اُس کا استقبال کرنے کو نہیں تھا۔ شاید وہ چھٹی پر چلا گیا ہوگا۔ مومن نے اپنے پاس موجود کی کارڈ کا استعمال کرتے ہوئے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول لیا تھا۔ تو بجے بھی اُس کا اپارٹمنٹ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے باری باری لائٹس آن کرنا شروع کیں۔ اپارٹمنٹ صاف تھا یعنی شکور چھٹی پر نہیں گیا تھا اور اگر گیا بھی تھا تو اُسے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اُس گھر میں کھڑے کھڑے مومن کو اپنا آپ وہاں بے حد غیر لگایوں جیسے وہ کسی غلط جگہ آ گیا تھا ایک بار پھر سے..... کعبہ سے بت کدہ میں..... اور اُس بت کدہ میں بتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا..... جگہ جگہ..... اور ویسے ہی بہت سارے بت اُس کے اندر بھی تھے جنہیں وہ تو ڈر کر آیا تھا تو اب باہر پڑے ”بت“، ”بت“ لگنے لگے تھے..... خدا نہیں۔

اور اُس بت کدہ کے بچوں بیچ جلتے جلتے وہ ایک بار پھر اُس پینٹنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جس پر احدنا الصراط المستقیم کی آیات جگمگ رہی تھیں۔

قلب مومن چلتے ہوئے اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے اندھیرے سے روشنی میں آ کر کھڑا ہوا تھا۔

”میرے مومن کو سیدھا راستہ دکھا۔ وہ راستہ جس پر فلاح ہے نہ کہ وہ راستہ جس پر صرف کامیابی ہے۔“ اُس کے کانوں میں دادا کی آواز گونجی تھی اور اُس کی آنکھوں میں پانی اٹھ رہا تھا۔ یہ پانی پتا نہیں دل کی کون سی نرم مٹی سے پھوٹنے لگا تھا۔ وہ تو رو یا نہیں کرتا تھا۔ آنسو بہانا تو قلب مومن کا شیوہ ہی نہیں تھا اور اظہارِ ندامت کرنا اُس کی ڈکٹری میں جرم تھا۔ پر اُس پینٹنگ کے سامنے کھڑا قلب مومن اپنا دل ٹٹول رہا تھا اور جیسے اُس



روح میں جان پھونکنے کی کوشش کر رہا تھا جو اُس کے اندر تھی مگر بے جان تھی۔

☆☆☆

”میں نہیں مانتی، یہ اسکرپٹ مومن نے لکھا ہے۔ وہ یہ لکھ ہی نہیں سکتا۔“

”ٹینا دوسرے دن اپنے آفس میں بیٹھے وہ اسکرپٹ کھولے بیٹھی رو رہی تھی اور ٹشو سے اپنی ناک اور آنکھیں رگڑتے ہوئے اُس نے سامنے بیٹھے داؤد سے کہا تھا۔ جو پچھلی رات یہ اسکرپٹ پڑھ آیا تھا اور اُس نے صبح سویرے سرخ آنکھوں کے ساتھ آفس میں ٹینا کو وہ اسکرپٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”You must read it.“ پاگل ہو گیا ہوں میں رات کو۔“ اُس نے ٹینا سے کہا تھا اور ٹینا کو لگا وہ مذاق کر رہا تھا یا شاید اُس اسکرپٹ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مگر دو گھنٹے بعد اب وہ اُس اسکرپٹ کو لیے کتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ انہوں نے ہی لکھا ہے مگر وہ اگر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ انہوں نے لکھا ہے تو جھوٹ تو نہیں بولا ہوگا۔“ داؤد نے اُس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

”کس کی کہانی لکھی ہے مومن نے؟..... ایک ایک صفحے پر مجھے لگتا ہے جیسے یہ کسی کی کہانی ہے جیسے یہ سب کسی پر گزر رہا ہے۔“ ٹینا اب ایک صفحے پر لکھی ہوئی لائنز پڑھ رہی تھی اور سر دھن رہی تھی۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ یہ سچی کہانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فلم سے انسپائرڈ ہو یا کسی ناول سے۔“ داؤد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”بالکل یہی بات ہے۔ بالکل انسپائرڈ ہے۔ مومن کتابیں بھی تو بہت پڑھتا ہے اور فلمز تو سارے زمانے کی دیکھتا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہیں سے چرائی ہے کہانی یا ملا کر بنائی ہے مگر جو بھی ہے، کمال ہے۔“ شان دار ہے۔“

ٹینا کہتے ہوئے اسکرپٹ کے صفحات کو پھر پلٹتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے پسندیدہ سبز اور لائنز کو انڈر لائن کرتی اور پھر بلند آواز میں داؤد کو نشانے لگتی اور وہ جواباً اُسے اگلی لائنز سناتا۔ وہ اسکرپٹ پہلی ریڈنگ میں ہی انہیں جیسے رٹ گیا تھا۔

”تمہیں پتا ہے عالیہ کا کردار کس کو کرنا چاہیے؟“ ٹینا نے یک دم اُس سے کیا۔ اُس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ اُس نے داؤد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے سوال نہیں کیا تھا۔ اُس کی رائے اُن کی تھی۔

”وہ نہیں کرے گی۔“ داؤد نے اُس ایڈیٹر لیس کا نام جیسے پہیلی کی طرح بوجھا تھا۔ جو ٹینا کے ذہن میں آئی تھی۔

”تمہیں بھی اُسی کا خیال آیا تھا نا؟“ ٹینا نے بھی اُس کے جواب کو بغیر سے جانا تھا۔ وہ ایکسائیٹڈ ہوئی تھی۔

”ہاں..... مگر مومن بھائی نے شبی کو کاسٹ کرنے کا کہا ہے اور شبی ہی سے بات کرنی ہے ہمیں۔“ داؤد نے دو ٹوک انداز میں اس بار اُس کی ایکسائیٹڈ ختم کی تھی۔

☆☆☆

”دادا جی بڑے نیک انسان، بڑی نیک روح تھے..... مجھے تو پتا تھا ہمیشہ سے..... نیکوں کو نیکوں کا پتا چل ہی جاتا ہے۔“

شکور نے ڈارڈر روتے ہوئے قلب مومن سے کہا تھا۔ وہ اُس سے عبدالحی کی تعزیت کر رہا تھا اور وہ بے حد خاموشی سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔

”میرے بارے میں کچھ کہا انہوں نے؟“ اپنی ناک رگڑتے ہوئے شکور کو یک دم خیال آیا۔ قلب مومن

نے سر اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”صرف یہ کہ شکور سے کہہ دوں کہ وہ جھوٹ چھوڑ دے۔“ شکور کا منہ چند لمحوں کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ جیسے رونا ہی بھول گیا تھا۔

”یہ دادا جی نے میرے لیے اس دنیا سے جانے سے پہلے کہا؟“ شکور کو یقین نہیں آیا تھا۔

”تم نے اس بلڈنگ کے چوکیدار سے کہا کہ میں اپنا پینٹ ہاؤس چھوڑ کر تبلیغ پر چلا گیا ہوں؟“ شکور کے آنسو بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہوئے تھے۔

”نہیں تو۔“ شکور کی سانس حلق میں اٹکی۔

”صبح سے پراپرٹی ڈیلرز کے فون بھگتا رہا ہوں میں، اور وہ سب تمہارے ریفرنس سے آرہے ہیں کیونکہ تمہارے ذمہ لگایا ہے میں نے یہ گھر بیچنا۔“ شکور قلب مومن کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ عبرانی زبان میں باتیں کر رہا ہو۔

”میرے بڑے دشمن ہیں مومن بھائی..... آپ کی نظروں میں گرانا چاہتے ہیں مجھے۔“ شکور نے بالآخر کہا۔

”انہیں جا کر پھر بتا دو کہ تم میری نظروں میں جتنا پہلے گرے ہوئے ہو اس سے زیادہ نہیں گر سکتے۔“ قلب مومن نے تنک کر کہا تھا۔

”ہاں، یہ بات ہوئی نا..... یہی جا کر کہوں گا..... آپ کو بس اسی طرح اعتبار ہونا چاہیے مجھ پر۔“ قلب مومن کی بات اُس کے سر کے اوپر سے گزری تھی یا اگر اُس کی سمجھ میں بھی آئی تھی تو اُس نے نا سمجھی کا مظاہرہ کیا تھا۔ قلب مومن نے اُس کے ساتھ مزید مغز ماری کا ارادہ ترک کر دیا۔

”تم کسی ماسٹر براہیم کو جانتے ہو؟“ اُس نے شکور سے پوچھا تھا۔

”وہ جو دادا جی کے دوست تھے اور جن سے دادا جی ملنے گئے تھے؟“ اُس نے چونک کر پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ قلب مومن نے مختصر کہا۔

”ہاں جی، جانتا ہوں۔“

”مجھے ملتا ہے اُن سے..... اُن کا پتا چاہیے۔“

شکور اُس کی بات پر سر کھانے لگا۔

”پتا تو نہیں ہے میرے پاس۔ بس علاقے کا پتا ہے۔ آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم منگوائی تھی میں نے اُن کے لیے..... پر پورا ایڈریس نہیں دیا تھا انہوں نے۔“

وہ فون نکال کر جیسے ایڈریس ڈھونڈنے لگا تھا۔

”تمہیں علاقے کا پتا ہے تو وہی بتا دو میں ڈھونڈ لوں گا انہیں۔“ قلب مومن بڑبڑایا تھا۔

”پر آپ ملنا کیوں چاہتے ہیں اُن سے؟“ شکور کو یک دم تجسس ہوا۔

”ہے کوئی بیڑی جو پاؤں سے اتارنا چاہتا ہوں۔“

اُس کا جملہ ایک بار پھر شکور کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”مومن بھائی صوفی ہو گئے ہیں۔“ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

”لیکن بس چہرے پر نور نہیں آیا جیسا دادا جی کے چہرے پر ہوتا تھا۔“ اُس نے چور نظروں سے صوفی پر

بیٹھے ہوئے قلب مومن کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اُسے یک دم کچھ یاد آیا۔

”کوئی خالق صاحب آتے رہے تھے آپ کے لئے.....“



فون نمبر دیا تھا مگر آپ کے فون پر ان کا آپ سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ ان کو داداجی کی وفات کا بھی پتا تھا۔“ شکور نے قلب مومن کو اطلاع دی۔  
”مجھے اپنا کارڈ دے کر گئے تھے۔ ترکی جاتے رہتے تھے داداجی کے پاس۔ مجھے بتایا تھا انہوں نے..... ویسے تو کہہ رہے تھے، دوبارہ آئیں گے فون بھی کریں گے۔“  
قلب مومن نے عدم دلچسپی سے اس کی بات کی تھی۔ اُسے فی الحال صرف ماسٹر ابراہیم سے ملنے میں دلچسپی تھی۔

☆☆☆

”شرم آئی چاہیے تم لوگوں کو یہ رول مجھے آخر کرتے ہوئے۔“ شبلی کا لب نہیں چلا تھا کہ وہ داؤد کے سر پر آفس میں بڑی کوئی چیز دے مارتی۔ وہ اپنا رول سننے آئی تھی اور اب غضب ناک تھی۔  
”اس سے بہتر میں نے کسی بہروں کا کریکٹر مومن کی کسی فلم میں نہیں دیکھا۔“ یتانے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ شبلی نے اُس کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔  
”سات سالہ بچے کی ماں؟..... میں کہاں نہیں سات سالہ بچے کی ماں لگتی ہوں؟“ وہ دھاڑی تھی۔  
”کتنی پرتیں اور شیڈز ہیں..... شادی سے پہلے کا پورا گھیرا سفر ہے۔“ اس بار داؤد نے کچھ بولنے کی کوشش کی تھی اور شبلی نے اُسے بھی بات پوری کرنے نہیں دی۔

”پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے وہ سارا گھیرا اور پھر پوری فلم میں، میں ایک بچہ لٹکا کر پھروں گی اور وہ بھی پہلے سات سال کا پھر اس سے بھی بڑا۔“ فارغا ڈسک..... مومن سے کہو فلمیں بنانا چھوڑ دے اور لکھنا تو مکمل طور پر..... رائٹر نہیں ہے وہ..... یہ کیڑا کیوں گھس گیا ہے اُس کے داغ میں۔ جب تک وہ اس فیر سے نکل نہیں آتا..... اُسے کہو وہ گھر بیٹھ جائے۔“ وہ دھاڑتے ہوئے اپنا بیک اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی اور چلتے چلتے اُس نے ایک دم ٹوک کر داؤد سے کہا۔

”اور ہاں اُسے یہ بھی بتادینا کہ میں نے احسن کی فلم سائن کر لی ہے۔ میرے پاس اب اس سال کسی اور فلم کے لیے ڈیش نہیں ہیں۔ ہاں اگر اُس نے ضمن بنانی ہو تو بتانا مجھے۔“ شبلی کہتے ہوئے اُس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی اور اس کے باہر جاتے ہی یتانہ کا چہرہ چھنے لگا تھا۔

”تھینک گاڈ۔ اس نے انکار کر دیا۔ یہ رول مومن سلطان کا ہے..... وہی کرے گی میں بتا رہی ہوں تمہیں۔ اُس کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا یہ رول۔“ یتانے داؤد کو چیخ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

☆☆☆

”ہاں ہاں مجھے پتا ہے تو نے ایسے ہی کہا تھا..... اب تجھے کیا پتا کتنی مصروف ہوں..... مومن آئی ہوئی ہے تو اُس کے لیے کھانا بنا رہی ہوں۔ تیری طرح وہ بھی ہر وقت فرمائشیں ہی کرتی رہتی ہے..... تجھے بتایا تو تھا میں نے اب وارڈ ملا ہے اُسے..... آسکر.....“

کو ریڈور میں سے گزرتے ہوئے مومن کو لگا ثریا کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کچن میں تھی اور ملازم ابھی کچھ دیر پہلے باہر گیا تھا پھر وہ کچن میں کس سے باتیں کر رہی تھی۔ مومن عجیب جس کے عالم میں کچن میں گئی تھی اور وہ دروازے سے اندر نہیں جا سکی۔ ثریا اب تو بے پروئی ڈالتے ہوئے بس رہی تھی اور پھر ہنستے ہوئے اُس نے کسی سے کہا تھا۔

”ہاں ہاں۔ گئے تھے ہم۔ وزیراعظم سے بھی ملے..... صدر سے بھی ملے..... تیری بہن کی اتنی عزت ہوئی وہاں..... تو ہوتا تو کتنی تصویریں بناتا..... ہاں ہاں پتا ہے مجھے.....“

مومن دروازے میں ساکت کھڑی ثریا کو دیکھتی رہی۔ وہ اُسی طرح باتیں کر رہی تھی اُس کی موجودگی سے بے خبر۔

”اماں کس سے باتیں کر رہی ہیں آپ؟“ اُس نے بالآخر ہمت کر کے جیسے انہیں مخاطب کیا تھا۔ ثریا نے چونک کر اُسے دیکھا پھر عجیب پر اسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”کس سے باتیں کروں گی..... تیرا بھائی جہانگیر ہے..... یہ دیکھ۔“ اُس نے اس طرح الماری کی طرف اشارہ کیا تھا جیسے وہ وہاں کھڑا تھا۔

مومن نے اضطراب کے عالم میں وہاں دیکھا تھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یہ وہ وہاں دیکھتے ہوئے بھی جانتی تھی۔

”اماں! یہاں کوئی نہیں ہے..... اور جہانگیر کیسے آسکتا ہے؟“ اُس نے ماں کو جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”لو بھلا..... اُس کی بہن کا گھر ہے، اُسے کون روکے گا..... اُس کا جب دل چاہتا ہے آ جاتا ہے۔ پھر میں اور وہ بیٹھ کے فلمیں دیکھتے ہیں۔“ ثریا نے اُس کی بات اس طرح نظر انداز کرتے ہوئے اُسے بتایا تھا جیسے وہ عقل سے پیدل تھی۔ جو وہ دیکھ رہی تھی، وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

مومن سلطان کچھ بھی بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ بس دروازے کی چوکٹ کے دونوں اطراف ہاتھ رکھے وہاں دم سادھے کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

”شیڈز فرینیا کی علامات ہیں۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے آپ کے بھائی کو دیکھ رہی ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی اُس کیوں نہیں کیا؟“

مومن سلطان نے سوچا تھا، اُس کی زندگی میں بُری خبریں اب نہیں رہیں..... کچھ دن تو اچھے گزرتے۔ سائیکا ٹرسٹ ثریا کے ساتھ کیے جانے والے سیشن کے بعد اُسے اپنی تھیں بتا رہا تھا اور وہ دم بخود رہی تھی۔

”میں پاکستان میں رہی ہی نہیں اتنے مہینے۔“ اُس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے سائیکا ٹرسٹ کو بتایا تھا۔

”اسی لیے آپ کو اندازہ نہیں ہوا..... ریگولر میڈیکیشن کرنی پڑے گی اور سیشنز بھی..... ابھی ابتدائی اسٹیج میں ہے یہ مرض..... وقت پر علاج ہو جائے گا تو کنٹرول ہو جائے گا۔“ وہ اُسے اُمید دلارہا تھا۔ مومن اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے صرف سر ہلاتی رہی تھی۔

”بائی داوے آپ کو آسکر جیتنے پر بہت بہت مبارک ہو..... آپ مومن سلطان ہیں نا؟“ سائیکا ٹرسٹ نے گفتگو کا اختتام کرتے ہوئے اُس وقت اُس سے کہا جب وہ کرسی سے اٹھ کر اُس کے آفس سے نکلنے والی تھی۔ اُس نے بمشکل شکریہ ادا کیا۔ بعض لمحوں میں آپ پہچانے نہیں جانا چاہتے۔ سیٹنگ لگا لینا چاہتے ہیں..... ماسک بڑھالینا چاہتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں آپ کو پہچانے جانے کے بعد یاد آتی ہیں۔

☆☆☆

وہ باہر نکلی تو ثریا اور سلطان دونوں باہر ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”بہت پیسہ آگیا ہے اس کے پاس..... خواتین ڈاکٹروں کے پاس چکر لگواتی ہے۔“ ثریا نے غصی سے اُس سے کہا تھا۔ اُس نے کچھ کہے بغیر ماں کا چہرہ دیکھا۔



”سب ٹھیک تو ہے نامومن؟“ سلطان نے جیسے ہنسی کے چہرے کو بڑھایا تھا۔

”ہاں اب! سب ٹھیک ہے۔“ مومن نے مسکراتے ہوئے باپ کو یقین دلایا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا..... مجھے کیا ہوا؟ دو گھنٹے سے بس باتیں ہی کیے جا رہا تھا وہ ڈاکٹر مجھ سے.....

آئندہ نہیں جاؤں گی اس کے پاس..... میرا دماغ کھا گیا۔“

”ٹھیک تھا انداز میں کہتے ہوئے کلینک سے باہر چل پڑی تھی۔

مومن مہکا گئی انداز میں فائل پکڑے اُن دونوں کے پیچھے چلی گئی تھی۔ سائیکل سٹ نے کہا تھا، اُسے شریا

کے ساتھ وقت گزارنا تھا اگر وہ یہ چاہتی تھی کہ اُس کا مرض نہ بڑھے اور وقت مومن سلطان کہاں سے ڈھونڈ کر

لائی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی۔ زندگی نہیں بھی باہر شاہ نہیں ہونے دیتی کہ سب کچھ ہی عطا کر دے زندگی ہمیں

ہمیشہ فقیر ہی رکھتی ہے۔ کسی نہ کسی شے سے محروم..... کسی نہ کسی شے کے لیے ترستا ہوا۔

☆☆☆

”پہلی فلم اور پہلی فلم پر ہی سپورٹنگ رول پر آسکر..... سفر اتنا آسان تھا کیا؟“ اپنے آفس میں بیٹھے آفس

میں گئی ایل ای ڈی پر آنے والے مومن سلطان کے ایک ٹی وی انٹرویو پر قلب مومن رک گیا تھا۔ مومن سلطان

کے آسکر کے بارے میں وہ واپس آ کر جانا تھا جہاں ٹی وی چینلوں پر پچھلے دو ہفتوں میں اس کے علاوہ کوئی اور خبر

بار بار دہرائی نہیں جا رہی تھی۔

”بالکل بھی نہیں..... ہر بڑی کامیابی کے پیچھے بہت بڑی قیمت ہوتی ہے۔“

اُس نے انٹرویو کو جواب دیا تھا۔ بہت کچھ بدلا ہوا تھا اُس کی شخصیت میں۔ یہ وہ نروس گھبرائی ہوئی

اداکارہ نہیں تھی جو اُس کے پاس آڈیشن کے لیے آئی تھی۔ وہ بین الاقوامی ایکسیوڈور جو اُسے پچھلے ایک سال میں

ملا تھا۔ اُس کے اٹھنے بیٹھنے بولنے ہر چیز میں جھلک رہا تھا۔ وہ بے حد پراعتماد اور گروڈ نظر آ رہی تھی۔

”کامیابی ہر مشکل سفر کی محکم کر دیتی ہے۔ خاص طور پر اگر کامیابی آپ کو ملنے والی کامیابی جیسی ہو۔“

انٹرویو نے مسکراتے ہوئے بے حد مرحوب انداز میں اُس کے جواب پر تبصرہ کیا تھا۔

”کامیابی کی اپنی محکم ہوتی ہے اور جتنی بڑی کامیابی ہوتی ہے، اتنا زیادہ تھکاتی ہے۔“

اُس نے مومن سلطان کو کہتے سنا۔ قلب مومن چینل بدلتے بدلتے رک گیا تھا۔ وہ اُس کی گفتگو سننا چاہتا

تھا۔ وہ ایک عام اداکارہ کی گفتگو نہیں تھی جو کامیابی کے نشے میں چور اسکرین پر اپنے ڈنکے بجانا چاہتی ہو۔

”اس مقام تک پہنچنے کے لیے کیا کیا سمجھوتے کیے؟“ سوال کرنے والی نے ایک دم موضوع بدل دیا تھا۔

”سمجھوتہ کام میں کبھی نہیں کیا۔ زندگی میں بہت سارے کیے۔“ رائل بلوسٹ میں اُس کے گلے میں آج

بھی ایک دو پتہ تھا۔ قلب مومن کو پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا اور جو بھی یاد آیا تھا وہ شرم سار کرنے کے لیے کافی تھا۔

”سمجھوتے کو برا سمجھتی ہیں؟“ انٹرویو نے گریہا تھا۔

”کام کرنے کے لیے کیے جانے والے سمجھوتے کو بہت بُرا۔ زندگی گزارنے والے کیے جانے والے

سمجھوتوں کو بالکل بھی نہیں۔“

وہ بہت مختصر اور مدلل بات کر رہی تھی۔ انٹرویو کرنے والی اُسی کی عمر کی لڑکی تھی مگر وہ مومن سلطان سے بے

حد مرحوب اور خائف نظر آ رہی تھی۔

قلب مومن جانتا تھا، وہ اُس کا انٹرنیشنل اسٹارڈم تھا جو بات کرنے والی کو بار بار سوچ کر بات کرنے پر مجبور

کر رہا تھا۔

ایک بار پھر اُسی انداز میں بدلا تھا جس میں وہ بدلنے کی عادی تھی۔ قلب مومن آفس کا دروازہ کھول کر اندر آنے

والے داؤد کو نہیں دیکھ سکا۔ وہ اُس انٹرویو میں اتنا خود تھا۔ داؤد خاموشی سے آ کر ایک کرسی چھینچ کر بیٹھ گیا اور وہ بیٹھا

مومن کو پہلی بار اُس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”بھئی کسی سے پیار کیا؟“ انٹرویو نے بے حد تجسس کے عالم میں اُس سے سوال کیا تھا۔

”ہاں۔“ بے حد بے تاثر انداز میں جواب آیا تھا۔

”پاپا..... یا..... کھویا؟“ انٹرویو کا تجسس اور بڑھا۔

”پاپا بہت کچھ کھودتی..... اس لیے کھو دیا۔“ مومن سلطان نے اُسی انداز میں کہا تھا۔

”کھودنے کی تکلیف ہے؟“

”اب نہیں ہے۔“

”زندگی میں کبھی کسی سے نفرت کی؟“ انٹرویو کا اگلا سوال تھا۔

”ہاں۔“ جواب سوچے بغیر آیا تھا، یوں جیسے وہ جانتی تھی۔ اُسے کس کا نام لینا تھا۔

”کس سے؟“

”ایک ڈائریکٹر تھا..... جس کے پاس میں فلم کا آڈیشن دینے گئی تھی۔ اُس نے فلم میں نامناسب لباس

پہننے کے لیے مجھے مجبور کیا اور میرے انکار پر فلم میں کام نہیں دیا۔ وہ فلم مل جاتی تو شاید میرے بھائی کی زندگی بچ

جاتی۔ تو بس اُس وقت ضرورت نے ایسی نفرت کروائی تھی اُس سے کہ آج بھی اگر کوئی نفرت کا نام لیتا ہے تو

میری آنکھوں کے سامنے صرف اُس ڈائریکٹر کا چہرہ آتا ہے۔“

وہ پہلا سوال تھا جس کا جواب اُس نے مختصر نہیں دیا تھا۔ بے حد تحمل سے دیا تھا مگر اُس کی آنکھیں اُس تحمل کا

ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

قلب مومن کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ آج بھی اُس کی یادداشت کا حصہ ہے اور اُس انٹرویو میں اُس کا حوالہ اس

طرح آئے گا۔ ندامت اس لیے بھی زیادہ ہوئی تھی کیونکہ اُس سے کچھ فاصلے پر داؤد بیٹھا ہوا تھا۔ بھی بکھار قسمت

میں اس طرح کٹھنرے میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

”نام بتانا چاہیں گی آپ اُس کا؟“ انٹرویو نے چند جملے اُس ڈائریکٹر کی شان میں کہنے کے بعد جیسے مومن

سلطان کو نام لینے پر اکسایا۔

”وہ اس قابل بھی نہیں کہ میں اُس کا نام لوں۔“ قلب مومن نے ریوٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آف کر دی

تھی۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں تھا، اُس کا بھائی بیمار تھا۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مومن نے داؤد سے کہا تھا۔

”بتا دیتا تو بھی کہا ہوتا مومن بھائی..... آپ اُس وقت کسی کی نہیں سنتے تھے۔“

داؤد نے شاید زندگی میں پہلی بار مدہم آواز میں اُس کے رویے کی کمی بد صورتی کی نشان دہی کی تھی۔ مومن

بپ کا جب بیٹھا رہا۔

”اگر تمہاری بات ہوتی ہو اُس سے تو معذرت کرنا میری طرف سے۔“ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد

اُس نے جو کہا تھا، اُس نے داؤد کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ شاید پہلی معذرت تھی جو مومن کسی سے کر رہا تھا۔

”میں اور بیٹا سوچ رہے ہیں مومن بھائی! کہ اگر مومن سے آپ کی فلم کے لیے بات کی جائے۔ شبلی تو

ب انکار کر کے چلی گئی ہے اور ہم دونوں کا خیال ہے، یہ رول مومن کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ داؤد نے اُس کی

کے جواب میں بڑی ہمت سے کہا تھا۔



”وہ اسکرپٹ تمہارے منہ پر مارے گی۔“ بے حد ٹھنڈے لب و لہجے میں مومن نے اُس سے کہا تھا۔

☆☆☆

”میں یہ اسکرپٹ تمہارے منہ پر مارنا نہیں چاہتی اس لیے اسے اٹھا لو۔“

داؤد بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ مومنہ کے چہرے کی سنجیدگی میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔ داؤد اُس کے پاس کچھ دیر پہلے پہنچا تھا اور ادھر ادھر کی گپ شپ کرنے کے بعد وہ بالآخر اُسی موضوع پر آیا تھا اور اسکرپٹ مومنہ کے سامنے رکھتے ہوئے اُس نے بات کا آغاز کیا تھا اور جواب حسب توقع وہی آیا تھا۔ مومنہ نے اسکرپٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

”مومن نے یہی کہا تھا۔ تم یہی کرو گی۔“ داؤد نے بالآخر اُس سے کہا۔

”تمہاری جگہ مومن بیٹھا ہوتا تو یقیناً یہی کرتی۔ اُس کی ہمت بھی کیسے ہوئی مجھے یہ فلم آفر کرنے کی۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی بھی۔“ وہ بے اختیار خفا ہوئی تھی۔

”یہ آئیڈیا میرا تھا۔“ داؤد نے اعتراضی انداز میں کہا۔

”اقصی ٹھیک کہتی ہے۔ تمہاری عقل گھٹنوں اور ٹخنوں کے درمیان چلتی رہتی ہے۔“

داؤد نے اُس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی تھی۔

”وہ بہت شرمندہ ہیں۔“ داؤد نے کہا۔ مومنہ طعنیہ انداز میں ہنسی۔

”اوہ اچھا۔“ ضمیر جاگ گیا تمہارے مومن بھائی کا۔۔۔۔۔ بڑی جلدی جا گا ہے۔۔۔۔۔ اب مجھ سے یہ مت کہنا کہ وہ مجھ سے معذرت کرنا چاہتے ہیں۔“ داؤد زبان دانتوں تلے دبا کر پیشاب رہا۔

”تم صرف ایک باریہ اسکرپٹ پڑھ لو۔“ مومنہ نے اُس کی بات کاٹی۔

”میں بغیر پڑھے انکار کر رہی ہوں۔ اس پر قلب مومن کا نام لکھا ہے اور میں اس نام کو دیکھنا تک نہیں چاہتی۔“

”اس پر اللہ کا نام بھی ہے اور الف اُسی کے نام کا پہلا حرف ہے۔“ داؤد نے بے اختیار کہا تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔

”میں مومن کے ساتھ کبھی کام نہیں کروں گی۔“ اُس نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”مت کرو۔ صرف اسے پڑھ لو۔۔۔۔۔ پڑھنے میں تو کچھ نہیں جائے گا تمہارا۔“ داؤد نے بے ساختہ اُس سے کہا۔ وہ اس بار خاموش رہی۔

”میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ مومنہ خفا سے انداز میں بیٹھی رہی۔

”تمہیں یاد ہے مومن! جہانگیر کے لیے جب ہم اُس رات پیسے جمع کر رہے تھے تو جو پیسے کم پڑے تھے۔ وہ میں آدھی رات کو کس کو چگا کر لایا تھا۔“ اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے مومنہ سے کہا۔ مومنہ اور داؤد ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مومنہ کو لگا جیسے کسی نے اُس کے پیٹ میں گھونسا مارا ہو۔

”مومن کا نام مت لیتا۔“ وہ جیسے کراہ کر داؤد سے بولی تھی۔

”تمہارا نام لے کر اُن سے قرضہ لے کر نہیں آیا تھا۔ اپنا ہی نام لیا تھا۔ واپس دینا چاہتا تھا بعد میں انہیں انہوں نے لیا ہی نہیں کہ یہ چھوٹی رقم ہے۔۔۔۔۔ چلتا ہوں۔“

وہ دم آواز میں کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ کم صدم وہاں بیٹھی رہی تھی۔ زندگی میں قلب مومن وہ آخری آدمی بھی نہ ہوتا جس کا وہ بھی کوئی احسان اپنے سر پر رکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اُس پر احسان کیا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ مومنہ سلطان تھی۔ احساس سے عاری ہوئی تو بہت خوش رہتی۔

☆☆☆

”ہیلو۔۔۔۔۔ جی قلب مومن سے بات کر سکتا ہوں؟“

”جی۔ میں قلب مومن ہی ہوں۔“ دوسری طرف فون پر موجود مرد یک دم بے حد خوش ہوا تھا۔

”شکر ہے۔ آپ سے بات ہو گئی۔ میں اتنے مہینوں سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کے ایئر مینٹ پر بھی کئی چکر لگا آیا ہوں لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو پایا۔“ اُس آدمی نے کہا تھا۔

قلب مومن کچھ الجھا تھا۔ اُس کے ذہن میں اُس آدمی کا نام گونجا تھا جس کا ذکر شکور نے کیا تھا لیکن اُس نے فون پر اُس آدمی کا نام لینے کے بجائے اُس سے کہا۔

”سوری میں ابھی تک آپ کو پہچان نہیں ہوں۔“

وہ اُس وقت آفس سے نکل رہا تھا اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

دوسری طرف اُس آدمی نے بڑے اطمینان کے عالم میں کہا۔

”جی۔ آپ جانتے ہوں گے تو پہچانیں گے نا۔ مرحوم عبدالعلی صاحب بہت اچھی طرح جانتے تھے مجھے ویسے۔“ اُس نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

”آپ دادا کے دوست ہیں؟“ مومن کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔

”کاش ہوتا جی۔۔۔۔۔ ہم تو اُن کے صرف مداح تھے۔ آپ بتائیں۔ آپ کے پاس کب حاضر ہو سکتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک بڑا ضروری کام ہے مجھے۔ اور عبدالعلی صاحب کا حکم بھی۔“ اُس آدمی نے جواباً کہا تھا۔ قلب مومن الجھا تھا۔

”دادا نے آپ سے کہا تھا مجھ سے ملنے کو؟“

”ہاں جی۔“ اُس آدمی نے کہا اور پھر یک دم جیسے اُسے خیال آیا۔

”اپنا نام تو بتانا بھول ہی گیا میں۔ ویسے آپ کے ملازم کو اپنا کارڈ دے کر آیا تھا میں۔ بندے کو خالق علی کہتے ہیں۔“

اُس آدمی نے اپنا نام لیا اور ایک جھماکے ساتھ مومن کے ذہن میں وہ نام اور نمبر چکا چودا دے اُسے دیا تھا۔ اُن کے ساتھ ہونے والی آخری فون کال کے بعد۔

”آپ آجائیں۔ اس ویک اینڈ پر میں انتظار کروں گا آپ کا۔“ قلب مومن نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اُسے پتا چل گیا تھا خالق اُس سے کس چیز کے بارے میں بات کرنے آنا چاہتا تھا۔

”خیال تو رکھتا ہوں اس کا ہر وقت۔۔۔۔۔ اس کا خیال نہیں رکھوں گا تو کس کارکھوں گا۔ دو ہی لوگ تو ہوتے ہیں یہاں۔۔۔۔۔ تم تو اتنے مہینے نہیں ہی نہیں۔“

سلطان نے مومنہ سے اُس رات گلہ کیا تھا۔ اُس نے باپ کو ثریا کی بیماری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ اسے راز میں رکھ کر ثریا کا علاج نہیں کر سکتی تھی۔ سلطان کو شیر ذہنی کی بیماری کی کتنی سمجھ آئی کتنی نہیں لیکن اُس نے مومنہ کے سامنے یہ اقرار کر لیا تھا کہ ثریا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھی اور کبھی کبھار جہانگیر سے بھی کرتی تھی مگر اُسے اس میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مومنہ نے جواباً اُسے اُس جہنی مرض کی تفصیلات بتانا شروع کر دی تھیں۔

”مہنگا علاج ہے؟“ اُس نے مومنہ کی ساری بات سن کر عجیب مگر مندا انداز میں اُس سے پوچھا تھا۔

”ابا! مہنگے اور سستے کی پروا نہ کریں آپ۔۔۔۔۔ علاج مسئلہ نہیں ہے۔ خیال مسئلہ ہے۔“



اور اُس کے اس جملے کے جواب میں سلطان نے اُسے یاد دلایا تھا کہ اُس نے پچھلے ایک سال میں اس گھر میں کتنا کم وقت گزارا تھا۔

”جانتی ہوں! میری کوتاہی ہے۔ لیکن میں بے بس تھی۔ چاہتی بھی تو رہ نہیں سکتی تھی آپ لوگوں کے ساتھ پاکستان میں۔ کام پتا نہیں کہاں کہاں لے کر جا رہا ہے مجھے۔ ابھی ایک ہفتہ میں دوبارہ جانا ہے اسی لیے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آپ خیال رکھیں اماں کا۔“ اُس نے بہت تادم انداز میں سلطان کو وضاحت دی تھی۔ ”تم سے شکایت نہیں کر رہا مومنہ! پر یہاں تنہائی بہت ہے۔“ سلطان نے کچھ شرمندہ سا ہو کر سر جھکاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

”آرام بھی تو بہت ہے ابا۔“ اُس نے جیسے باپ کو یاد دلایا تھا۔

”ہاں۔ آرام ہے پر آرام تنہائی تو نہیں مٹاتا۔ اتنا لمبا دن ہوتا ہے اور وہ کتنا ہی نہیں۔ رات ہوتی ہے تو نیند نہیں آتی۔۔۔۔۔۔ وہ جو رانا گھر اور محلہ تھا نا وہاں یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ آدھا وقت بانی کے انتظار میں گزر جاتا تھا۔ آدھا بجکی کے پھر گلی محلے میں ہونے والے لڑائی جھگڑے دیکھنے میں۔۔۔۔۔۔ دن بھاگ جاتا تھا۔ رات ہوتی تھی تو نیند کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ کب آتی تھی کب نہیں۔۔۔۔۔۔ آنکھ جیب بھی کھلتی تھی دن چڑھے ہی کھلتی تھی۔ چاہے پھر کاٹتے ہوں، چاہے بجلی نہ ہونے پر ہوا بند ہو۔۔۔۔۔۔ پر نیند آ جاتی تھی وہاں۔“ سلطان عجیب تاٹیک انداز میں بولتا جا رہا تھا۔ یوں جیسے اُسے کوئی الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو اور وہ سنی جا رہی تھی یوں جیسے وہ واقعی اُس الف لیلہ سے واقف نہ رہی ہو۔

وہ اپنے ماں باپ کے لیے وہی کر سکتی تھی جو کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ جتنی آسائشیں دنیا سے اکٹھی کر کے اس بڑھاپے میں اُن کے گرد ڈھیر کر سکتی تھی ڈھیر کر چکی تھی، مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ بڑھاپا آسائشیں ملنے پر نہیں چلتا۔ ضرورتیں پوری ہونے پر چلتا ہے اور وہ ضرورتیں وہ پوری کرنے کے قابل نہیں تھی۔

”وہاں جہانگیر اور تمہارے جانے کے بعد بھی تنہائی نہیں ہوئی تھی۔ سارا دن محلے میں چلتے پھرتے رہتے تھے یا کوئی آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں چیزیں بہت ساری ہیں۔ آنے جانے والا کوئی نہیں۔ پرندے تک نہیں آتے۔۔۔۔۔۔ وہاں یاد ہے۔ صحن میں پکی ہوئی روٹی کے دو ٹکڑے بھی پھینک دی تھی تمہاری اماں تو پتا نہیں کہاں کہاں سے کھانے کے لیے آ جاتے تھے پرندے حالانکہ چوٹا سا صحن تھا ہمارا۔۔۔۔۔۔ اتنا تک۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں آسمان سے کیسے ڈھونڈتے ہوں گے پرندے ہمارے صحن میں بڑے روٹی کے ٹکڑوں کو۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں اور ثریا اُسی پرانے محلے میں کوئی گھر کرائے پر لے کر رہ گئیں گے۔ وہاں خوش رہیں گے ہم۔ ثریا بھی ٹھیک ہو جائے گی وہاں۔“ سلطان اُس سے کہہ رہا تھا۔

”کام تو یہاں بھی بہت سارے ہیں ابا۔“ مومنہ بمشکل بولی تھی۔ اُس ہارے ہوئے وکیل کی طرح جسے پتا تھا اُس کا کیس کمزور تھا۔

”یہاں کیا کام ہے؟۔۔۔۔۔۔ صفائی ملازم کرتا ہے۔ کھانا لگ بناتا ہے۔ ضرورت کا سامان ڈرائیور بڑے اسٹور سے لاتا ہے۔ جہاں چلتے چلتے میں اور تیری اماں تھک جاتے ہیں۔ سارا دن میں اور ثریا بیٹھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے ہیں۔“ سلطان نے عجیب سی ہنسی کے ساتھ اُسے بتایا تھا۔ وہ ہنسی نہیں جیسے اُس کی بے چارگی تھی۔

”آپ ڈرائیور کے ساتھ جایا کریں باہر گھومنے پھرتے۔“ مومنہ نے جیسے اُن کے لیے کام نکالا۔

”کہاں؟“ سلطان نے بے حد سادہ لہجے میں کہا۔

”کہیں بھی اتنا بڑا شہر ہے۔“ مومنہ نے کہا۔

”ہاں پر پورے شہر میں ہمارا تو کوئی نہیں ہے نا۔ جہانگیر تھا وہ چلا گیا۔ تم ہو۔۔۔۔۔۔ تو تم مصروف ہوتی ہو۔“

پوری دنیا میں اور ہمارا کون ہے؟“

وہ بھرمانہ انداز میں باپ کے سامنے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سلطان کی کسی بات کا اُس کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ اُن کے پاس نہیں بیٹھ سکتی تھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔۔۔۔۔۔ ورنہ بیٹھ جاتی۔

یہ اختیار اور انتخاب اللہ نے اُسے دیا ہی نہیں تھا۔ اُس کے پاس جو تھا پوری دنیا اُس پر رشک کرتے ہوئے مری جا رہی تھی۔ اُس کے پاس جو نہیں تھا، وہ اُسے مگر بھی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ اُس کی زندگی کا مقصد کیا تھا مومنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی اس کامیابی کا مقصد کیا تھا۔ مومنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک ناکام اداکارہ تھی تو بھی اپنے ہر معاملے میں بے بس تھی وہ آج کامیاب اداکارہ تھی تو بھی اپنا کوئی مسئلہ حل نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ سلطان کے پاس سے اُس رات اٹھ کر آ گئی تھی مگر سونے کی کوشش کے باوجود وہ سو نہیں پائی تھی۔ سلطان کی آواز اُس کے کانوں میں بار بار گونجتی تھی۔ وہ کی گھنٹے اپنے بستر پر گردش بدلتے ہوئے جیسے کوئی راست کوئی حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر جیسے بے حد بے بسی کے عالم میں وہ رات کے پچھلے پہر جتن میں چائے بنانے چلی آئی تھی۔

چائے کا کپ لیے وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھی اور اُس کی نظر اُس اسکرپٹ کے لفافے پر پڑی تھی جو داؤد وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس نے خالی الدینی کے عالم میں اُس لفافے کو اٹھایا تھا جس پر الف اور قلب مومن کا نام لکھا ہوا تھا اور اسکرپٹ لفافے سے نکال لیا تھا۔

وہ ایک اور دنیا میں جہاں وہ کاغذ اُسے لے گئے تھے۔ عالیہ جہاں کی دنیا اور اُس دنیا کا مرکز۔۔۔۔۔۔ وہ سات سالہ دانیال۔۔۔۔۔۔ عالیہ جہاں کا محبوب عبداللہ اور عبداللہ کا باپ عبداللہادی۔ وہ کیا کہانی تھی جس کا ایک ایک کردار دل تھا اور بس دل ہی حکمرانی کر رہا تھا۔ مومنہ سلطان نے اپنے اُس مختصر کیرئیر میں ایسا اسکرپٹ ایسے کردار اور ایسے ڈائلاگز نہیں دیکھے تھے۔ ہر صفحے پر وہ اُجھتی اُسے لگتا، وہ عالیہ جہاں کو جانتی تھی وہ اُس کہانی میں خود بھی نہیں تھی مگر کہاں تھی یہ اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ رُ کے بغیر وہ صفحے پر صفحے چلتی اُس اسکرپٹ کو انٹرول تک پڑھتی گئی تھی اور انٹرول کے سپین پر جس کردار کی انٹری ہوتی تھی اُس کردار نے مومنہ کو سنا کر دیا تھا کیونکہ وہ پہچان گئی تھی۔ وہ کہانی کس کی تھی اور اُسے کیوں وہ جانی پہچانی لگ رہی تھی وہ حسن جہاں کی کہانی تھی اور انٹرول میں اُس کہانی میں آنے والا کردار سلطان تھا جو اپنی محبوبہ عالیہ جہاں سے ملنے ترکی گیا تھا اور عالیہ نے دانیال سے کہا تھا کہ وہ سلطان کے بارے میں عبداللہ کو نہ بتائے۔

اس کہانی کے ہر کردار کا نام فرضی تھا صرف سلطان کے نام کے علاوہ۔ مومنہ کے روئے کھڑے ہونے لگے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے انٹرول کے بعد آگے پڑھنے کے لیے اسکرپٹ کا صفحہ اٹھا لیا تھا وہاں آگے ”جاری ہے“ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اُسے جو اسکرپٹ بھیجا گیا تھا وہ انٹرول تک تھا۔ وہ نہت کی طرح بیٹھی رہی۔ عالیہ جہاں یقیناً حسن جہاں تھی اور اگر وہ حسن جہاں تھی تو قلب مومن دانیال کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”مومنہ! تم اب تک جاگ رہی ہو؟“

وہ سلطان کی آواز پر چونکی تھی۔ وہ اُسے دیکھنے لاؤنج میں آیا تھا اور اب اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ باپ کو دھمکاتے دیکھتی رہی۔ اُس کی نظروں میں یقیناً کوئی ایسا تاثر تھا جس نے سلطان کو پریشان کیا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ آگے بڑھا آیا۔

”ایک اسکرپٹ پڑھ رہی ہوں ابا۔“ مومنہ کو بات کرتے ہوئے اپنی آواز کھوکھلی لگی۔

”اسکرپٹ؟“ سلطان اُلجھا تھا۔

”ایک اردو فلم کا اسکرپٹ“ مومنہ نے نظریں اُس پر جمائی ہوئی تھیں۔

”کیا ہے کہانی؟“ سلطان نے پوچھا، اُسے اُس کی نظریں بے چین کر رہی تھیں۔

”الف“ لکھی جیسی کہانی ہے، انٹرول تک میں نے سانس روک کر بڑھا ہے۔ اب کو بھی سناٹی ہوں۔“



مومنہ نے کہنا شروع کیا۔

”ہاں سناؤ..... حسن جہاں کو بھی بڑا یقین تھا میری رائے پر ہر اسکرپٹ سناتی تھی وہ مجھے۔ تم بھی سناؤ۔ میں بتا دوں گا ہٹ ہے یا نہیں۔“ سلطان کہتے ہوئے دوسرے صوف پر اُس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

”ایک بچے کی کہانی ہے ابا! جس کی ماں ایک ایکٹریس اور ڈانسر تھی اور اُسے ترکی میں ایک فیشنول کے دوران ایک ترک ڈانسر اور خطاط سے پیار ہو جاتا ہے۔“ مومنہ کی بھی۔ اُس نے سلطان کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

”وہ اُس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر ترکی میں رہ جاتی ہے اور وہ ڈانسر جو خطاطوں کے ایک نامور گھرانے سے تھا۔ اپنے باپ کو ناراض کر کے اُس سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن پھر وہ خطاطی نہیں کر پاتا اور اُن دونوں کے درمیان محبت کی یہ داستان ایک شخص کی وجہ سے شاید ختم ہو جاتی ہے۔“

وہ کہتی گئی تھی۔ سلطان پکلیں چپکائے بغیر اُسے دیکھ رہا تھا جب وہ خاموش ہوئی۔ تو سلطان نے کہا۔

”کس شخص کی وجہ سے؟“ مومنہ نے اسکرپٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”سلطان کی وجہ سے۔“

لاؤنج میں ایسی خاموشی چھائی تھی جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مومنہ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس سے کہا۔

”کیا تھے ابا! آپ حسن جہاں کی زندگی میں؟ ہیر ویاؤن؟“

سلطان نے جواب دینے کے بجائے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”انٹرویو کے بعد کیا ہوا تھا اس اسکرپٹ میں؟“

”میں نہیں جانتی..... میرے پاس صرف آدھا اسکرپٹ آیا ہے۔“

”منع کرد اس اسکرپٹ کو۔“ سلطان نے بے ساختہ کہا۔

”آپ گئے تھے تاثر کی حسن جہاں سے ملنے؟ کیا ہوا تھا ابا وہاں؟ کیا کیا تھا آپ نے؟“

مومنہ نے اُس کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ سلطان اُس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”جس نے یہ اسکرپٹ لکھا ہے اُس سے پوچھو۔ اُسے سب علم ہوگا۔“

اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

”کس نے لکھا ہے یہ اسکرپٹ؟“

”قلب مومن نے۔“ اُس بار پہلے سے بھی لمبی خاموشی چھائی تھی لاؤنج میں پھر سلطان جیسے کراہتے ہوئے بولا تھا۔

”اُس کے بیٹے نے؟“

مومنہ نے سر ہلایا۔

”یہ وہی فلم ڈائریکٹر ہے جس کی فلم کے آڈیشن کے لیے بھیجا تھا آپ نے اور اُس نے مجھے کام نہیں دیا۔“

مومنہ نے مدھم آواز میں کہا۔

”وہ فلم ڈائریکٹر؟ وہ بیٹا ہے حسن جہاں کا؟..... وہ خطاط نہیں بنا؟ یہاں پاکستان آگیا؟“ سلطان نے بے یقینی کے عالم میں اُس سے کہا۔ اُس نے سر ہلادیا۔

”مجھے..... مجھے ملو اور اُس سے۔“ سلطان نے بے اختیار کہا۔

”آپ کیا کریں گے اُس سے مل کر؟“ مومنہ نے پوچھا۔

”میں انٹرویو کے بعد والے حصے میں اپنا رول جاننا چاہتا ہوں۔“

”آپ اُس کی فلم کے ولن ہیں ابا! یہ میں آپ کو پورا اسکرپٹ پڑھے بغیر بھی بتا سکتی ہوں۔“ ایک سایہ سلطان کے چہرے پر لہرایا تھا۔

”آپ کس لیے گئے تھے اُس سے ملنے؟“ مومنہ نے دوبارہ پوچھا۔

”حسن جہاں کا نام لکھا ہے اُس نے اسکرپٹ میں؟“ سلطان پتا نہیں اپنے کس اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔

”نہیں ابا..... ہر ایک کا نام بدلایا اُس نے سوائے آپ کے..... آپ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس لیے آپ کا نام نہیں بدلا اُس نے..... حسن جہاں کی زندگی کے قصے اتنے سنے ہیں آپ سے کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتی ہوں کہ وہ عالیہ جہاں نہیں ہے حسن جہاں ہے اور عالیہ جہاں نے جس کے لیے بے وفائی کی، وہ سلطان تھا۔“

وہ اُس کے جملے پر ہنسنے لگا تھا اتنا کہ اُس کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

”بے وفائی کر لیتی سلطان کے لیے تو آج زندہ ہوتی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ابا! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ مومنہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”میں دوں گا بھی نہیں تم یہ فلم مت کرنا..... یہ فلم فلاپ ہوگی۔ تاریخ کی سب سے بڑی فلاپ۔“ وہ کہتے ہوئے وہاں رُک کے بغیر چلا گیا تھا۔ مومنہ مضطرب اُسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی نے داؤد کو گہری نیند سے جگایا تھا۔ اُس نے نیند میں ہی آنکھوں کو مسلتے ہوئے فون اٹھا کر نام دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو مومنہ! رات کے تین بجے کال کر رہی ہو تم..... سب خیریت تو ہے۔“ داؤد نے فکر مند ہو کر کہا تھا۔

”میں یہ قلم کروں گی۔“ اُسے مومنہ کی آواز سنائی دی۔

”کون سی قلم؟“ نیند میں داؤد فوری طور پر اُس کی بات نہیں سمجھا۔

”الف۔“ اُس بار داؤد کی نیند اڑن چھو ہو گئی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا..... تم نے الف کہا ہے نا؟“ داؤد بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں۔ الف ہی کہا ہے..... اگلے ایک دو دن میں قلب مومن کے ساتھ میری میٹنگ شیڈول کر دو۔ میں دینی جانے سے پہلے اُس سے مل کر قلم کا دوسرا حصہ سننا چاہتی ہوں۔“

اُس نے کہا تھا اور داؤد کا جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت ناول  
خوبصورت چھاپائی  
مشہور جلد  
آئیڈل پیپر

☆ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: -/300 روپے  
☆ زرد موسم راحت جمیل قیمت: -/1000 روپے  
☆ حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز قیمت: -/400 روپے

نگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361





خزاں کی رست میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے  
ہوا کی زد پہ دیا جلانا، جلا کے رکھنا، کمال یہ ہے  
ذرا سی اغزش پر توڑ دیتے ہیں سب تعلق زلزلے  
سولے دیسوں سے بھی تعلق بنا کے رکھنا، کمال یہ ہے  
کسی کو دنیا یہ مشورہ کر، وہ دکھ بھڑکے کا قبول جائے  
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپا کے رکھنا، کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے  
جو یار چاہے، وہ حال اپنا بنا لے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے خدا کی خاطر اٹھنے کے لئے ہٹنے کے پتھر  
پھر اس کے آگے نگاہ اپنی پھینکا کے رکھنا، کمال یہ ہے

مبارک صدیقی

حقیقتوں کو فناء بنا کے بھول گیا  
میں تیرے عشق کی ہر چوٹ کھا کے بھول گیا

فرایہ دوری احساسِ حُسن و عشق تو دیکھ  
کہ میں تجھے ترے نزدیک آکے بھول گیا

اب اس سے بڑھ کے بھی وارفتگی دل کیا ہو  
کہ تجھ کو زلیست کا حاصل بنا کے بھول گیا

گمان جس پہ رہا منزلوں کا اک مدت  
وہ رہ گزار بھی منزل پہ آ کے بھول گیا

اب ایسی حیرت و وارفتگی کو کیا کہیے  
دعا کو ہاتھ اٹھائے اٹھائے اٹھائے

دل و جگر ہیں کہ گرمی سے پگھلے جاتے ہیں  
کوئی چسراغِ تمنا جلا کے بھول گیا

جمیل الدین عالی

دوئل

کون سے دن لگتے ہیں

اس سے ملنے میں، اسے دل میں بسالینے میں

اس کے ہونے میں اسے اپنا بنالینے میں

بس ہی مل

جو گزرتا ہے، گزر جاتا ہے

اور یہ دل کی مسرت سے سنور جاتا ہے

کون سے دن لگتے ہیں

اس کے جانے میں میرے دل سے چلے

جلانے میں

کچھ نہ کہتے ہیں، کوئی بات نہ بتلانے میں

بس یہی ٹیل

جو گزرتا ہے، گزر جاتا ہے

اور یہ دل ہے کہ وحشت سے بھر جاتا ہے

قیاض وید

خوش گمانی،

سفر میں شام سے پہلے

اگر بے اس ہو جاؤ

لواک پل کو  
محنت تاک

جھے م یاد دل لینا  
سینہ سبنا نکال دینا

سفر امارت لیبیا  
تمهید بر بیان طریقه

ملک کا صاف اور روشن

دھنک کے رنگ ساتوں

جب تمہارے گرد آ کر

اک نیا مالہ بنائیں گے

حسین پچھتلیاں

پروں کو عملیں اپنے

عبداللہ کے ساتھ کر دیں  
سفیر کے سختیوں سے

بہر ایک ملکہ

محمی تم یاد کر لےنا

...







رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،  
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے  
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”جو لوگ مر گئے، ان کو بڑا نہ کہو کیونکہ انہوں  
نے جیسے عمل کیے، ویسا بدلہ پانچے“

### سہری زندگی کے لئے سہری باتیں

- ۱۔ رابطہ اتنے ہی رکھو جتنے تکلیف نہ دیں۔
- ۲۔ جب تم جان جاؤ کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو پھر  
اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا کہ کون تمہارے  
غلاف ہے۔
- ۳۔ جو شخص نصیحت مان لے، وہ بعض اوقات نصیحت  
کرنے والے سے بھی بڑا ہوتا ہے۔
- ۴۔ وہ شخص کامیاب نہیں ہو پاتا، جس میں ناکامی کا  
خوف کامیابی کی چاہت سے زیادہ ہو۔
- ۵۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بات کا اونچا  
ہونا ضروری نہیں بلکہ بات کا سچا ہونا ضروری  
ہے۔

مارچہ نذیر۔ 26 جنوری

### جہنم کی آگ اور ایک آنسو

خوش حال خان خٹک نے کہا۔  
”جہنم کی آگ دہی آنسو بھجھا سکتے ہیں جو وقت سحر  
ایک مومن کی آنکھوں سے ٹپکے“  
اقصی نامہ۔ کراچی

### بین الاقوامی کہاوتیں

- ۱۔ دگر نامال نہیں، بلکہ گر کر اٹھ جانا کمال ہے۔  
(چینی کہاوت)

- ۱۔ ہر نیند آدمی غذا کا کام دیتی ہے۔  
(جرمن کہاوت)
- ۲۔ عمدہ دوا اکثر کڑی ہوتی ہے۔  
(مابانی کہاوت)
- ۳۔ جب میرے پاس پیسہ تھا تو ہر کوئی مجھے مہبائی  
کہتا تھا۔  
(پولش کہاوت)
- ۴۔ خیرات دیا کرو تا کہ تمہارے بچے کبھی بھیک  
نہ مائیں۔  
(جرمن کہاوت)

نمرہ، اقرہ۔ کراچی

### اکیسویں

ایک عورت سے اس کی بہیلی نے پوچھا۔  
”کیا تمہارا نومولود بچہ اپنے باپ پر گیا ہے؟“  
”خدا کا شکر ہے کہ نہیں۔“ ورنہ میرے شوہر لوٹنے  
سے پاگل ہو جاتے۔“ عورت نے تسوٹش سے  
جواب دیا۔

### تیسری

وہ لڑکی ہی ہے۔ جو پارٹی میں ماننے سے پہلے  
آئی شہد، مسکرا، آئی لائٹ، لپ گھو، لپ پینل  
فیس پاؤڈر، گلیٹر، بلش آن، کابل، نیل پالش، باڈی  
اپرے پر قوم لگائے اور اچھا لباس پہننے کے بعد بھی  
کہے۔

”ارے بار! جلدی میں کچھ نہیں کیا“  
اور یہ لڑکا ہے جو پارٹی میں جانے سے پہلے اپنے  
دوست سے پوچھے۔  
”اوتے تو نہ پا کر آئے گا؟“

دوست جواب دے ”ابے پاگل ہے کیا!  
اپنا دلیر تھوڑی ہے“  
صدف عمران کے ڈی اے سوسائٹی

### آئینہ

سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لڑکی نے اپنے  
بولے فریڈ سے پوچھا۔  
”جانو! تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“  
لڑکے نے جواب دیا ”میں تمہارے لیے کچھ بھی  
کر سکتا ہوں“  
”ہائیں۔“ سچ۔ کیا میرے لیے آسمان سے چاند

لا سکتے ہو؟“ لڑکی نے پرجوش ہو کر کہا۔  
”ایک منٹ رکو خدا ہی کہہ کر لڑکا غائب ہو گیا۔  
کافی دیر انتظار کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے  
ہاتھ میں کوئی چیز تھی، جو اس نے لڑکی کے ہاتھوں میں  
پکڑا دی۔

لڑکی نے دیکھا تو وہ آئینہ تھا۔ جب اس کی نظر  
اپنے عکس پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
اس نے خوش ہو کر لڑکے کو مخاطب کیا۔

”کیا تم مجھے یاد سمجھتے ہو؟“  
”نہیں! میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں  
کہ چاند مانگتی ہو، کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟“  
لڑکے نے یہ اعتنائی سے ہنسنے ”کہہ کر جواب دیا۔  
صائمہ بی۔ کراچی

### بھروسہ

سب سے اچھی زندگی وہ بسر کرتے ہیں، جو اپنی  
مزدورت بوری کرنے کے لیے اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ  
نہیں کرتے۔  
تہتم بیدر حسین۔ ڈنگر

### کامیابی

ایک دیندار مسامت دان سے سوال کیا گیا۔  
”آپ نے اپنی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز  
سے کیا سیکھا؟“

سیاست دان نے جواب دیا ”اہمیت اس بات  
کی نہیں کہ آپ ہارے یا جیتے، سوال یہ کہ آپ الزامات  
لگنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟“  
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

### مسئلہ

فلن پر ایک عورت چلی۔  
”ایک نوجوان لڑکی کے راستے میرے کمرے میں داخل  
ہونے کی کوشش کر رہا ہے“  
”محترمہ مرزا بی بی، ایٹشن کا نہیں، فائر بریگیڈ کا  
نمبر ہے“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”مجھے معلوم ہے کہ یہ فائر بریگیڈ کا نمبر ہے۔ اسی  
لیے تو میں نے فون کیا ہے۔“  
عورت بولی ”دراصل اس نوجوان کی میٹھی  
چھوٹی ہے۔ کمر کی تلک نہیں پہنچ رہی۔ اسے بڑی  
میٹھی کی ضرورت ہے۔“  
آسیہ جاوید۔ کراچی

### نمک پائے

✽ طرہ وہ آئینہ ہے، جس میں دیکھنے والا اپنے سوا  
ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔  
(سولفٹ)  
✽ عقل مند لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بے وقوف  
اب کیلئے والا ہے۔

✽ بے عمل ہنستا، غیر مزدوری گفتگو کرنا اور غلط جگہ  
بیٹھنا بے وقوفی ہے۔  
(یوٹاٹ)  
✽ ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔  
(ہینرٹ)

✽ قیمتی مشورے عین قیمت وصول کرنے کے لیے  
ہوتے ہیں اور صحیح مشورے نارا حتی مول لینے کے  
لیے ہیں۔  
(جارج سنٹیانا)  
مفتہ بلال۔ کراچی





عقہ کے تو ضرور چلاؤں، شرمائیں نہیں،  
ایک عالمہ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ وہ افلا جو  
اپنے ساتھ ہوتے والی نا انصافیوں اور دوسرے افراد  
کے غلط رویوں پر غیظ رہتے ہیں۔ ان میں دل کے  
دوسرے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ سوئیڈن میں کی جانے  
والی اس تحقیق میں کہا گیا ہے کہ جو افراد اپنی زندگی میں  
ہر بات پر غیظ کرتے ہیں اور غصے کا اظہار نہیں کرتے۔  
ان کی شریاؤں پر دباؤ اور دل کے دوسرے کا خطرہ بڑھ  
جاتا ہے۔ اس لیے ماہرین کا مشورہ ہے کہ اگر غصے کے  
تو خطرہ نکال لینا چاہیے۔ ورنہ صحت پر غراب اثرات  
پڑ سکتے ہیں۔

### سستا طریقہ

ایک مہینہ نیوارک میں ایک بینک کا دفتر دیکھا  
اور کہا۔  
”مجھے پانچ ہزار ڈالر کا قرض چاہیے۔ مجھے اپنے کام  
کے سلسلے میں یورپی ملکوں کے دورے پر جانا ہے۔  
اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“  
بینک والوں نے کہا ”کوئی مسئلہ نہیں اگر آپ  
کے پاس رقم ٹوٹنے کے لیے مناسب ضمانتیں ہیں تو  
ہمیں قرض دینے میں کوئی حرج نہیں۔“  
مہینے نے اپنی دو لڑاؤں کی مائیں بینک والوں  
کو تھادیں۔ بینک نے متعلقہ سٹیٹورٹی والوں کو بھیجا  
کہ جاکر اس کا قرض کی تصدیق کریں۔  
سب کچھ درست ہونے پر مہینے نے ڈھائی لاکھ  
ڈالر مالیت کی کار جیسی ضمانت کے بدلے میں پانچ  
ہزار ڈالر کا قرض حاصل کر لیا۔  
مہینے کی کار کو بلڈ ٹنگ کے نیچے بنی محفوظ پارکنگ  
لاٹ میں حفاظت کے ساتھ بند کر دیا۔ اور ان کے  
رضیت ہو جانے کے بعد بینک کا عملہ قہین کی اس  
حالت پر گھنٹوں ہنستا رہا۔  
دو ہفتے بعد مہینے نے نوٹے پر سیدھا بینک  
جا پہنچا جہاں ان سے پانچ ہزار ڈالر کے ساتھ سولہ  
ڈالر انٹرنسٹ ادا کرنے کو کہا گیا۔ لون سیکشن سے  
ایک دفتر دار آدمی آکر مہینے کے ساتھ پارکنگ لاٹ

کی طرف چل دیا تاکہ انہیں گاڑی واپس کر سکے۔  
راتے میں اس نے مہینے سے سوال کیا۔  
”مہینے آپ کے جانے کے بعد آپ کا سارا  
بیک گراؤ ٹھیک کیا تھا۔ آپ کی لاکھوں کروڑوں  
کی راز راز کھنڈن سے تو تیار ہو گئے تھے آپ کو اس جھوٹے  
سے قرض کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی  
میں اپنی ذاتی معلومات کے لیے آپ سے پوچھنا  
چاہتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“  
مہینے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
”اس اتنے بڑے نیوارک شہر میں مجھے کوئی ایسی  
جگہ بتا دو جہاں سولہ ڈالر کے کوئی میری ہتھی کار  
کی حفاظت کر سکے۔“  
عاصمہ ندیم - کراچی

### کیا دیکھا

ایک آدمی اور اس کا بیٹا بینک پر گئے تو انہیں  
وہاں رات ہو گئی۔ دونوں نے کھانا کھانے کے بعد  
اپنے الگ الگ خیمے لگائے اور سو گئے۔ اسی رات  
کو باپ نے بیٹے کو جگایا اور کہا۔  
”آسمان کو دیکھو بیٹا۔“  
بیٹا کچھ حیران ہو کر بولا ”جی دیکھ رہا ہوں۔“  
باپ نے پوچھا ”کیا دیکھا؟“  
بیٹے نے جواب دیا ”میں نے لاکھوں کروڑوں۔“  
ستارے دیکھے۔“  
باپ نے پھر پوچھا ”اس سے کیا بتا چلتا ہے؟“  
بیٹے نے کہا ”اس سے بتا چلتا ہے کہ ہماری کائنات  
بہت وسیع اور ہمارا نظام شمسی بہت بڑا ہے۔“  
ستارے آسمان کی زینت ہیں اور ہمیں رات کو  
راستہ بھی دکھاتے ہیں۔“  
باپ نے بیٹے کے کمال پر دودھ دار خیر ماما  
اور کہا۔  
”اس سے بتا چلتا ہے کہ ہمارے خیمے چوری ہو  
سکتے ہیں۔“  
حمیرا نوشین - منڈی بہاؤ الدین

نارہ بھیجی  
اثر ہوا ترے ضبط کا پھر اس طرح سے کہ ہم  
جدا ہونے کے تسلسل میں آس کھو بیٹھے  
سنین صبغت  
جن کے لیے چراغِ مہر شام جل گئے  
دنیا کے ساتھ وہ بھی نکلیں بدل گئے  
دل آصف  
یہ ساری عمر کس آشتی میں رہی کمال کردی  
اسی کو یاد رکھا ہے جسے دل سے بھلا نا تھا  
یشعل خان  
چلنے کا حوصلہ نہیں رکھنا محال کر دیا  
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نہال کر دیا  
مملکتِ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا  
اس نے تو ایک بات کی اہم نے کمال کر دیا  
اقصی نامہر  
اندھیرے رقصِ تعاقب میں میرے رہتے ہیں  
میں ان میں گھر کے آباؤں کی بات کرتی ہوں  
نورِ اقرار  
تلمیح عشق تھا سب اس کے ساتھ ہوئے تک  
خیاں کا درد نہ آیا۔ سچات ہوئے تک  
ملا تھا، بھجکے رستے میں صبح کی مانند  
چھوڑ گیا تھا مسافر نے رات ہونے تک  
صائمہ علیہ  
زمانے مجھ سے مراسم تو ٹھیک ہیں لیکن  
مجتہدوں کی کمی کو رازِ دل نہ کر  
فرین منیا اللہ  
روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا  
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے  
کس پتے پر اسے تلاش کروں  
شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

آرٹیفیٹ  
کہاں سے سیکھ لی تم نے بھی یہ اداکاری  
تمہاری آنکھوں میں آنسو عجیب لگتے ہیں  
شمر  
وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے بھولی میں اپنی رکھ لیں  
ہمسے سے حق میں عدد آئے، جواز آئے، اصول آئے  
عذریہ اقبال  
جو سو دویاں کی فکر کرے  
وہ عشق نہیں، مزدوری ہے  
میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں  
یہ کہنا، غنیمت ضروری ہے  
حرا سجاد  
دیوانہ سے خودی میں بڑی بات کہہ گیا  
اک حشر کی گھڑی کو ملاقات کہہ گیا  
تیم احمد  
دعا یہ کی ہی نہیں تو میرا عقد ہو  
ہوا کی طرح مگر سانس بھر بیٹھ ہو  
کبھی کبھی تو دل مضطرب یہ چاہتا ہے  
کہ جائز رات ہو اور سامنے سمندر ہو  
نازیدہ صدیق  
میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر  
ایسا سلوک کر جو میرے حسبِ حال ہو  
سبین حسن  
اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا  
یہ بات طے ہوئی لیکن سوالِ دہد کا ہے  
یہ دل، یہ آجری ہوئی چشمِ تم، یہ تنہائی  
ہمارے پاس تو جو بھی ہے، کمال دہد کا ہے





## باتیں انعم فیاضی سے

شاہین رشید

- 1- اصلی نام؟  
”اصلی نام تو انعم فیاض ہے۔ مگر شادی کے بعد انعم اسد کہلائی ہوں۔“
- 2- ”پیار کا نام؟“  
”زیادہ تر انعم ہی کہتے ہیں۔ بہت پیارا آ جائے تو ”انو“ کہتے ہیں۔“
- 3- ”تاریخ پیدائش/شہر؟“  
”17 جولائی 1992 / کراچی۔“
- 4- ”بہن بھائی..... آپ کا نمبر؟“  
”ہم دو بہنیں اور تین بھائی ہیں اور میں پہلے نمبر کی اولاد ہوں اپنے والدین کی۔“
- 5- ”تعلیمی قابلیت؟“  
”مگر بی بیٹ۔“
- 6- ”شادی؟“  
”جی الحمد للہ شادی 2016ء میں ہوئی۔ یعنی ”آخر آ گئی۔“
- 7- نکاح ہوا اور وہ بھی مکہ معظمہ میں۔ چند ماہ قبل رخصتی ہوئی ہے۔“
- 8- ”میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟“  
”جی..... اسد نے لندن سے ایم بی اے کیا اور اب ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔“
- 9- ”لوہا رنج میرج؟“  
”لوہا رنج کیا۔ سب کی پسند سے شادی کی۔“
- 10- ”محبت کے بارے میں آپ کے خیالات؟“  
”ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ میں نے جس سے محبت کی، اسے ہی اپنا شریک سفر بنایا۔“
- 11- ”شوہز میں آمد؟“  
”2011ء میں ایک شو ہوا تھا ”ہیرو بننے کی ترنگ“ میں حصہ لیا۔ دوسری پوزیشن آئی تو ڈرامہ کی آخر آ گئی۔“

- 11- ”پہلا ڈراما؟“  
”احمد حبیب کی بیٹیاں“ اس کے بعد تو پھر سلسلہ چل نکلا۔“
- 12- ”گھر میں کسی اور کو شوق ہوا؟“  
”فی الحال تو نہیں..... ابھی تو میں ہی اس فیلڈ میں ہوں۔“
- 13- ”شوہز میں آمد سے گھر والوں کا رد عمل؟“  
”جی..... پاپا نے شروع میں تھوڑا اعتراض کیا پھر وہ میرے ساتھ جانے لگے، تب انہیں اطمینان ہوا اور بس پھر کچھ نہیں کہا۔“
- 14- ”گھر میں سب سے زیادہ سپورٹ کس نے کیا؟“  
”ماما نے۔ انہیں میرا کام کرنا پسند تھا۔“
- 15- ”آپ کی ڈبلی روٹیں؟“  
”جی..... صبح اٹھتا۔ میاں صاحب کو آفس بھیجنا اور پھر شوٹ پر نکل جاتی ہوں۔ اسی طرح کی روٹیں ہوتی ہے۔“
- 16- ”کس کو دیکھے بنا صبح نہیں ہوتی؟“  
”جپ شادی نہیں ہوئی تھی ماما کو دیکھے بغیر صبح نہیں ہوتی تھی۔ اب میاں صاحب کو۔“
- 17- ”رشتوں میں سب سے پیارا رشتہ؟“  
”جو بلڈ ریلیشن ہیں وہ سب پیارے ہیں مگر والدین کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ماما کو بہت پس کرتی ہوں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“
- 18- ”پہلی کمائی/تاثرات؟“  
”ایک کرش کر لیا تھا۔ بہت خوشی ہوئی تھی اپنی کمائی کی۔“
- 19- ”کہاں خرچ کی؟“  
”گھر میں..... چونکہ بڑی ہوں تو سب کے لیے شاپنگ کی اور پھر سب کو ڈنر پر لے گئی۔“
- 20- ”آپ کی عام زندگی شوہز سے کتنی مختلف ہے؟“  
”میں ایک لڑکی ہی ہوں۔ شوہز کی وجہ سے مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“
- 21- ”مشکل کام کیا ہے۔ ماڈلنگ یا اداکاری؟“  
”ہر کام کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ دل سے کام کرو تو سب آسان ہے۔“
- 22- ”فیوچر پلاننگ؟“  
”جی..... ابھی تو سارا فوکس اداکاری پر ہے مگر فیوچر میں پروڈیوسر بننے کا ارادہ ہے۔“
- 23- ”کیا بننا چاہتی تھیں؟“  
”بڑھائی کے دوران ہی اس فیلڈ میں آ گئی تو اس کو پروفیشن بنالیا اور نہ شاید بزنس وومن ہوتی۔“
- 24- ”کیسے سے دوستی؟“  
”اب بہت اچھی ہو گئی۔ شروع شروع میں بھی بہت پر اعتمادی میں۔“
- 25- ”غصہ جلدی آتا ہے؟“  
”نہیں..... اللہ کا شکر ہے، میں ایک خوش مزاج، ملنسار اور ہنس کھڑکی ہوں۔“
- 26- ”کم گویا توئی؟“  
”قبیحہ..... بہت باتوئی ہوں۔ کسی کو بور نہیں ہونے دیتی۔“
- 27- ”فخر کا کوئی لمحہ؟“  
”جب لوگ تحریف کرتے ہیں۔ گھر والے اور خاندان والے میرے کام کو سراہتے ہیں۔“
- 28- ”فلکوں سے آفرز ہوئیں؟“  
”جی بہت آئیں۔ مگر ابھی انتظار ہے بہت ہی اچھے رول کا۔ اپنے ناظرین کو مایوس نہیں کرنا چاہتی چھوٹا رول کر کے۔“
- 29- ”اگر مارننگ شو کی میزبانی کرنا پڑے تو؟“  
”ارے واہ جی۔ ضرور کروں گی۔ بہت انجوائے کروں گی۔“
- 30- ”پسندیدہ پروفیشن؟“  
”پسندیدہ پروفیشن؟“



”یہی فیملی..... پھر بزنس پھر بیچنگ۔ تینوں پروفیشن مجھے بہت پسند ہیں۔“

31- ”اداس ہو جاتی ہوں؟“  
”جب ماما کے ساتھ گزرا وقت یاد آتا ہے تو.....“

32- ”کیا لوگوں میں جلدی گھل مل جاتی ہیں؟“

”عموماً..... جلدی گھل مل جاتی ہوں۔“  
33- ”ایک بیماری جس سے خوف زدہ رہتی ہیں؟“

”ویسے تو ہر بیماری بری ہوتی ہے مگر کینسر سے بہت ڈر لگتا ہے کیونکہ والدہ کو بھی کینسر ہو گیا تھا اور پتا اس وقت چلا جب وہ پچھل چکا تھا۔“

34- ”عشق و محبت میں فرق؟“  
”عشق خدا سے ہوتا ہے اور محبت انسان سے ہوتی ہے۔“

35- ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“  
”جب کوئی اپنا چمچرتا ہے یا جب ہم کرائس میں ہوتے ہیں۔ ماما کے جانے کے بعد تو زندگی بہت بری لگنے لگی تھی۔“

37- ”زندگی سے کیا سیکھا؟“  
”بہت بے اعتبار ہے یہ زندگی۔“

38- ”اپنے آپ کو کب ساتویں آسمان پر دیکھتی ہیں؟“  
”بعضی نہیں۔ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔ اللہ مجھے غرور سے بچائے، آمین۔“

39- ”شوہرنے ذاتی زندگی کو متاثر کیا؟“  
”بالکل بھی نہیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو بہ خوبی نبھانا جانتی ہوں۔“

40- ”آپ کے ڈراموں کی تعداد؟“  
”کافی ہیں۔ جو یاد ہیں، وہ بتا دیتی ہوں۔ میں ہاری پیا، بند کھڑکیاں، خدا میرا بھی ہے، زرد موسم، میری ماں، ذرا سی بھول، دل تیرے نام، رخصتی۔“

41- ”کوئی کردار جو کر کے پچھتا سکیں؟“  
”نہیں۔ ایسا تو کوئی کردار نہیں ہے۔“

43- ”ایک کردار جو کر کے مڑ آیا؟“  
”جی ڈراما سیریل ”انتظار“ میں، میں نے ایک نفسیاتی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جو کہ بہت اچھا اور چیلنجنگ تھا۔“

44- ”کوئی کردار جس کو کرنے سے انکار کیا ہو؟“  
”ایسے کردار تو ملتے ہی رہتے ہیں۔ سب کردار تو کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ انکار اقرار تو چلتا ہی رہتا ہے۔“

45- ”زندگی کے لیے آپ کا فلسفہ؟“  
”جو اور جینے دو کیونکہ دو چار دن کی تو زندگی ہے۔ کیا گلے شکوے کرتا؟“

46- ”فیس بک، انسٹا گرام اور انٹرنیٹ سے آپ کی دلچسپی؟“  
”ہاں ہے..... مگر بہت زیادہ نہیں۔ اتنی کر بڑی نہیں ہوں۔“

47- ”موبائل فون؟“  
”ہاں..... یہ بہت ضروری ہے مگر جب نہیں تھا تب بھی تو دنیا چل ہی رہی تھی۔“

48- ”آپ کے ہاتھ میں موبائل کب آیا؟“  
”میٹرک کے بعد کہ والد صاحب بچوں کے ہاتھ میں موبائل دینا پسند نہیں کرتے۔“

49- ”بچپن کتنا یاد آتا ہے؟“  
”بہت زیادہ..... بہت سنہرا دور تھا۔ بہت انجوائے کیا میں نے اپنے بچپن میں۔“

50- ”بچلی میں کون مزاج کا تیز ہے؟“  
”پاپا کا غصہ تیز ہے، ان کے مزاج میں نرمی نہیں ہے۔ شاید والد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

51- ”گھر میں سب سے زیادہ دوستی کس سے تھی یا ہے؟“

”دوستی تو سب سے ہی ہے۔ مگر ماما سے کچھ اور ہی رشتہ تھا۔ پیار والا، ماں والا اور دوست والا۔“

52- ”بچپن کی کوئی خاص بات؟“  
”بہت بڈر بچی تھی۔ بس شرارتیں کرتے ہی گزر گیا۔“

53- ”کیا آپ ہاتھ روم نگر ہیں؟“  
”بالکل ہوں۔ کبھی بھی لگتا ہے کہ میرے گلے میں سر ہے۔“

54- ”کب گنگٹانے کو دل کرتا ہے؟“  
”جب بہت خوش ہوتی ہوں یا پھر بہت اداس ہوتی ہوں۔“

55- ”میوزک میں کوئی خاص چوائس؟“  
”میں ہر طرح کے میوزک کی شوقین ہوں کیونکہ یہ روح کی غذا ہے۔“

56- ”کن فنکاروں کے ساتھ کام کر کے سیکھنے کو ملا؟“  
”نعمان اعجاز اور جاوید شیخ..... بلکہ میں تو سب سینئر فنکاروں سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتی ہوں۔ ان کے تجربے بات سے فائدہ اٹھاتی ہوں۔“

57- ”پچھانے جانے پر لوگوں کے بے ساختہ رویار کس؟“  
”ارے آپ تو بہت چھوٹی ہیں جبکہ اسکرین پر آپ بڑی نظر آتی ہیں۔“

58- ”ملنے پر لوگ کیا فرمائش کرتے ہیں؟“  
”سیلفی، پلیز۔“

59- ”ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے؟“  
”جب لوگ میری اداکاری کی تعریف کرتے ہیں۔“

60- ”اپنے بارے میں آپ کے خیالات؟“  
”کہ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور سب کا خیال رکھتی ہوں۔“

61- ”سب کو خوش رکھنے میں اپنا دل ٹوٹ جاتا ہے، ایسا ہے؟“

”نہیں..... اکثر ایسا ہوتا ہے۔“  
63- ”مطالعہ کا شوق ہے؟“  
”بہت..... جب موقع ملتا ہے کسی بڑے ادیب اور شاعر کو ضرور پڑھتی ہوں۔“

64- ”زندگی کب تقسیم ہو جاتی ہے؟“  
”جب شادی ہو جاتی ہے۔ بہت سی ذمہ داریاں آ جاتی ہیں پھر پہلے والی روٹین کہاں رہتی ہے۔“

65- ”تقریبات میں جاتی ہیں؟“  
”بہت کم..... کیونکہ شادی کے بعد اب میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔“

66- ”وقت کی پابندی کی قائل ہیں؟“  
”قائل تو ہوں مگر ”چوک“ ہو ہی جاتی ہے۔ وقت کی پابندی نہ ہونے میں بہت سے فیکٹر شامل ہیں۔“

67- ”سات دن شوٹ..... گھر ڈسٹرب ہوتا ہے؟“  
”میں نے آپ کو بتایا کہ میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے اس لیے گھر ڈسٹرب نہیں ہوتا اور اتوار کے دن میں کوئی شوٹ نہیں رہتی۔“

68- ”گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟“  
”اپنے کمرے میں اور وہ جگہ جہاں میں نماز پڑھتی ہوں۔“

69- ”چھٹی کے دن کہاں جانا پسند کرتی ہیں؟“  
”اپنی فیملی کے ساتھ کہیں بھی۔“

70- ”فیشن سے لگاؤ؟“  
”ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔ مجھے بھی میک اپ کرنا، جوڑیاں پہننا اور میاں صاحب کے لیے سنگھار کرنا اچھا لگتا ہے۔“

71- ”غصہ آ جاتا ہے؟“  
”جی بالکل آتا ہے جب کوئی جھوٹ بولے تو۔“

72- ”رد عمل؟“  
”خاموشی اختیار کر لیتی ہوں۔ بات کم کرتی ہوں۔“

”آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟“  
”ایسا نہیں ہوگا کیونکہ میں اپنا کام بہت ایمان داری اور لگن کے ساتھ کرتی ہوں۔“





نادانِ خالقون



خط بھجوانے کے لیے پتا  
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
Email: info@khawateendigest.com

شازیہ الطاف ہاشمی..... شجاع آباد  
خواتین ڈائجسٹ کی شازیہ چوہدری ہوں، فرحانہ  
ناز ملک یا پھر جواں سال رومی انشاء ان سب کا درد ہمارا اپنا  
درد ہے جیابخاری وہ خوشبو میں لکھنے والی ہمیں ”کرب“  
دے کر ہمیشہ کے لیے کرب سے نجات پا گئیں مگر  
خوشبوؤں کے سفر کبھی ختم نہیں ہوا کرتے۔ لفظ کبھی مر نہیں  
کرتے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اپنے محبت بھرے انداز پر،  
خلوص سوچ اور تمام تر حساسیت کے ساتھ جنت کی اس  
شہزادی کو اللہ بلند درجے عطا فرمائے، ان کے دکھ کے  
ایک ایک لمحے کے بدلے انہیں اپنی آغوش رحمت میں جگہ  
دے۔ اس کا سفر کو کہ بہت مختصر تھا مگر اس کے الفاظ کے  
اندر نے جہاں آباد ہیں ان چھوٹے، ان دیکھے جنہیں  
رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ پیاری جیامیں نے کبھی  
تمہیں نہیں دیکھا مگر تمہارا دکھ ماں جاپوں جیسا ہے۔  
ج: جی شازیہ! جیابخاری کو واقعی بھلا یا نہیں جا

سکتا۔ حیادہ پیاری سی لڑکی بہت سارے دلوں میں اپنا گھر  
بنا گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔  
آمین

راہجہ وحید اور کشمالہ زاہد..... خوشاب 5 چک  
ٹاکسل گرل ہندی کی دلہن نہیں بلکہ اس کی دوست یا  
کزن معلوم ہوتی تھی اور آپ اسٹک کچھ زیادہ ہی گہری  
تھی۔ خیر اور آل خواتین ڈائجسٹ بورنگ ہوتا جا رہا  
ہے۔ ”حالم“ نام اچھا ہے لیکن اسٹوری بالکل اچھی نہیں  
ہے۔ غیرہ احمد کا ناول اب پور ہوتا جا رہا ہے، کافی مہینوں  
سے کوئی ایسا ناول نہیں آیا جس کو پڑھ کر دوبارہ پڑھنے کو  
دل کرے۔ فرح بخاری، مریم عزیز، سہیلہ ایوب، نیلہ عزیز،  
فرزانہ کھرل سے ضرور اچھا سا ناول لکھوائیں۔ عازنہ  
خان کا انٹرویو شائع کریں۔

ج: پیاری راہجہ! ہمیں افسوس ہے کہ ٹاکسل سے  
لے کر ناولوں تک آپ کو خواتین ڈائجسٹ میں کچھ بھی  
اچھا نہیں لگا۔ کوشش کریں کہ اسے مزید بہتر بنا سکیں۔

زاہد محمد خان..... شادیوال ضلع کجرات  
کبھی سنی میں مدیرہ کی باتوں سے سو فیصد رضامند  
ہوں۔ ہمارے نام میں دوسروں کے خط مجھ سے بہت بہتر  
تھے۔ الف بہت شاندار ناول ہے۔ ویل ڈن عمیرہ احمد۔  
حالم بھی بہت شاندار ہے۔ زندگی ایک پھیلی کمال کا  
تھا۔ ”میرا ایک آئینہ ہے“ ویری گڈ ”میرے تم“ سدرۃ  
النتہی کا ناول بھی قابلِ تریف ہے۔ باقی سارے افسانے  
بھی سبق آموز تھے۔ اسامہ اعظم خان سے باتیں اچھی  
لگیں۔ عدنان بھائی کے شعور سے اچھے ہوتے ہیں۔

ج: پیاری زاہدہ! ہماری قارئین ہی کے دم سے  
ہماری محفل میں رونق ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ  
ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں۔

راہجہ ملک جویریہ عینی..... قصبہ فیروزہ ضلع رحیم یار خان  
شکوے تو بہت سنے ہوں گے اب تک لیکن  
ایسا شکوہ آپ شاید پہلی بار سن رہی ہوں، جی ہاں وہ یہ کہ  
میری سسر کو اعتراض ہوا بلکہ باقاعدہ روکھ کر بیٹھ گئی کہ آپ  
نے ہمیں ”پیاری“ کیوں نہیں لکھا؟ افف..... میں نے  
کافی سمجھا مگر بے سود اس لیے خط لکھنے ہی بنی کہ شاید اب  
کی بار لکھ دیں..... بنیے گا مت پلیز۔

جیابخاری کا فیس بک پہ پڑھ لیا تھا اور صدمے سے  
کئی دن بے یقین رہی۔ بہت ہی افسوس ہوا حد درجہ  
آفس تو اتار سے بچتے رہے اور مکی سوچ آتی رہی کہ زندگی  
بے وفا ہے، دینا دھو کے کے سوا کچھ نہیں۔

ج: راہجہ اور جویریہ! آپ دونوں ہی ہمیں صرف  
پیاری نہیں بلکہ بہت بہت پیاری ہیں۔ تو پیاری راہجہ! اور  
پیاری جویریہ! زندگی واقعی بہت بے وفا ہے۔ اچانک ہی  
ساتھ چھوڑ دیتی ہے مگر کیا کریں جو اللہ کی مرضی۔ ہمیں آ  
کر تو احساس ہوتا ہے کہ انسان کتنا بے اختیار اور بے بس  
ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نزهت اسد اللہ..... کراچی  
خواتین سے واقفیت تو بہت پرانی ہے مگر مطالعہ کا  
سلسلہ ٹوٹا جڑتا رہا ہے وجہ شادی۔ اور پھر ایک کے بعد  
ایک بچوں کی پیدائش ہے۔

سب سے پہلے عمیرہ احمد کا ناول الف پڑھا۔ الف  
بہت شاندار چلا رہا ہے۔ پتا نہیں اتنی خوب صورت تحریریں  
کیسے یہ رائے شکر لکھتی ہیں۔ بقول غالب آتے ہیں غیب  
سے یہ مضامین خیال میں۔

کبھی سنی اور کرن کرن روشنی سے مستفید ہوتے  
ہوئے سہیل وڈاچ کا انٹرویو بہت پسند آیا آج تک ان  
کے منفرد انداز گفتگو سے ہی محفوظ ہوتے تھے اب پتا چلا کہ  
وہ بہت قابلِ انسان بھی ہیں۔

جیابخاری کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا کہ ان  
کو کیا پیاری تھی ادارے کی طرف سے ان کے بارے میں  
اور کوئی تحریر نہیں تھی۔

فرزانہ کھرل کی ”میرا اک آئینہ ہے“ مکمل ناول  
بہت سبق آموز تحریر ہے۔ ”اصول“ سمیرا عثمان گل کی مختصر  
اور جامع تحریر بہت خوب لگی۔ سدرۃ النتہی کی ”میرے تم“  
میں رشتوں میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ اسبہ کے  
چاچو اپنی بیوی بچوں، اپنی بیٹی کے ساتھ ایسے بیوی بچوں کو  
براہروی کی محبت دیتے تو یہ مقابلے کی فضا قائم نہ ہوتی۔

ج: نزهت! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل  
سے ممنون ہیں ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی  
راے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

راحیلہ اکرم..... انک

جیابخاری کا افسانہ ”کرب“ پچھلے ماہ پڑھا بہت ہی  
عمدہ تحریر۔ اچانک سے ان کی وفات؟ اٹکل کی تحریر  
(آہ..... جیابخاری) کتنی دیر میں سکتے کی کیفیت میں رہی  
اللہ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس  
میں جگہ دے آمین۔

میں تقریباً 82ء-83ء سے خواتین اور شعاع پڑھ  
رہی ہوں اس زمانے میں میری ایک دوست رسالے  
خریدتی تھی اور میں اس سے لے کر پڑھا کرتی تھی۔ شادی  
کے بعد میاں نے لے کے دینے شروع کئے میں نے کافی  
سارے ڈائجسٹ بیچ کر لیے تھے پھر مجھے گھر بیچ کرنا پڑا  
اور میں دوسرے گھر میں آئی تو میری چھوٹی بہن نے وہ  
تمام ڈائجسٹ ردی والے کو دے دیے، میں اس غم میں  
ڈھیر سارے دن تک روتی رہی اور اب بھی روتی ہوں،  
اب میں باقاعدگی کے ساتھ 2010ء سے یہ تینوں  
ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور میں اپنے بچوں کی طرح ان کو  
سنبھال کے رکھتی ہوں۔ میں نے ان ڈائجسٹ سے بہت  
کچھ سیکھا، یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دسمبر کے بعد  
جنوری اور فروری میں میری طبیعت بہت خراب رہی اور  
میں ذہنی طور پر بہت زیادہ ڈسٹرب تھی میرا جی کہ ”ام الحقیقین“  
پڑھ کر اس بیماری سے لڑنے کا حوصلہ ملا۔

سب قاری بہنیں اور ان کے خطوط پڑھ کر بہت  
لطف آتا ہے۔

ایضاً انا بہت ناظم سے غائب ہیں ”کرن کرن  
روشنی“ پڑھ کے میری معلومات میں بہت اضافہ ہو رہا ہے  
اور پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے ہم جیسی کم پڑھی لکھی  
خواتین خاص طور پر باقاعدگی سے احادیث پڑھنے اور  
سیکھنے باہر نہیں جاسکتی ہیں تو ادارہ ہماری اس تنگی کو بہت عمدہ  
طریقے سے پوری کر رہا ہے۔

یہ تمام ڈائجسٹ مجھے میرے میاں لا کے دیتے  
ہیں۔ اور میں تمام ڈائجسٹ کو بہت زیادہ سنبھال کے رکھتی  
ہوں کہ آئندہ جب میں نہ ہوئی تو یہ ڈائجسٹ ہی میری بیٹی  
کا ہاتھ پکڑ کے چلنا سکھائیں گے۔

ج: پیاری راحیلہ! آپ ایک طویل عرصہ سے  
ہمارے ساتھ ہیں۔ باقاعدگی سے ہمارے پرچے پڑھتی



ہیں۔ تو خط اتنی تاخیر سے کیوں لکھا۔ جبکہ آپ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں۔ اتنے طویل عرصے سے جو پرچے آپ نے سنبھال کر رکھے تھے وہ روئی میں چلے گئے تو دھکی بات تو ہے نہیں بھی بہت افسوس ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور صحت و تندرستی عطا کرے آمین۔ خط آپ نے بالکل ٹھیک انداز سے لکھا اور بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔

مارے نذیر..... 26 جنوری

ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ ٹیکہ بہت پسند آیا اور باقی زیورات بھی۔

”کہنی سنی“ اچھی رہی۔ حمد اور نعت سے مستفید ہوتے ہوئے دوڑ لگائی ”الف“ کی طرف، بہت لا جواب قسط، عمیرہ آپ نے مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ کریں گی اگر اپنا تبرج دوں تو؟

گزارش ہے وسم بادامی کا بھی لیں انٹرویو، باقی پورے کا پورا ”خواتین“ بہترین رہا۔ ”پکوان“ پلیز پلیز ”خلوہ جات“ کی ترکیب دے دیں۔ خصوصاً بچے کی دال کا خلوہ بنانے کی ترکیب اپریل میں لازمی دیجیے گا پلیز۔

وہ میں نے پوچھا تھا کہ سیدہ نسبت زہرا پی ایچ ڈی کرنے یاہرگی تھیں۔ 2016 میں؟ کیا وہ واپس آئیں گی؟ لازمی بتائیے گا۔

ج: پیاری ماریہ! اگر عمیرہ احمد نے آپ سے بات کرنا چاہی تو ہم آپ کو بتا دیں گے۔ آئندہ خط میں اپنا فون نمبر ضرور لکھیے گا۔

سیدہ نسبت زہرا کی پی ایچ ڈی مکمل ہوگی تب ہی واپس آئیں گی۔ انہوں نے ہماری محفل میں شرکت نہیں کی، اس سے اندازہ ہوا ہے کہ فی الحال پڑھائی میں مصروف ہیں۔ خلوے کی ترکیب دی جا رہی ہے۔

ماہا شیر حسین..... ڈنک

ٹائٹل کافی پیارا تھا۔ کرن کرن روشنی بہت خوب صورت اور پیارا سلسلہ ہے۔ اسامہ اعظم کا انٹرویو پسند آیا۔ سہیل وراج انکل کی باتیں کافی دلچسپ رہیں پرباف تھا۔ انٹرویو؟ خاموشی کو زبان شرمین کے جوابات کچھ خاص نہیں تھے۔ آہ..... حیا بخاری ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہیں گی۔ الف عمیرہ احمد نے یہ قسط بھی شاعر لکھی۔ عالم نمرہ احمد نے یہ قسط بالکل بورنگ لکھی۔ ساری قسط تالیہ کے

ہی گردگوشتی رہی؟ باقی کردار تو تک برابر ہی تھے۔ اب ناول اینڈ کریں ہم تالیہ سے اکتا گئے ہیں۔ میرا ایک آئندہ ہے، فرزانہ کھل اتنا مشکل لکھتی ہیں کہ سر سے گزر جاتا ہے۔ پلیز آسان لکھا کریں میں نے فلسفے میں ماسٹر نہیں کیا ہوں۔ ”میرے تم“ سدرہ انتہی کا ناول بھی بالکل بورنگ تھا۔ قسطوں میں پڑھا۔ زندگی ایک پیکل پیے افشین نعیم نے کم از کم پڑھنے لائق لکھا۔ کفایت شعار واقعی ہر بچت کرنے والا سلیقہ شعار نہیں ہوتا۔ احساس مرد کو بھی ہوا ہی نہیں (آج تک نہیں دیکھا) سیدہ راستہ ماہم انصاری سر سے گزر گئی، سمجھ میں نہیں آیا لکھی کیا کرتی تھی۔ اصول وہی ساس بھو کی گھریلو سیاسی کہانی۔ گھر آنگن میں علی صاحب آخر محبوب سے شوہر بن ہی گئے میں بھی کہوں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ مسعود صدیقی کی غزل اور عمار مسعود کی نظم پسند آئی۔ میری ڈائری سے انھی ناصر اور یاسر عبدالرؤف کا انتخاب پسند آیا۔ ہمارے نام سلمیٰ ناز کے خط کا جواب نہیں تھا؟

ج: پیاری ماہا! آپ کی تعریف تحقید ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

درخشش ضیاء..... کراچی

میں پچھلے 20 سالوں سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں، مجھے کتا میں پڑھنے کا شوق، اپنے والد صاحب سے ملا ہے۔ میرے والدین نے کبھی بھی مجھے مطالعہ کرنے سے نہیں روکا بلکہ ہر ماہ خود میرے لیے رسالے لے کر آتے تھے سوئم جماعت میں پہلی بار ایک نظم کہی۔ شادی کے بعد ماشاء اللہ شوہر بھی مطالعے کے شوقین ملے۔

خواتین ڈائجسٹ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندگی کو برتنے کا ڈھنگ آیا ہے۔ میری پوری توجہ کا دارو مدار کہنی سنی پر ہوتا ہے۔ کرن کرن روشنی میں وصیت کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اگر والدین اپنی زندگی میں ہی اولاد کو اس کا حق دے دیں یا وصیت لکھ کر رکھ دیں تو ان کے جانے کے بعد اولاد آپس میں نہ لگھے۔ صحابی سہیل وراج مجھے ویسے ہی پسند ہیں۔ بہت مزہ آیا ان کے بارے میں جان کر۔

افشین نعیم نے بھی اپنے قلم کا کمال دکھایا ہے۔

مسرت جہاں جیسے کردار ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ جوان پاکھنڈی باباؤں کے چکر میں آجاتے ہیں۔ قرۃ العین سکندر کی لکھی تحاریر بہت پسند آتی ہیں پر پتا نہیں کیوں احساس زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ سائرہ کی حالت پر رونا آ رہا تھا۔ میرا اک آئندہ ہے۔ فرزانہ کھل نے خوب لکھا ہے۔ ماہم انصاری کا سیدہ راستہ حالات حاضرہ پر تھا۔ یہ تک ناک نامی بلا کسی زہر کی طرح نو جوان نسل میں سرایت کر گئی۔ سدرہ انتہی بہت اچھا لگا آپ کو پڑھ کر۔ امبر نے بہت کچھ کھو کر بھی سب کچھ پالیا۔ سیرا عثمان کے اصول کے بارے میں کیا لکھوں۔ میں خود اس مرحلے سے گزری ہوں۔ نظم اور غزلیں سب کی اچھی تھیں مگر مسعود صدیقی کا تو جواب نہیں۔

حیا بخاری کے بارے میں کیا کہوں۔ بہت ہی پیاری لکھاری بہن تھیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور انہیں جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے آمین۔

ج: پیاری درخشش! لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ گھر والوں کا تعاون بھی حاصل رہا۔ پھر بھی آپ نے بیس سال لگا دیے خط لکھنے میں۔

ہم آپ کو خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

بہت اچھا خط لکھا ہے۔ آپ نے۔ ہر کہانی پر جامع تبصرہ کیا ہے۔ آپ کو خط لکھنے کی ہمت بہت پہلے کر لیتا چاہیے تھی۔

خوشی..... سرانوالی سیالکوٹ

یوں تو خواتین کے تمام سلسلے بہت دلچسپ ہیں لیکن ”حالم“ ناول کے تو کیا کہنے۔

”الف“ ویل ڈن عمیرہ جی، مومن کے راستے مومن کی طرف کا گزرنے والے نظر آ رہے ہیں۔ کیا طرہ واقعی مرچکا ہے۔

”اصول“ میں سیرا عثمان نے بالکل ٹھیک نقطہ اٹھایا۔

”بیوٹی بکس“ سلسلہ زبردست ہے۔ لڑکیاں اس سے خوب مستفید ہو رہی ہیں۔ انیتا شرمین کا تعارف اچھا لگا۔ ”آپ کا باورچی خانہ“ ہمیں بھی موقع دے دیجیے۔ ہم سرایا انتظار ہیں۔ ”موسم کے پکوان“ کچھ خاص نہ تھے یاسر عبدالرؤف کی نظم دل کو لگی اور خوب لگی۔

”عمار مسعود“ کی نظم موجودہ حالات کے تناظر میں پسند آئی۔ کرن کرن روشنی بہت ایمان افروز سلسلہ ہے۔ ”حیا بخاری“ کی موت کی خبر نے ہلا کر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

ج: پیاری خوشی! ہماری محنت اور کوشش آپ کو پسند آئی بہت خوشی ہوئی یہ جان کر..... امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

آمنہ مہر..... جڑانوالہ

سب سے پہلے ”الف“ پڑھا۔ مجھے لگا ہے مومن اور مومن مل جائیں گے آخر پر۔ ”گھر آنگن میں“ اچھا نصیحت آموز افسانہ تھا۔ ”کفایت شعار“ واقعی میں ایسا ہوتا۔ میں نے بھی دیکھا ہے۔ زندگی اک پیکل میں تیں سال بعد ماسٹر جی تنہا ہو جائیں گی سن کے مزا آیا۔

”احساس“ معاشرے کی تلخ حقیقت سے روشناس کرانا افسانہ تھا۔ ”میرا ایک آئندہ ہے“ رسالے کی جان تھا۔ بے حد خوب صورت۔ محبتوں اور انا کے احساس سے گندمی کہانی۔ ماہم انصاری نے بہت اچھا افسانہ لکھا۔ ”میرے تم“ میں چاچو کا کردار پسند آیا اور چاچو کے بھائی کا بھی ”اصول“ بالکل صحیح کہا۔

”حالم“ میرا پسندیدہ ناول ہے۔ اس میں سیکھنے کا خود کو گروم کرنے کا مارجن بہت زیادہ ہے۔

ج: پیاری آمنہ! میری خاموشی کو بیاں ملے، کے سوالات اگلے ماہ شائع کریں گے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فرزانہ سلیم شاہ..... نامعلوم شہر

اس مینیہ کی ماہم انصاری کی احساس الگ سی کہانی تھی۔ نمرہ احمد کا عالم بھی کافی پسند آ رہا ہے۔ اور مسعود صدیقی کی غزل بہت ہی پسند آئی۔

ج: بہت شکریہ فرزانہ!

شاہدہ ظفر..... ڈیرہ جستی بھادلو پور

”کرن کرن روشنی“ پڑھ کر جست لگائی اپنے فیورٹ ناول ”الف“ کی طرف۔ عمیرہ آپنی زبردست لکھ رہی ہیں۔ نمرہ احمد کی ”حالم“ واہ ہر کردار۔ ذہانت سے بھرپور ہونے کے ساتھ سیاست سے بھرپور بھی۔

ناول میں سدرہ جی کہانی طویل تھی رلایا بھی۔







غذا سبکی ہے، میری امی کہتی ہیں بچپن میں بھی بچے کھلونوں سے کھیلتے تھے اور میں کتابوں میں کم ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی نازن، عمر وعیار، الدین، شہزادیوں، پریوں کی کہانیاں پڑھتی تھی اور اب لڑکیوں کو میک اپ، چوہری اور کپڑوں کا شوق ہوتا ہے اور میں خاندان کے فکشن چھوڑ کر گھر کے کاموں اور رسالوں میں کم ہوتی ہوں۔ سب کو مجھ سے شکایت ہوتی ہے، کافی لمبی کہانی ہوتی۔

(3) اداس رکھو، خوش رکھو، ہم گھ نہیں کرتے خزاں میں پھول بھی کھلا نہیں کرتے ملاوہ خاک میں ہمیں مگر دھیان رہے ہم جیسے لوگ پھر ملا نہیں کرتے شمع ملک

(1) بچپن میں جنوں، پریوں کی کہانیاں پڑھتے، کوہ قاف کی پریاں تلاشتے، راہ بھٹکے، اچانک ڈائجسٹ کی وادی میں آنکھ۔ غالباً ساتویں جماعت میں سالانہ امتحانات میں کامیابی کا انعام تھا کہ سائنس کی ٹیچر نے پہلا ناول سنایا اور یوں ہمارا پیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعارف ہوا۔ پھر عمر وعیار، نازن کے کرداروں کی جگہ انسانی جنگل میں رہتے، انسانی رویوں سے لڑتے کرداروں سے ملاقات ہوئی۔

ایا کو ڈائجسٹ پڑھنا پسند نہیں تھا۔ چھوٹی پھیپھو پڑھا کرتی تھیں۔

2012ء میں گریجویشن کی غرض سے کالج میں ایڈمیشن لیا تو کالج کے گیٹ کے سامنے بک ڈپو سے جھانکتے رسالوں نے طلب کی چنگاری کو ہوا دی۔ اور یوں اپنے جیب خرچ سے پہلا رسالہ خریدا۔ پہلے خواتین، پھر شعاع، پھر کرن۔ طلب کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ گویا لگ لگی تھی۔

پھر پڑھائی کی ذمہ داریوں کے پیش نظر اسے شہر سے ہجرت کی تو سب شوق گھر کی دہلیز پر پڑے رہ گئے۔ میں نے دانستہ بھی اس شوق کو پاؤں کی زنجیر بننے سے روکا۔ جب گھر واپس لوٹی تو یہ شوق میرے لوٹنے کی راہ

دیکھ دیکھ ہار چکا تھا۔ پھر پیشہ ورانہ مصروفیت کی بھڑ میں شوق زندہ ہوا لیکن کتابی شکل میں۔ کچھ دوست، استاد ایسے ملے جنہوں نے کتابوں کے شوق کو بڑھا دیا۔

چند روز پہلے بازار سے گزرتے عرصے بعد، ایک بار پھر پرانا شوق، پھڑے دوست کی مانند بھرے بازار میں آن ملا۔ اور ہم نے اس کی صدا پر لبیک کہا۔

(2) بڑی بہن کی شادی کے بعد ماما کے سر سے ذمہ داریوں کا بوجھ ہٹانے کی کوششوں میں غلطان..... گھر اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے حصار میں گھری زندگی زیادہ عیاشی کی اجازت تو نہیں دیتی۔ لیکن بھی کھار دل کے موسم کے مطابق کتابوں کی الماری سے جھانکتی کوئی کتاب صدا دیتی ہے تو لبیک کہتے ہی بنتی ہے۔ پھر بھانگی، دوڑتی زندگی سے چند لمحے چرا کر، وقت کی لگا میں کس کر، کوئی کتاب کھول لیتی ہوں اور کتابی دنیا کے بحر میں کھو جاتی ہوں۔ مادی دنیا کچھ وقت کے لیے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ پڑھتی ہوں، کچھ سنتی ہوں اور زندگی کا یہ سفر رواں دواں ہے۔

(3) بیت بازی کے شوق کے پیش نظر کوئی ایک شعر کہنا تو مشکل ہے۔ کچھ اشعار ہیں جو اکثر لبوں پر رہتے ہیں۔

یہ نہیں دیکھتے کتنی ہے، ریاضت کس کی لوگ آسان سمجھ لیتے ہیں آسانی کو

تری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول  
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

اظہر فراغ

راہبہ حسین..... ممتاز آباد ملتان

(1) میں خواتین ڈائجسٹ تقریباً 2002ء سے پڑھ رہی ہوں۔ جب میں محض چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ تب صرف لطائف، اشعار، کرن کرن روشنی یا کوئی مختصر افسانے وغیرہ پڑھ لیتی تھی۔ پھر ناول بھی پڑھنا شروع کر دیے۔ درمیان میں وقفہ بھی آتا گیا۔ اب 2007ء سے باقاعدہ خرید کر پڑھنا شروع کیا ہے۔ اور ابھی تک ساتھ ہے۔ اللہ کرے یونہی ہمیشہ ساتھ رہے۔ رہ

مگی بات تعارف کی تو میری پھیپھو کے پاس چند خواتین ڈائجسٹ کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ کچھ وہ بڑھے، کچھ ردی میں سے خریدے۔ لیکن جب راحت جنیں کی کہانیاں پڑھنا شروع کیں تو پھر میں نے باقاعدگی سے خریدنا شروع کیا۔

(2) روزمرہ کی روٹین..... وہی گھر کے نہ ختم ہونے والے کام۔ شکر ہے سب کچھ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ دوران تعلیم تو کورس کی کتابوں میں چھپا کر پڑھتی تھی۔ ایک بوتیک میں کچھ عرصہ جاب کی۔ وہاں بھی یہ میرے ساتھ ساتھ ہوتا تھا، میری باس خود بہت شوقین تھیں۔ وہ حیران ہوتی تھیں کہ تم پرانے رسائل بھی اتنی توجہ اور ذوق و شوق سے کیسے پڑھتی ہو؟ کھانا پک رہا ہے تو خواتین میرے ہاتھ میں ہے۔ حتیٰ کہ میں سلائی کرتے ہوئے بھی رسالہ پڑھتی ہوں۔ میرے لیے تو یہ سوال کچھ یوں ہونا چاہیے تھا کہ مطالعے کی مصروفیات کے دوران باقی کاموں کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟ جب میں بیوٹیشن کا کورس کر رہی تھی تو اکثر کٹر خواتین مجھے رسالے والی باجی کہا کرتی تھیں۔ بے تاحرے کی بات۔

(3) انف۔ یہ کیا پوچھ لیا؟ شعر کے سلسلے میں پسند بدلتی رہتی ہے اور اکثر یاد ہی نہیں رہتے۔ بہر حال آج کل میرا پسند یہ ہے۔

گل چھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ شربھی  
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

شرین عرف شمر..... کوٹ برکت علی

(1) ہم نے پہلے شعاع پڑھنا شروع کیا تھا جب ناول یارم شروع ہوا تھا تو میری بہن کی شادی ہوئی۔ اس نے خواتین کی سے لیا اور اس میں خوش نصیب والی کہانی پڑھی اور مجھے بتایا کہ کہانی میں لڑکی کا نام خوش نصیب ہے اور اس کی حرکتیں بھی سنائیں بعد ازاں مجھے بھی پڑھنے کے لیے دے دیا تو خواتین اس طرح ہم نے پڑھنا شروع کر دیا۔

(2) روزمرہ کی روٹین یہ ہے کہ صبح سویرے امی کی آواز سے اٹھتی ہوں نماز پڑھتی ہوں پہلے تو میں نماز پڑھ کے تلاوت کر کے ادھر ادھر پھرتی تھی اور ناشتا کرنے کے بعد گھر کے باقی کام کرتی تھی لیکن امی کو بیماری کی وجہ سے

آگ کے قریب جانا منع کیا ہوا ہے تو تب سے میں اٹھتی ہوں، ناشتا بناتی ہوں سب کو کرواتا ہوں، دل کرے تو خود بھی کر لیتی ہوں ورنہ نہیں اور ہماری کوئی ٹیٹ روٹین نہیں ہے۔ برتن دھوئے، جھاڑو لگا کر بچے اسکول چلے گئے تو تو گیارہ بجے تک فارغ ہو کر پھر رسالے میں کم ہو جاتی ہوں۔

(3) جی مجھے شاعری سے بہت لگاؤ ہے اور میں خود بھی شاعری کرتی ہوں تو میرا اپنا ایک شعر مجھے خود بہت پسند ہے۔

عرض ہے کہ.....

مجھ سے ملنا ہو تو پتا لکھ لو  
میرا بسرا ہے اداسیوں کے شہر میں  
حنا سلیم اعوان..... ہری پوری ہزارہ

(1) شعاع و خواتین پڑھنے کا چکا تو جناب 2001ء میں ہی لگ چکا تھا۔ پرانے رسالے خرید کر پڑھنے کا یہ دورانیہ 2001ء سے ستمبر 2006ء تک رہا۔ ستمبر 2006ء سے باقاعدگی سے شعاع کی قاری بنی۔ لیکن ہاں، پرانے خواتین ڈائجسٹ خریدنے کا سلسلہ بھی جاری وساری رہا۔ مجھے شعاع سے زیادہ خواتین کے ناول اور کہانیاں اٹریکٹ کرتیں۔ اور دل شدت سے چاہتا کہ بس کسی بھی طرح سے خرید لوں۔ پھر مجھ سے رہانہ گایب مارچ 2010ء کے دہن کے ناول کو شعاع میں دیکھا۔ تو جناب مارچ 2010ء ہی وہ مبارک ماہ ہے جب میری خواتین ڈائجسٹ سے دوستی استوار ہوئی۔ اور اب اس دوستی کو مارچ 2019ء میں الحمد للہ پورے نو سال پورے ہوئے ہیں۔

(2) روزمرہ کی ذمہ داریاں کچھ اتنی بھی خاص نہیں کہ مطالعہ کے لیے باقاعدہ وقت مخصوص کرنا پڑے۔ جس دن خواتین آتا ہے۔ بس وہی رات ہوتی ہے مطالعہ کی۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ ہو گیا تو اگلا دن۔ بس..... اور پھر مینے پھر کا طویل ترین انتظار شروع۔

(3) پسندیدہ شعر.....

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی  
تم مانگتے پھر دو گے اپنا غرور ہم سے

(باقی آئندہ)



## خجین ویکس

دسمبر

ہے۔ ڈراموں میں جس خود مختار، لبرل بولڈ اور خوب صورت لڑکی کی چالیس سال تک تیسری کی اسے نئے ڈراما رائٹر نے چار سال میں ہی مار ڈالا (اور ابھی بھی مار رہے ہیں مرے ہوئے کو) اب ہر ڈرامے میں لڑکیوں اور خواتین کو مار کھاتے، روتے اور تشدد کا نشانہ بننے دکھایا جا رہا ہے۔ (جب کہ ظلم بھی عورت ہی کر رہی ہے در پردہ عورت پر۔)

کچھ عرصے سے پاکستان میں طلاق کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن فریقین ایک دوسرے پر الزام دھرتے نظر آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ طلاق کی وجہ وہ ہیں۔ ایسے خال خال لوگوں میں صنم سعید کا بھی شمار ہوتا ہے۔

صنم سعید نے اپنی ناکام شادی کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ شادی کے کچھ



### معیار

پاکستان کی ڈراما انڈسٹری ان دنوں اچھے اسکرپٹ کی کمی کا شکار ہے (صرف ڈراما انڈسٹری؟ یہاں تو فلم انڈسٹری کا بھی سب سے بڑا مسئلہ اچھا اسکرپٹ ہی ہے) ویسے تو بہت سے نئے مصنفین سامنے آ رہے ہیں۔ ان کے ڈرامے اور فلمیں مقبول بھی ہو رہے ہیں لیکن ان کا معیار وہ نہیں ہے جو کچھ عرصے قبل تھا۔ کیونکہ نئے پروڈیوسرز کو اچھے اسکرپٹ کی تلاش تو رہتی ہے (بغیر محنت کے تلاش) لیکن وہ (معذرت کے ساتھ) معیاری اسکرپٹ پر ڈراما بنانے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ایک ہی انداز کے بنے ڈرامے یکسانیت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

ایک پروگرام میں بات کرتے ہوئے ماضی کی معروف ڈراما رائٹر حسنین کا کہنا ہے کہ انہیں آج کل کے ڈرامے دیکھ کر بہت افسوس اور تکلیف ہوتی



عرصے بعد انہیں احساس ہوا کہ ان سے شادی شدہ زندگی نہیں گزاری جائے گی۔ (یہ تو اکثریت کا مسئلہ ہے، مگر.....؟)

صنم نے بتایا کہ جب ان کی شادی ہوئی تو اس کے بعد ان کی والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی جس کے لیے انہیں اپنے شوہر اور شادی شدہ زندگی کو چھوڑنا پڑا (ہائیں وہ عیوں بھی؟) جہاں انہیں اپنی والدہ کا خیال کرنا پڑا وہیں انہیں احساس ہوا کہ شادی برقرار رکھنے کے لیے وہ مزید قربانیاں نہیں دے سکتیں (قربانیاں.....؟ پر کتھوں؟)

صنم سعید شادی کے بعد دینی منتقل ہو گئی تھیں (ان کی لومیرج تھی) جہاں ان کے بقول انہیں آزادی کا احساس تو تھا مگر وہاں انہیں بوریت بہت ہوئی کیونکہ وہ سولہ سال کی عمر سے کام کر رہی تھیں۔

### ترجیح

معمرانہ کرکٹر کے بیٹے ہونے کے باوجود کرکٹ کے بجائے فلم میں آ گئے (کرکٹ لفٹ کھیل ہے اور معمرا.....) معمرا نا جس وقت فلم میں آئے اس وقت سلطان راہی کے ساتھ ساتھ شان بھی کام کر رہے تھے۔ معمرا نا نے اپنی اداکاری سے اپنے سینئرز کو کافی لفٹ ٹائم دیا لیکن وہ فلم انڈسٹری کی سیاست کی نذر ہوئے اور انہیں سینئر ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا جاتا رہا حالانکہ ان کی بطور ہیرو فلمیں سپر ہٹ رہیں، اپنے غصے کا شکار بھی رہے۔

معمرا نا نے بڑی ملک جا کر بھی کام کیا۔ اس بارے میں معمرا نا کہتے ہیں کہ ”وہ پہلے پاکستانی اور پھر اداکار ہیں“ اب بھی ان کے پاس تین بھارتی فلموں کے اسکرپٹ اور ان کے ایڈوائس ہیں (وہ تو فلم بھی بن گئی) لیکن وہ بھارت میں کام نہیں کرنا چاہتے (کیوں بھی.....؟ پہلے تو کیا تھا اب کیا ہو گیا) پاکستانی فنکاروں میں پاکستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی چاہیے (کیوں بھی؟ صرف

ادا کاروں میں ہی کیوں؟) عزت کے آگے پیسے کو ترجیح نہیں دینا چاہیے (تو ایڈوائس کیوں لے رکھا ہے؟) پاکستان فلم انڈسٹری پہلے کی نسبت بہتری کی جانب گامزن ہے (اور آپ کم پیسوں میں کام کر لیں گے؟) بھارتی فلموں پر پابندی سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا (آپ کو؟)

### ادھر ادھر سے

☆ کشمیر سمیت اس خطے کو جنگ کی نہیں مکالمے کی ضرورت ہے۔ بے نظیر بھٹو، نواز شریف، اہل بھاری و اچاپی اور آئی کے جبرال جیسی بصیرت کی ضرورت ہے۔ ستے نعروں کے بجائے برکھادات، نٹن بوس، عاصمہ جہانگیر اور خالد حسن جیسی جرأت آزما آوازوں کی ضرورت ہے۔

(وجاہت مسعود..... شہید نظر) ☆ نیب نے کچھ عرصہ قبل سابق وزیراعظم نواز

شریف کے خلاف بھارت میں مٹی لائڈ رنگ کرنے کا الزام بھی لگایا تھا، جب ثابت ہوا کہ ایسا کوئی معاملہ سرے سے موجود ہی نہیں تو معذرت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔

(اعزاز سید..... سیاسی افق) ☆ منیر نیازی صرف ایک اعلا درجے کے منفرد شاعر ہی نہیں، بہت تخلیقی جملے باز بھی تھے۔ ایک دن کہنے لگے ”میں جس دفتر میں جاتا ہوں، بتایا جاتا ہے صاحب میٹنگ میں ہیں، سمجھ میں نہیں آتا یہ دو لے شاہ کے چوہے کیا میٹنگ کرتے ہوں گے۔“ (عطاء الحق قاسمی..... روزن دیوار سے)





ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اٹھے  
پھر تیرے حضور آ گئے ہیں  
یا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی  
کھڑ کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور  
جب خوش بھی ہوئے تو روئے ہیں

لودل کی خیر بھی، چارہ سازوا  
دامن کے تو چاک سی لیے ہیں

داعلمک کہہ ڈاڑھ سے

میری فائری میں تحریر ذوالفقار یوسف کی یہ  
غزل میری فیوض غزلوں میں سے ایک ہے۔ آپ  
بھی پڑھیے۔

مسلر رنجوں کی یہ قیامت بھاریں جانے  
محبت گر بھی ہے تو محبت بھاریں جانے

نئی سوجوں سے گریبا داس کی ہل گئی تو کیا  
یہ بوسیدہ رواجوں کی عمارت بھاریں جانے

کسی کی لاش پر چڑھ کر تم اپنا قدر چاہتے ہو  
تمہاری چند لمحوں کی یہ شہرت بھاریں جانے

کہاں کہے، کہاں تک کس لیے کی گونج ہے یوسف  
مگر ایسے سوالوں کی ازیت بھاریں جانے

تویر قطب کہہ ڈاڑھ سے

تخلیق کا سارا عمل اپنی آگ میں جلے کا عمل ہے۔  
جب وہ کرے گزرتا ہے تو اس کے احساس میں  
پھول کھلتے ہیں۔ خوشی میں بھی ہم کا ہلوڈ ہونڈ لیتا  
ہے۔ وہ عشق کی اس منزل پر ہوتا ہے جہاں کھوتا  
اور پانا کیسا اہستہ رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی یہ  
غزل اسی کیفیت کا اظہار ہے۔

احساس میں پھول کھل رہے ہیں  
پت جھڑ کے عجیب سسلے ہیں

مقراٹنے زہری لیسا تھا  
ہم نے بیٹے کے دکھ سے ہیں

## آپ کا اورچی خانہ

تیسرا پیشہ

مجھے پسند نہیں ہے۔ تین چار دن بعد شاپنگ کے بعد  
باہر کھانا کھایا تھا۔ پر مجھے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ہاں  
باہر سے لا کر بندہ گھر پر آرام و سکون سے کھالے، یہ  
ٹھیک ہے اور میرا جب بھی باہر سے کھانے کا موڈ ہوتا  
ہے، ممالا دیتی ہیں۔

س: صبح ناشتے میں کیا باتی ہیں؟  
ج: کوئی ایک چیز مقرر تو ہے نہیں جس کا جو دل  
کرتا ہے وہ کھالیتا ہے اور ایک جیسی چیز کھا کر بندہ  
پھر اکتا بھی جاتا ہے۔ تو بس کبھی چائے، کیک، کھیر،  
پراٹھا، سالن، اینڈ پراٹھا، مولی یا آلو کے پراٹھے، کبھی  
حلہ پوری تو کبھی کبھی صبح بریانی۔

س: بچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟  
ج: یہ تو میرے موڈ پر منحصر ہے کیونکہ میں بہت  
موڈی قسم کی ہندی ہوں۔ موڈ نہیں ہے تو جلدی جلدی  
سمیٹ کر بس کام ختم کرتا ہے۔ اگر کبھی موڈ بن جائے  
تو ہمیں اپنے بچن پر بڑا پیارا آتا ہے اسے دھو ڈالتے  
ہیں۔ فریق، چولہا، مسالے کے ڈبے، شیلوں کی  
شیٹ پر دسے سب چکا چک کر دیتی ہوں۔

س: بچن کی کوئی ٹپ؟  
ج: جناب ابھی ہم جوینر ہیں، خود سینئر کی ٹپس  
پر چلتے ہیں اس لیے کوئی ٹپ نہیں بتا سکتے فی الحال۔  
اؤکے جی سب کو اللہ حافظ۔

خواتین میرا فیورٹ ڈائجسٹ ہے اور میں آج  
جو کچھ بھی ہوں اسی کی وجہ سے ہوں۔ اس کے سلسلوں  
میں شامل ہونے کا مجھے بے حد شوق ہے جب بھی میرا  
نام (خواتین، شعاع، کرن) میں شامل ہوتا ہے تو  
مجھے بہت خوش ہوتی ہے۔ ارے میں بھی یہ کیا باتیں  
لے کر بیٹھ گئی، چلیے سوالات کی طرف۔

س: کھانا بناتے ہوئے آپ کن باتوں کا  
خیال رکھتی ہیں؟

ج: کچن میں تو کھانا بناتے ہوئے ہمارے یہاں  
صرف اور صرف پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جاتا  
ہے۔ موسم وغیرہ کا خیال ہم نے کبھی رکھا نہیں ہے جو  
چیز کھانے کا دل ہو وہ پکا لیتے ہیں۔ ہاں البتہ خوراک  
سادہ ہو مطلب زیادہ اشیاء کا استعمال نہ ہو اس بات کا  
خیال رکھتی ہوں اور جتنا کھانا ہوتا ہی پکا ہی ہوں۔  
ورنہ ضائع ہو جائے تو گناہ ملتا ہے۔

س: کھانے کا وقت ہے اور مہمان اچانک  
آجائیں تو کوئی ایسی ڈش جو فوراً بن جائے؟

ج: اگر عین کھانے کے وقت..... مطلب کہ  
اگر ہم بھی کھا رہے ہوں اور اسی وقت آجائے تو جو ہم  
کھا رہے ہیں انہیں بھی پیش کر دیں گے۔ اگر کھانے  
کے آگے پیچھے آجائیں تو سب سے پہلے "ملک ٹھیک  
یا چائے" سرو کروں گی اور ری ڈش کی بات تو  
"بریانی" جلدی تیار ہو جاتی ہے ورنہ بیکریز اینڈ  
آؤر شاپز زندہ باد۔

س: مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی  
ہیں؟

ج: مجھے تو باہر کھانا کھانا ذرا بھی پسند نہیں ہے۔  
مما اور چھوٹی بہن اکثر کہتی ہیں کہ چلو کسی ٹیٹ  
پوائنٹ چلتے ہیں پر میں فوراً انکار کر دیتی ہوں کہ یہ

ارتج خان کہہ ڈاڑھ سے

میری فائری میں تحریر کردہ یقیناً تم مگر خوبصورت  
غزل سب فارمیں کے لیے۔

جو ہم یہ گزرتے تھے دن سارے وہ خود گزرتے تو لوگ سمجھے  
جب اپنی اپنی محبتوں کے عذاب چھٹے تو لوگ سمجھے

وہ ہیں درختوں کی چھاؤں میں مسافروں کو اٹھانا تھا  
اتنی مدتوں پہاگے موسم ہو چل نہ اتنے تو لوگ سمجھے

اس ایک کئی سی عروانی کے فلسفے کو کوئی نہ سمجھا  
جب اس کے کمرے سے لاشی نکلی غلط نکلے تو لوگ سمجھے

وہ خواب تھے ہی جنہیلوں سے سوئے حاکم کی کرلی بیعت  
پھر اک چنبیلی کی اوٹ میں سے جو سانپ نکلے تو لوگ سمجھے

وہ گاؤں کا اک عزیز دہتل مرگ کے بنے پر کون خفا تھا  
جب اس کے بچے شہر مار گئے نہ لوئے تو لوگ سمجھے

وہ کادوں کا اک عزیز دہتل مرگ کے بنے پر کون خفا تھا  
جب اس کے بچے شہر مار گئے نہ لوئے تو لوگ سمجھے

وہ کادوں کا اک عزیز دہتل مرگ کے بنے پر کون خفا تھا  
جب اس کے بچے شہر مار گئے نہ لوئے تو لوگ سمجھے

وہ کادوں کا اک عزیز دہتل مرگ کے بنے پر کون خفا تھا  
جب اس کے بچے شہر مار گئے نہ لوئے تو لوگ سمجھے





# مہنگے پکوان

خاکہ جیلانی

## سبزیوں کے کٹلس

اجزاء:-	چار سلاکس
ڈبل روٹی	آدھا کپ
بند گوبھی	آدھا کپ
گاجر	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
آلو	دو کپ
ابلے سفید چنے	دو عدد
ہری پیاز	چار چمچے
لیموں کا رس	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
تیل	آدھی کٹھی
ہرا دھنیا	آدھی کٹھی
پودینہ	چار عدد
ہری مرچ	ایک عدد
اٹھا	

ترکیب:-

ہری مرچ، ہرا دھنیا، ہری پیاز، گوبھی اور شملہ مرچ باریک کاٹ کر اس میں لیموں کا رس ملا دیں۔ ڈبل روٹی، ابلے چنے، نمک، زیرہ، ثابت دھنیا، گرم مسالا اور دو کھانے کے چمچے تل پیس کر اس میں ملا دیں۔ اٹھا بھی توڑ کر ملا دیں۔ آدھا گھنٹہ یہ آمیزہ رکھا رہنے دیں پھر اس کے کٹلس بنالیں۔ گرم تیل میں سنہری ہونے تک تلیں۔ کچپ اور ہری پٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

## قدھاری چکن بریانی

ضروری اشیاء:-

مرغی کا گوشت (بڑے ٹکڑے) چھ سے آٹھ عدد

ایک کلو	چاول
ایک کپ	پیاز (براؤن کر لیں)
دو کھانے کے چمچے	لہسن اور ک
ایک کھانے کا چمچ	ثابت گرم مسالا
حسب ذائقہ	نمک
دو کھانے کے چمچے	پسی ہری مرچ
آدھا چائے کا چمچ	ہلدی
ایک چائے کا چمچ	زیرہ
ایک کپ	دہی
دو کھانے کے چمچے	لیموں کا رس
دو عدد	ٹماٹر (گول سلاکس کاٹ لیں)
ایک چائے کا چمچ	انار کا رس
چھ سے آٹھ عدد	ہری مرچ
ایک کپ	پٹنی
دو چمکی	لال فوڈر
ایک کپ	تیل

ترکیب:-

دہی میں لہسن اور ک، نمک، لال فوڈر، ہلدی، انار کا رس اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور گوشت پر لگا کر میرینٹ ہونے کے لیے ایک گھنٹہ فریج میں رکھ دیں۔ چاول دھو کر ثابت گرم مسالا کے ساتھ دو کئی امال لیں، لپال کر ایک ٹرے میں پھیلا دیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ دپٹی میں تیل گرم کریں اور زیرہ ڈال کر فرانی کریں۔ اس میں میرینٹ گوشت اور براؤن پیاز ڈال کر ڈھکن بند کر دیں، گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو بھون لیں۔ ایک بڑی دپٹی میں چاول کی تہہ بچھا دیں، اوپر سے گوشت اور ٹماٹر سلاکس ڈال دیں اور چاول ڈال کر زردے کا رنگ چھڑک دیں۔ اب

پٹنی ڈال کر دس سے بارہ منٹ دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر سلاوا اور دہی کے ساتھ پیش کریں۔

## ویجیٹبل بریانی / رائیہ کے ساتھ

ضروری اشیاء:-

چاول	تین ماؤ
مٹر	آدھا کلو
آلو	تین عدد
گاجر	ایک عدد
پودینہ	آدھا کپ
ہری مرچ	تین سے چار عدد
ٹماٹر	دو عدد
پیاز (درمیانی)	دو عدد
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچ
دھنیا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
مکس ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچ
زیرہ سفید	ایک چائے کا چمچ
لہسن اور ک	دو چائے کے چمچے

مکس ویجیٹبل رائتہ:-

دہی	آدھا کلو
کھیرا (چوکور)	ایک عدد
گاجر (چوکور بواک)	ایک عدد
مولی (چوکور)	ایک کپ
ٹماٹر (چوکور)	ایک بڑا
چندر (چوکور بواک)	ایک عدد
پودینہ، ہرا دھنیا، ہری آدھا کپ (چوپ)	
مرچ	
لیموں	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:-

چاول کو بھگو دیں۔ آلو چوکور کاٹ لیں، مٹر چھیل لیں۔ اب ایک دپٹی میں تیل گرم کریں اس

میں پیاز فرانی کریں۔ لکا سنہرا ہو جائے تو ثابت گرم مسالا مٹر، زیرہ، آلو، لہسن، اور ک، مرچ، نمک، ہلدی، دھنیا فرانی کریں۔ اب چاول ٹماٹر چوکور، ہری مرچ اور پٹنی ڈالیں (اگر پٹنی نہ ہو تو پانی ڈال دیں) پٹنی خشک ہو جائے تو پودینہ شامل کر دیں اور دم پر رکھیں۔ رائیہ کے ساتھ پیش کریں۔

رائتہ بنانے کے لیے:-

دہی میں نمک، کالی مرچ، لیموں، پودینہ، ہری مرچ، ہرا دھنیا شامل کر دیں۔ گاجر، آلو، چندر کو چوکور کاٹ کر الگ الگ بواک کر لیں اور چھلنی پر رکھیں کہ پانی نکل جائے۔ اب دہی کے کچر میں آلو، گاجر، چندر، ٹماٹر، مولی، کھیرا شامل کر دیں اور ویجیٹبل بریانی کے ساتھ پیش کریں۔



خواتین ڈائجسٹ

کھانے کے لیے ایک نیا ذائقہ

نیا ذائقہ

اتل مرچ پھل

قیمت = 450 روپے

نمائندہ کاپی:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021



# محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

## م..... فیصل آباد

س: میٹرک کے ایک سال بعد میری مفتی میرے ماموں زاد سے ہوئی اور مکمل ان کی رضامندی سے ہوئی میری امی اس رشتے سے بہت خوش تھیں۔ کیونکہ انہیں اپنے بھائی کے بچوں سے بہت پیار ہے۔ میرے ماموں حیات نہیں۔ لیکن میری ممانی بہت اچھی اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ بہت خوش اور چاہ سے انہوں نے میرا رشتہ مانگا جسے خوشی قبول کیا گیا۔ اس رشتے سے دونوں فیملیز بہت خوش تھیں۔ خصوصاً میری ماموں زاد لڑکی کیونکہ ان کا ہمارے ساتھ مثالی پیار تھا۔ مفتی کے ایک سال بعد ممانی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سات سال سب ٹھیک رہا میرے کزن سے کبھی کبھار میری بات چھی ہو جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش، اچھے طریقے سے بات کرتے تھے۔ ان کے پیار میں بہت شدت تو نہیں لیکن اگر زیادہ عرصہ میری بات نہ ہوتی تو کہتے تھے۔ تمہارا مجھ سے دل بھر گیا ہے جو میرے ساتھ بات نہیں کرتیں یعنی سب ٹھیک تھا۔

اس سال بڑی عید پر ہماری شادی کی تاریخ رکھی جانی تھی۔ ہم نے ان کا بہت انتظار کیا۔ چند دنوں بعد میری چھوٹی ممانی نے روتے ہوئے میری امی کو فون کیا کہ اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔

میری کزن نے اسے کال کی تو اس نے میرے کردار کو برا کہا کہ میرا میرے خالہ زاد سے افیئر ہے جس کے لیے میری خالہ نے ہماری مفتی سے پہلے رشتہ مانگا تھا لیکن میرے والدین راضی نہیں ہوئے اور وہ بات وہیں ختم ہو گئی۔ ایک شادی کی تقریب میں انہوں نے مجھے بھیج کیا کہ میں نے اس طرح کی بات سنی ہے کہ وہ تمہارا رشتہ مانگتے تھے۔ میں نے کہا کہ صرف رشتہ مانگا تھا لیکن انکار ہو گیا۔ اب انہوں اس رشتہ کو جواز بنا کر انکار کر لیا ہے۔

میری وجہ سے میرے والدین بہت پریشان ہوئے۔ میں نے والد کو زندگی میں بھی اتنا بے بس نہیں دیکھا جتنا اس وقت دیکھا۔ اس کے گھر والے بھی بہت مجبور ہو گئے۔ اسے منایا لیکن اس نے نکاح نامہ دکھایا اور وہ رو دھو کر خاموش ہو گئے۔

اب میرے والدین نے میرے لیے رشتہ دیکھا اور پسند بھی کر لیا ہے۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں جس شخص کو میں نے سات سال سوچا اس کے خواب دیکھے، اس کے علاوہ میں کیسے کسی دوسرے شخص کو قبول کروں گی۔ مجھے یقین نہیں ہوتا سب اپنی مرضی کی اور بعد میں مجھے دھوکا دیا۔ واضح رہے کہ وہ بیرون شہر جاب کرتے ہیں۔ وہیں کی لڑکی سے نکاح کیا ہے۔

ج: اچھی بہن آپ کی اذیت اور دکھ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور آپ کے والدین کی پریشانی کا بھی۔ لیکن درحقیقت اگر آپ غور کریں تو آپ خوش نصیب ہیں۔ وہ شخص جس نے سات سال کے اس رشتہ کا جو اس کی مرضی سے قائم کیا گیا تھا۔ پاس نہیں کیا۔ جس نے اپنی پھوپھی کا لحاظ نہیں کیا۔ جس نے اس لڑکی کا خیال نہیں کیا جس سے اس نے سات سال تک لگاؤ اور انسیت کا اظہار کیا۔ اس جیسے بے مروت، بد لحاظ اور خست دل آدمی سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر اگر اس کو کوئی لڑکی پسند آگئی تھی اور اس سے نکاح کر لیا تھا تو کم از کم اس میں اتنی

اخلاقی جرات تو ہوتی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا۔ اس نے سیدھا آپ کے کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اس جیسے آدمی سے رشتہ نہ ہونا آپ کی خوش بختی ہی کہی جاسکتی ہے۔

دوسری خوش بختی یہ ہے کہ آپ کو فوراً ہی دوسرا رشتہ مل گیا ہے۔ بے شک ابھی آپ کا دل راضی نہیں ہے۔ لیکن وقت آپ کے زخم مندمل کر دے گا۔ آپ اس شخص کے کردار پر غور کریں گی تو آپ کا دل اس سے خود بخود ہٹ جائے گا۔ آپ صرف یہ سوچیں کہ وہ آپ کے قابل ہی نہیں تھا۔ قدرت نے خود ہی آپ کے راستے علیحدہ کر دیے۔ سات سال جس شخص سے جذباتی وابستگی رہی ہو۔ جس کے ساتھ شادی کے خواب دیکھے ہوں۔ اس سے اس طرح علیحدگی تکلیف دہ ضرور ہے لیکن آپ اللہ پر بھروسہ کر کے شادی کر لیں۔ آپ کے حق میں یہی بہتر ہے۔

## مہر..... فیصل آباد

ایک بہن کا خط ملا ہے۔ ان بہن نے عرشی والے خط کا ذکر کیا ہے۔ ان بہن سے کہنا یہ ہے کہ ان صاحب نے اپنی بوی کو طلاق دے دی ہے اور ان کی شادی ہو چکی ہے۔

یہ بہن گریجویٹ کر چکی ہیں اور ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہیں۔ دو بھائی ہیں جو کراچی میں جاب کرتے ہیں۔ اگر کوئی خاتون اپنے بیٹے یا بھائی کا ان سے رشتہ کرنا چاہے تو ہم سے رابطہ کر سکتی ہیں۔

## حریم..... گجرات

س: ماموں کی بیٹی "س" سے بھائی کی مفتی ہوئی۔ مفتی میں دونوں گھرانوں کے ساتھ ساتھ بھائی اور "س" کی مرضی بھی شامل تھی۔ دونوں کا فون پر رابطہ تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ اچانک "س" نے شادی سے انکار کر دیا۔ پتا چلا کہ کالج کی کسی تقریب میں کوئی فحش آئے تھے۔ انہیں وہاں سے پسند آگئی۔ انہوں نے شادی کی بات کی۔ پیسے کی چکا چوند نے سارے گھر والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ ماموں راضی نہ تھے لیکن سب گھر والوں اور خصوصاً "س" کی مرضی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ ہمارے ہاں سے رشتہ توڑ کر انہوں نے وہاں شادی کر دی۔

بھائی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ ان کا ندوس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ کافی عرصہ ہسپتال میں رہے۔ اس دوران امی نے کئی جگہ ان کی شادی کی بات چلانا چاہی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ "س" کی شادی کا وہی انجام ہوا جو اکثر ایسی شادیوں کا ہوتا ہے۔ فحش صاحب کا دل بھر گیا۔ تو وہ اسے اپنے گاؤں میں رکھ کر بھول گئے۔ اب اس نے بھائی سے رابطہ کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر بھائی اسے قبول کر لیں تو وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔ بھائی اب بھی اسے چاہتے ہیں۔ دونوں کی بات چیت ہوتی ہے لیکن امی رضامند نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لڑکی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ج: آپ کی امی کی بات بہت حد تک درست ہے۔ وہ لڑکی جو دولت دیکھ کر سارے عہد و بیان بھول جائے۔ اس پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے زندگی میں جو غلطی کی، اس سے سبق حاصل کیا ہو اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرے۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیا وہ فحش صاحب "س" کو طلاق دینے پر آمادہ ہیں؟ اگر وہ آمادہ نہیں تو "س" کو خلع لینا پڑے گی۔ ایک بااثر زمین دار سے مگر لینا آسان بات نہیں خصوصاً موجودہ عدالتی نظام میں جہاں ایک مقدمہ کو سالوں لگ جاتے ہیں۔

بہتر یہی ہے کہ آپ کے بھائی اس مسئلہ سے علیحدہ رہیں اور اس کی طلاق یا خلع سے پہلے اس کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ اگر "س" طلاق یا خلع لیتی ہے تو اس وقت جو حالات ہوں، اس کے مطابق فیصلہ کریں۔





Fairer Your  
Skin  
Get it now →



## بیوتی ہیکس

فاطمہ علی..... لاہور

س: میری عمر پینتیس سال ہے لیکن ابھی سے میرے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی ہیں۔ بہت سی کریمیں استعمال کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ میری جلد خشک ہے؟

ج: چہرے پر جھریاں پڑنے کی سب سے بڑی وجہ خشک جلد اور غذا میں عدم توازن ہے۔ متوازن غذا جس میں تمام وٹامن اور کیمیکل پروٹین شامل ہوں، چہرے کی جلد کو تروتازہ رکھتی ہے۔

دوسری بڑی وجہ جس کا عموماً خواتین خیال نہیں رکھتیں، وہ ہے پانی کا استعمال۔ زیادہ سے زیادہ پانی پئیں۔ آپ کی جلد چمک دار اور خوب صورت رہے گی۔ چہرے پر مومچرا اثر کا استعمال باقاعدگی سے کریں۔ عرق گلاب میں چند قطرے گلیسرین یا شہد بہترین مومچرا اثر ہے۔

ایک چمچ لیموں کے عرق میں ایک چمچ شہد ملا کر چہرے پر لگانے سے جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔

ذیل میں چند ورزشیں دی جا رہی ہیں۔ ورزش کرنے سے پہلے دودھ، کریم یا مومچرا اثر ضرور لگائیں۔

1- اپنا جڑا دائیں، بائیں گھمائیے۔ جہاں تک ممکن ہو، اسے حرکت دے کر دور لے جائیں۔ یہ ورزش

لگی ہوئی ٹھوڑی کے لیے بہترین ہے۔

2- اپنے ہونٹوں کو اندر کھینچ کر منہ کو خوب کھولے۔ ہونٹوں کو دانتوں کی طرف کھینچے۔ اس انداز میں ربتے ہوئے اپنا منہ کھولتے اور بند کرتی رہیں۔ گویا آپ بغیر دانتوں کے چارہی ہوں۔ اس سے بالائی ہونٹ کی

کلیئر سسٹنی جائے گی۔

3- آنکھیں خوب زور سے بند کر کے منہ سکڑیے۔

ایک لمحے کے بعد ہونٹوں کو حرکت دیں پھر آنکھیں پتتا

ممكن ہو، پوری طرح کھول دیجیے۔ اس ورزش سے آنکھوں اور اطراف کے عضلات مستحکم ہوتے ہیں اور آنکھوں کے کونوں میں جھریاں جنہیں ”کوے کے پنچے“ کہتے ہیں، آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔

4- انگلیاں آنکھوں کے بیرونی کونوں پر رکھ کر عضلات کو کپکپی کی طرف انگلیوں سے پھینچیں۔ اس سے بھی آنکھوں کے کونوں کی جھریاں ختم ہوتی ہیں۔

5- دونوں ہاتھ چہرے پر رکھیے۔ ہاتھوں کو حرکت دے کر بغیر انگلیوں سے آنکھوں کے پنچے کے عضلات کو پھینچیں اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیں۔

6- اپنے انگوٹھوں کو آنکھوں کے نیچے یعنی گال کی ہڈیوں پر ہلکے دباؤ کے ساتھ گھمائیے۔ اس سے آنکھ کے اطراف دوران خون میں اضافہ ہوگا۔

7- ایک یا تمام انگلیاں چہرے پر دباؤ کے ساتھ پھیرے، اس سے کشیدگی یا درد دور ہو جائے گا۔ جب بھی چہرے میں کشیدگی یا دھن محسوس ہو، یہ عمل دہرائیے۔

8- ہونٹ کھینچ کر پتتا ممکن ہو چمکی کا سامنے ہٹا کر باہر نکالیں۔ اس کے ساتھ آنکھیں زور سے بند کریں اور اپنے گال اندر کی طرف کھینچ لیں۔ اس ورزش سے پورے منہ کے عضلات تن جائیں گے۔

ان ورزشوں سے چہرے کی جھریاں دور ہو جائیں گی۔ وہ خواتین جن کے چہرے پر زیادہ عمر کی وجہ سے جھریاں پڑ گئی ہیں، ان ورزشوں پر عمل کر کے کم عمر نظر آ سکتی ہیں۔

